زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثالث

جلد ۔ ۱۲　　شمارہ ۔ ۳۱۔۳۴

جولائی ۲۰۲۴ء تا جون ۲۰۲۵ء

مدیر اعزازی
اقبال حسن آزاد

مدیر
ثالث آفاق صالح

نائب مدیرہ : نشاط پروین

تزئین کار: اعجاز رحمانی

سرورق: محمد نعیم یاد (پاکستان)

رابطہ: : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱
Mob.+91 9430667003
email.eqbalhasan35@yahoo.com
www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست

	اداریہ	اقبال حسن آزاد	۵
	حمد	طارق متین	۸
	نعت	ماہرالقادری	۹
غزلیں	خورشد اکبر، ارشد عبدالحمید		۱۰_۲۱
نظم	محبت سیکھ لیں	ڈاکٹر ریشا قمر	۲۲
گوشہ طارق متین			
انٹرویو	تسلیم عارف سے طارق متین کی خصوصی گفتگو	ڈاکٹر تسلیم عارف	۲۴
یادیں	بجھتے بجھتے بجھ گیا طارق چراغ آرزو	پروفیسر صفدر امام قادری	۴۱
مضامین	ہمارے شعر بھی کچھ مختلف تو ہوتے ہیں	پروفیسر صفدر امام قادری	۵۸
	طارق متین کی شعری کائنات	پروفیسر لطف الرحمٰن	۶۹
	طارق متین میری نظر میں	پروفیسر علیم اللہ حالی	۷۴
	مشکِ سخن ایک مطالعہ	ڈاکٹر منظر اعجاز	۷۷
	طارق متین کی شاعری: قندیل ہنر کی روشنی میں	اقبال حسن آزاد	۸۰
	طارق متین کے شعری رویے اور تعین قدر	ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی	۸۵
	طارق متین کی غزلیہ شاعری ایک جائزہ	ڈاکٹر تسلیم عارف	۹۵
	طارق متین کی حریت فکر	ڈاکٹر محمد ذاکر حسین	۱۰۴
رباعیاں	اعتراف	ظفر کمالی	۱۰۹
	طارق متین کی منتخب غزلیں	ادارہ	۱۱۳
مضامین	خیال کے جلال و جمال کی پیغمبری......اقبال حسن آزاد کی غزلوں کی روشنی میں	رشیدہ منصوری	۱۲۳
	معاصر اردو ادب کا تخلیقی منظرنامہ اور عین تابش	ڈاکٹر زین رامش	۱۲۹

ثـــــالــــث

	شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید: ایک مفصل جائزہ	ڈاکٹر گلاب سنگھ	۱۴۲
شہر نامہ	مونگیر کا تاریخی وثقافتی منظر نامہ	مولانا عبداللہ بخاری	۱۵۰
افسانہ	مردم گزیدہ	اقبال حسن آزاد	۱۶۰
تجزیہ	اقبال حسن آزاد کا افسانہ ''مردم گزیدہ''	عشرت ظہیر	۱۶۵
افسانہ	باباجان	عشرت ظہیر	۱۶۹
تجزیہ	عشرت ظہیر کا افسانہ ''باباجان'': ایک تجزیاتی جائزہ	رشیدہ منصوری	۱۷۵
افسانہ	اندر آگ ہے	قاسم خورشید	۱۷۷
تجزیہ	قاسم خورشید کا افسانہ ''اندر آگ ہے'': ایک تجزیہ	محمد مرجان علی	۱۸۰
افسانے	جنم دن مبارک	تنویر احمد تماپوری	۱۸۴
	خدا ابابیل نہیں بھیجتا	ہما فلک	۱۹۰
تبصرے	زوال	مبصر: اقبال حسن آزاد	۱۹۶
	غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے	//	۱۹۷
	کیسا انتظار	//	۲۰۰
	صفدر امام قادری کے شخصی نقوش	مبصر: فرحت صغیر	۲۰۳
	صفدر امام قادی فکری وفنی زاویے	مبصر: ناہید پروین	۲۱۳
	چہرہ سوال ہے	مبصر: اقبال حسن آزاد	۲۲۳
	ضیائے حنا	//	۲۲۵
	ارمغان رافق	//	۲۲۸
	استفسار (بیاد وزیر آغا)	//	۲۳۶
	جان عالم	//	۲۳۹
	حرف نقد	//	۲۳۹
	سنو فال	//	۲۴۲
	شجرۃ الیقین فی جنت النعیم	//	۲۴۳
	دیوان، پٹنہ	//	۲۴۴
	قند زقند، قند مکرر، بال کی کھال	//	۲۴۶

ثــــــــالـــــــث

	نثری اصناف ادب اور طنز ومزاح کی روایت	مبصر: ڈاکٹر مشتاق احمد	۲۴۸
	قطرہ قطرہ احساس	مبصر: ڈاکٹر منصور خوشتر	۲۵۰
	رانگ نمبر	مبصر: ڈاکٹر مشتاق احمد	۲۵۳
	غزال درد	مبصر: رونق شہری	۲۵۵
	صورتیں	مبصرہ: نسترن احسن فتیحی	۲۵۷
	یادیں	مبصر: بینام گیلانی	۲۶۱
گلستان	عبدالصمد، مرغوب اثر فاطمی		۲۶۵
ادب پر تبصرے			۲۶۶
ثالث پر تبصرے	غضنفر، علی رفاد فتیحی، سلیم انصاری، ڈاکٹر احسان عالم، نسترن احسن فتیحی،		۲۶۸
	ڈاکٹر اختر آزاد، ولی اللہ قادری، ڈاکٹر سیفی سرونجی، ڈاکٹر غلام نبی کمار، ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی، ڈاکٹر منصور خوشتر		۲۹۸
مکتوبات	ڈاکٹر ریشا قمر، طارق شبنم، عین تابش، صابر رضا رہبر، نہاں رباب،		۲۹۹
	ریحان کوثر، جاوید اختر ذکی، رفیع حیدر انجم، ڈاکٹر احسان تابش، اطہر مسعود خان، رونق شہری، بلال مختار		۳۰۴

◀◀ ● ▶▶

ثالث ملنے کے پتے:

بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار) +91 9304888739

اقبال حسن آزاد، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر ۸۱۱۲۰۱

اداریہ

اردو زبان برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی شناخت کا اہم حصہ ہے۔اس کی بنیاد ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب پر رکھی گئی، جہاں ہندی اور فارسی کے امتزاج نے ایک نئی زبانی روایت کو جنم دیا۔اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ ایک مکمل تہذیب، ایک طرزِ احساس اور ایک طرزِ بیان ہے، جس نے صدیوں سے مختلف مذاہب، علاقوں اور ثقافتوں کو ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔

تاہم آج کے ہندوستان میں اردو کی صورتحال ملے جلے رجحانات پیش کرتی ہے۔ایک طرف اردو کے ادبی مراکز، مشاعرے، سیمینار اور جامعات میں تحقیقی کام جاری ہے،تو دوسری طرف اسے سرکاری سطح پر وہ مقام حاصل نہیں جو آئینِ ہند میں اسے دیا گیا ہے۔اردو آئینِ ہند کی آٹھویں فہرست میں شامل ہے اور کئی ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے،لیکن عملی سطح پر اردو تعلیم کی حالت تشویش ناک ہے۔اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی ہے، اردو میڈیم اسکول بند ہو رہے ہیں، اور طلبہ روزگار کے محدود مواقع کے باعث اردو سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

بیشتر ریاستوں میں اردو کا نصاب جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔مثال کے طور پر بہار کے اسکولوں میں اردو کا ایسا نصاب شامل ہے جس کی زبان حد سے زیادہ مفرس ومعرب ہے،اوراس میں ایسے افسانے، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو نوخیز ذہنوں کے لیے دلچسپی کے بجائے بوجھ بن جاتی ہیں۔بی اے (اردو آنرز) اور ایم اے (اردو) کے نصابات کی حالت تو اور بھی ناگفتہ بہ ہے۔ایسا لگتا ہے کہ نصاب تیار کرنے والے اساتذہ طالب علموں کی نفسیات سے ناواقف ہیں اور صرف اپنی علمی قابلیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج کی نسل اردو سے بیزار دکھائی دیتی ہے۔

لیکن جیسا کہ بشیر بدر نے کہا ہے:

خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

لہٰذا ڈیجیٹل دور میں اردو نے ایک نیا جنم لیا ہے۔سوشل میڈیا، یوٹیوب، پوڈکاسٹ اور ویب سائٹس کے ذریعے اردو زبان نئے قارئین اور سامعین تک پہنچ رہی ہے۔نوجوان طبقہ اردو شاعری، نعت، غزل اور نثر کو ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر فروغ دے رہا ہے۔ یونیکوڈ (Unicode) کے آنے سے اردو

ٹائپنگ آسان ہوگئی ہے، جس سے آن لائن ادب اور بلاگنگ کی دنیا میں اردو کی موجودگی مضبوط ہوئی ہے۔
اردو ادب آج بھی تخلیقی لحاظ سے زندہ ہے۔ ہندوستان میں ہر سال کئی اردو کتابیں شائع ہوتی ہیں اور ادبی رسائل و جرائد اپنی روایت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ نوجوان لکھنے والوں کی ایک نئی نسل سامنے آ رہی ہے جو جدید موضوعات پر اردو میں اظہار کر رہی ہے۔ تاہم اردو اشاعت کا دائرہ محدود اور قارئین کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔
بعض اوقات اردو کو مذہب کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں یہ زبان ایک خاص طبقے تک محدود سمجھی جانے لگی ہے، حالانکہ اردو ہمیشہ سب کی زبان رہی ہے۔ اسے کسی ایک مذہب یا طبقے سے منسوب کرنا تاریخی ناانصافی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کو ایک قومی ورثے کے طور پر دیکھا جائے، نہ کہ فرقہ وارانہ عینک سے۔
ہندوستان میں اردو آج بھی زندہ ہے، اور اس کے زندہ رہنے میں مدارس کا کردار نمایاں ہے، مگر مدارس سے باہر بھی اسے سہارا اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر حکومت تعلیمی و ثقافتی سطح پر عملی اقدامات کرے، اور عوام اردو کو اپنی مشترکہ شناخت کے طور پر اپنائیں، تو یہ زبان ایک بار پھر اپنے سنہرے دور کو حاصل کر سکتی ہے۔
اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی روح ہے — جو محبت، تہذیب اور انسانی رشتوں کی خوشبو بکھیرتی ہے۔

☆☆☆

''ثالث'' کا گزشتہ شمارہ غضنفر نمبر تھا، جو جون ۲۰۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے فوراً بعد اگلے شمارے کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں، لیکن کچھ ''دوستوں'' کے ناروا سلوک نے دل ایسا کھٹا کیا کہ میں نے رسالہ بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بقول حفیظ جالندھری:

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف   اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

الحمدللہ! ثالث کو کوئی مالی دشواری درپیش نہیں۔ میری ٹیم بھی تندہی سے کام کرتی ہے، لیکن جب ''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے'' تو دل اچاٹ ہو گیا۔ کئی مہینے اسی حال میں گزر گئے۔ مجھے توقتی سکون آ گیا، مگر میرے اندر کا صحافی بے قرار رہا۔ آخر کار میں نے پھر سے یاروں کے تیر کھانے کے لیے میدان میں قدم رکھ دیا ہے۔

☆☆☆

طارق متین ہمارے عہد کے ایک بہترین شاعر تھے۔ اردو فورم مونگیر کے رکن، میرے دوست، اور خاصے بے تکلف انسان تھے۔ اکثر بغیر اطلاع آ جاتے اور فرمائش کر کے خاطر تواضع کرواتے۔ مجھے بھی ان سے باتیں کرنے میں لطف آتا۔ ذہین آدمی تھے، مگر افسوس کہ ان کی لاابالی طبیعت نے انہیں بہت جلد شعر و

ادب کی دنیا سے دور کردیا۔ وہ گوشہ نشین ہوگئے، اور پھر اسی حالت میں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کردی۔

وہ میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ ان کی ناگہانی موت کی خبر سنتے ہی میں ان کے گھر پہنچا، آخری دیدار کیا اور دعائے مغفرت کی۔ اسی وقت ان کی میّت ان کے آبائی وطن لکھمنیا لے جائی گئی، جہاں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں انہیں سپردِ خاک کیا گیا۔

ان کے انتقال کے بعد میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی شاعری کے اعتراف میں ثالث میں ان پر ایک بھرپور گوشہ شائع کیا جائے۔ ثالث کو دوبارہ جاری کرنے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ اس گوشہ کی ترتیب میں پروفیسر صفدر امام قادری نے میری خاصی مدد کی ہے، جس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں اپنے اداریوں میں مشمولات کے بارے میں کچھ نہیں لکھتا۔ چاہتا ہوں کہ قارئین خود پیش کردہ تخلیقات کا مطالعہ کریں اور اپنی بصیرت سے ان کا مقام متعین کریں۔

امید ہے کہ یہ شمارہ آپ کو پسند آئے گا۔ آپ کی گراں قدر آرا کا منتظر رہوں گا۔

"ثالث" کی ویب سائٹ کو دمِ تحریر چونسٹھ ہزار نو سو تیئس (۶۴۹۲۳) سے زائد بار وزٹ کیا جا چکا ہے۔ آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر رسالے کے تمام شماروں کو نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

اس شمارے کی قیمت مبلغ ۳۵۰/ہندوستانی روپے ہے جسے درج ذیل کیو آر کو اسکین کر کے بھیجا جا سکتا ہے یا درج ذیل بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیا جا سکتا ہے۔

www.salismagazine.in

UPI Handle - 9430667003@paytm
Eqbal Hasan Azad
Punjab National Bank
A/c No. 0508010126991
IFSC - PUNB0050820

● طارق متین

حمد

خلوتِ دل ہے تری، قریۂ جاں تیرا ہے
جس میں محفوظ ہوں میں، گنجِ اماں تیرا ہے

تیری رحمت سے برستا ہے یہاں ابرِ کرم
مسکراتا ہوا یہ باغِ جہاں تیرا ہے

تیرے انوار کے پرتَو ہیں یہ خورشید و قمر
میری آنکھوں میں جو روشن ہے سماں تیرا ہے

تیری قدرت سے ہی جلتے ہیں مسافت کے چراغ
منزلیں تیری، ہر اک سنگِ نشاں تیرا ہے

نقل وحرکت جو ہماری ہے، وہ سب تیری ہے
یہ مکیں تیرے ہیں، آباد مکاں تیرا ہے

کون ہے چارہ گرِ زخمِ جگر تیرے سوا
میری تکلیف تری، دردِ نہاں تیرا ہے

تیری یادوں کی مہک ہے ترے ناموں کی دھنک
یہ مرا گلشنِ دل رشکِ جناں تیرا ہے

یہ زمیں تیری ، فلک تیرا ، ستارے تیرے
ذرّے ذرّے میں یہاں حسن عیاں تیرا ہے

دشت وصحرا بھی ترے، کوہ و دمن بھی تیرے
کشتیاں تیری ہیں، یہ آبِ رواں تیرا ہے

چشم گریاں بھی تری، خندۂ لب بھی تیرا
فصلِ گل تیری، مرا عہدِ خزاں تیرا ہے

صبحِ بیدار بھی تیری، شبِ خفتہ بھی تری
میرے ہنگامے ترے، خوابِ گراں تیرا ہے

مجھ میں روشن ہے جو قندیلِ سخن تیری ہے
مجھ کو حاصل ہے جو اندازِ بیاں تیرا ہے

● ماہر القادری

نعت

سلام اس پر کہ جس نے بےکسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

سلام اس پر کہ اسرار محبت جس نے سکھلائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے

سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں

سلام اس پر کہ دشمن کو حیات جاوداں دے دی
سلام اس پر، ابوسفیان کو جس نے اماں دے دی

سلام اس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں
سلام اس پر، ہوا مجروح جو بازار طائف میں

سلام اس پر، وطن کے لوگ جس کو تنگ کرتے تھے
سلام اس پر کہ گھر والے بھی جس سے جنگ کرتے تھے

سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا

سلام اس پر جو سچائی کی خاطر دکھ اٹھاتا تھا
سلام اس پر، جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا

سلام اس پر، جو امت کے لیے راتوں کو روتا تھا
سلام اس پر، جو فرش خاک پر جاڑے میں سوتا تھا

سلام اس پر جو دنیا کے لیے رحمت ہی رحمت ہے
سلام اس پر کہ جس کی ذات فخر آدمیت ہے

سلام اس پر کہ جس نے جھولیاں بھر دیں فقیروں کی
سلام اس پر کہ مشکیں کھول دیں جس نے اسیروں کی

سلام اس پر کہ جس کی چاند تاروں نے گواہی دی
سلام اس پر کہ جس کی سنگ پاروں نے گواہی دی

سلام اس پر، شکستیں جس نے دیں باطل کی فوجوں کو
سلام اس پر کہ جس کی سنگ پاروں نے گواہی دی

سلام اس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا
سلام اس پر کہ جو خود بدر کے میدان میں آیا

سلام اس پر کہ جس کا نام لیکر اس کے شیدائی
الٹ دیتے ہیں تخت قیصریت، اوج دارائی

سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا، سرفروشی کے فسانے میں

سلام اس ذات پر، جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالد و حیدر کے افسانے

درود اس پر کہ جس کی بزم میں قسمت نہیں سوتی
درود اس پر کہ جس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی

درود اس پر کہ جس کے تذکرے ہیں پاک بازوں میں
درود اس پر کہ جس کا نام لیتے ہیں نمازوں میں

درود اس پر، جسے شمعِ شبستانِ ازل کہیے
درود اس ذات پر، فخرِ بنی آدم جسے کہیے

صلی اللہ علیہ وسلم

● خورشید اکبر

غزل

عیش کے رنگیں جزیرے میں خوشی کافور سی
زندگی کے پیرہن میں زندگی کافور سی

ادھ کھلے غنچے نے ہنس کر پھول کا نوحہ پڑھا
تر بہ تر اس کا لبادہ، بے بسی کافور سی

چارگز کے اس کفن میں عیب سارے چھپ گئے
اس سے پہلے کس نے دیکھی سادگی کافور سی

شہر کے سب رنگ و روغن مرثیہ پڑھنے لگے
اڑ گئی جب آبروئے آدمی کافور سی

کچھ شگفتہ رحمتوں کا دے گئی کیا کیا حساب
روئے روشن پر سلگتی برہمی کافور سی

دیکھتے ہی دن کا یہ صحرا لرز کر رہ گیا
زرد تکیے پر مرادوں کی نمی کافور سی

بے زبانی کا وہ عالم ہے کہ دونوں ایک ہیں
بندھ گئی ہے بیچ میں اک ٹکٹکی کافور سی

کون اس کے خواب کی تعبیر میں دنیا کو لائے
دیکھتا ہے دھوپ میں وہ جل پری کافور سی

اب عظیم آباد میں ڈھونڈوں کہاں خورشید جی
مشک سا لہجہ، غزل کی شاعری کافور سی

◀◀ ● ▶▶

● خورشید اکبر

غزل

ذرا سی آب میں کپڑے نہیں بھگوتی شام
غروبِ شمس کی تھالی میں منھ تو دھوتی شام

وہ مارے شرم کے دریا میں ڈوب جاتی ہے
کرن کی ڈور سے موتی نہیں پروتی شام

درک گیا ہے ذرا سا وہ نور کا درپن
نہ جانے کیسے برستی ہے سرخ ہوتی شام

سیاہ رات کا حملہ تھا، بچ گیا سورج
سمجھ رہی تھی نئی صبح کو بپوتی شام

سیاہ داغ پہ صابن ہے رات کاجل کا
بڑے گمان میں ہے خود سے خود کو دھوتی شام

ہم ایسے عرصۂ سفاک کے مہاجر ہیں
ہماری صبح سے ہے مانگتی پھروتی شام

سنا ہے رات اندھیروں میں ڈوب جائے گی
چمکتے دن کے اجالے میں ہے کٹوتی شام

کوئی اداس ہوا قہقہوں کی محفل میں
کسی کا جشنِ مقدر ہے صرف روتی شام

زمیں پہ رہ کے بہت زیرِ بار ہے خورشیدؔ
تمام عمر وہی آسمان ڈھوتی شام

◄◄ ● ►►

● خورشید اکبر

غزل

خوشی میں حلقۂ جمہور آہ! کتنا ہے
مگر غلام کے حصے میں شاہ کتنا ہے

مکرتا رہتا ہے برقت سبز وعدوں سے
وہ پارسا بھی ندامت پناہ کتنا ہے

تمام وسعتِ صحرا ہے تشنگی اس کی
پھر اس کے بعد سمندر اتھاہ کتنا ہے

ہزار خطۂ عالم ہے اس کی مٹھی میں
وہ نامراد مگر کم نگاہ کتنا ہے

جو بڑھ گیا ہے فرشتوں سے خاکساری میں
وہ خود پسند سہی فرشِ راہ کتنا ہے

وہی عدو نئی ہمدردیوں کا سازندہ
خوشی کی ایک خبر سے تباہ کتنا ہے

وہ شہرِ نفس کی سرکش زمیں کا باشندہ
ہے بادشاہ مگر بادشاہ کتنا ہے

وہ ایک ساعتِ انکار محترم نہ ہوئی
کہ دو جہاں میں کوئی بے پناہ کتنا ہے

وہ مجھ میں زندہ ہے اک سانس کی شہادت بھر
کہ مر بھی جاؤں تو میرا گواہ کتنا ہے

قضا کی صبح میں خورشید کا چمکنا کیا
کوئی بتائے فلک پھر سیاہ کتنا ہے

● خورشید اکبر

غزل

زمیں کے حق میں شجر کا بیاں ہے کتنی دیر
فلک نہیں تو سمندر یہاں ہے کتنی دیر

وہ ایک نور کی روشن لطیف خوش خوابی
بدن کی اوٹ میں ننھی سی جاں ہے کتنی دیر

بہت ذرا سی یہ چھوٹی زمیں تو اپنی ہے
بہت بڑا ہے مگر آسماں ہے کتنی دیر

ہوا کی زد سے کوئی بچ کے رہ نہ پائے گا
لرزتی شاخ پہ اک آشیاں ہے کتنی دیر

جو دل پہ نقش ہے وہ کوئی دیکھتا ہی نہیں
بدن پہ تازہ لہو کا نشاں ہے کتنی دیر

کسے خبر تھی کہ انصاف ہار جائے گا
خلافِ حاکمِ دوراں زباں ہے کتنی دیر

ہر ایک درد کا اعلان لازمی کب تھا
نمازِ صبر سے پہلے اذاں ہے کتنی دیر

یہ اور بات کہ محرابِ جاں سلامت ہے !
وہ لامکاں ہے تو کس کا مکاں ہے کتنی دیر

مہاجرین پرندے گلہ نہیں کرتے
کہ گنبدوں کا مکمل نشاں ہے کتنی دیر

یہ آسمان بدلتا ہے روز رنگ نئے
بجھا ہے چاند ، صفِ کہکشاں ہے کتنی دیر

◀◀ ● ▶▶

● خورشید اکبر

غزل

پھر کسی ڈور سے موتی کو پرونے کا ہنر
میں نے سیکھا ہی نہیں آنکھ بھگونے کا ہنر

ہنستے ہنستے ہی مچاتا ہے نیا وقت دھمال
جاتے جاتے وہ سکھا جاتا ہے رونے کا ہنر

اونچے پربت سے ہے قدموں کا پھسلنا جاری
بہتے پانی سے ملا ہاتھ کو دھونے کا ہنر

آسماں اوڑھ کے سوئی ہے زمیں صدیوں سے
خاکساری سے بھی زیادہ ہے بچھونے کا ہنر

شہرِ کبریٰ کے دریچے ہیں تماشے میں شریک
کس طرح ، کتنا فلک بوس ہے بونے کا ہنر

ملکِ معنیٰ کو نئے موڑ پہ لے آیا ہے
کیا ہے فرہنگِ سیاست میں کھلونے کا ہنر

مفلسِ وقت کی میراث یہی ہے صاحب
دھوپ میں تپتی چٹانوں کو ہے ڈھونے کا ہنر

یہ الگ بات کہ نکلا ہے ابھی دریا سے
آ گیا ریت کو دریا میں ڈبونے کا ہنر

میں ہوں صحراؤں کی شدت سے پشیماں خورشیدؔ
خود کو سکھلایا سمندر میں سمونے کا ہنر

● خورشید اکبر

غزل

لرز رہے تھے بہت لوگ پاؤں دھرنے سے
بنا ہے ایک نیا راستا گزرنے سے

یہ شہر، شہر نہیں زندگی کا ماتم ہے
ڈرے ہوئے ہیں یہاں لوگ صرف مرنے سے

ہوائیں راہ بھٹک جاتی ہیں اندھیرے میں
بس اک چراغ کے دہلیز پر نہ دھرنے سے

وہ ایک چہرہ حسین و جمیل کتنا ہے
بہت اداس ہوا آئنہ سنورنے سے

جو تھیر پانی میں لہریں اٹھاتا رہتا ہے
وہ اپنا عکس نہ پائے گا بہتے جھرنے سے

وہ رنگ و نور کی سرحد پھلانگنے والا
بجھا بجھا سا ہے موسم پہ وار کرنے سے

کٹی ہے عمر اسی سجدۂ بشارت میں
کہ ایک وعدہ بہشتی نہیں مکرنے سے

ہزار اونچے فلک پر کرے کوئی پرواز
شگفتہ شہر کا مذہب ہے پر کترنے سے

چلا رہا ہے کوئی اور میکدے کا نظام
مجھے غرض بھی نہیں ایک جام بھرنے سے

کہیں تو سر پہ صفِ دوپہر بچھی خورشیدؔ
کہیں تو جشن ہے آنگن میں دھوپ اترنے سے

◄◄ ● ►►

زمیں زرخیز خوابوں کا جہاں نیلام ہونے کو
پھر اس کے بعد کیا ہے آسماں نیلام ہونے کو

کوئی تو ہر طرف ہے حلقۂ زنجیر کی صورت
ہزاروں منھ میں رکھتا ہے زباں نیلام ہونے کو

وہ ساحل سے پرایا ہے، بھنور کو روند آیا ہے
جلی کشتی میں تنہا بادباں نیلام ہونے کو

سلگتی دوپہر میں دھوپ ننگی ہو کے نکلی ہے
سروں سے جا چکا ہے سائباں نیلام ہونے کو

کسی کے پاس خوابوں کی نگہبانی وظیفہ ہے
کسی کے پاس ہے سارا جہاں نیلام ہونے کو

شرانگیز موسم کی شریعت میں رقم ہوں گے
اجالے گھر جلانے کو، دھواں نیلام ہونے کو

کبھی سوچا نہ تھا خورشید اکبر اس طرح ہوگا
کسی کے ہاتھ میں ہندوستاں نیلام ہونے کو

◄◄ ● ►►

● خورشید اکبر

غزل

(جوش ملیح آبادی کی نذر!)

کیسا طوفاں چراغ تک پہنچا
گھپ اندھیرا دماغ تک پہنچا

ایک ذرّہ سراغ تک پہنچا
نور اپنے فراغ تک پہنچا

پھول خوشبو بغیر کھلتا ہے
سانحہ یہ بھی باغ تک پہنچا

تشنگی رہ گئی لبِ دریا
کون پیاسا ایاغ تک پہنچا

وہ مری جاں کی سلطنت! اس پر
تخت طاؤس زاغ تک پہنچا

دل کا وہ آبلہ نہیں پھوٹا
گرم سکہ بھی داغ تک پہنچا

اک پہاڑی ندی کی یورش تھی
کوہ ٹوٹا تو راغ تک پہنچا

زندگی کاروبارِ حسرت ہے
دل کا رشتہ دماغ تک پہنچا

کتنی سادہ مزاج تھی دنیا
کام ابن صباغ تک پہنچا

دیکھ! خورشیدؔ کا ہنر آخر
جوشِ اردو کے باغ تک پہنچا

● خورشید اکبر

غزل

ایک بجلی اداس رہتی ہے
ساری بستی اداس رہتی ہے

باغ میں پھول بھی ہیں، خوشبو بھی
پھر بھی تتلی اداس رہتی ہے

کب سمندر میں آگ لگ جائے
ساری مچھلی اداس رہتی ہے

کیسی تصویرِ کائنات ہے یہ
جس میں لڑکی اداس رہتی ہے

من کو بھائے خوشی کے راگ مگر
تن کی ڈفلی اداس رہتی ہے

میں دیا انتظار کا روشن
اس کی کھڑکی اداس رہتی ہے

پہلے ہنستی تھی شہر والوں پر
اب وہ پگلی اداس رہتی ہے

شور برپا ہے چار سمت مگر
جاں اکیلی اداس رہتی ہے

چوٹ سہتا ہوں دل کے آہن پر
اس کی چھینی اداس رہتی ہے

کیا ہے خورشیدؔ یہ غزل کا کمال
نکتہ چینی اداس رہتی ہے

Arzoo Manzil
Sheesh Mahal Colony
Alam Gunj
Patna-800007
Mob:9631629952

● ارشد عبدالحمید

غزل

لفظوں کو یہ کمال ودیعت نہیں ہوا
ہم سے ترا وجود عبارت نہیں ہوا
ہم دل کے دائرے سے تجاوز نہ کر سکے
یہ حکم جاں تھا اور اطاعت نہیں ہوا
خاموشیوں کی سمفنی بیکار ہی گئی
نغمہ رہا فضا میں سماعت نہیں ہوا
نیندوں میں ٹوٹ ٹوٹ گیا انہماک شوق
تو خواب میں بھی دل کو عنایت نہیں ہوا
بادل تو آئے بارش قربت نہیں ہوئی
موسم کا یہ اشارہ اجازت نہیں ہوا
صحرا میں بستی جیسے کئی جشن ہو گئے
ہونا نہ تھا ازالہء وحشت نہیں ہوا
جو بات دل میں رہ گئی مشہور ہو گئی
جو رمز کھل گیا وہ حکایت نہیں ہوا
پائے ہنر نہ آئے مرے حرف و صوت تک
ارشدؔ در سخن در دولت نہیں ہوا

◀◀ ● ▶▶

کوئی آہٹ ہے نہ دستک ہے نہ آوازۂ شام
آس پر کس کی جیے تیرا یہ درماندۂ شام
پردۂ ہجر میں کیا کوئی صبا چہرا ہے
کیوں مہکتا ہے سر وادیِ جاں لالۂ شام
اور تو شغل نہیں کوئی سو بام و دیوار
شام کے منہ سے سنا کرتے ہیں افسانۂ شام
روز اک طفل کی مانند بہل جاتا ہوں
روز دے جاتی ہے فطرت مجھے بازیچۂ شام
کس مقدر کے اجالے نہیں ہوتے کافور
کون سا دن ہے جو ہوتا نہیں وابستۂ شام
شکریہ میرے تصور کہ تری جودت نے
چاند کے حرف سے لکھا مرا سرنامۂ شام
دھوپ کے سایے بہرحال درک جاتے ہیں
دیر تک ذہن میں رہتا ہے تو اک سایۂ شام
پھر وہی کشمکش چون و چرا ہے ارشدؔ
پھر کھڑی ہے مری دہلیز پہ حرافۂ شام

◀◀ ● ▶▶

● ارشد عبدالحمید

غزل

فتح کا بحران پانی سے زیادہ بہ رہا ہے
سطحِ دریا پست ہے اور خواب اونچا بہ رہا ہے

اب تصور کی نظر میں بھی کوئی کشتی نہیں ہے
لوگ ساحل پر کھڑے ہیں اور دریا بہ رہا ہے

خشمگیں لہریں کبھی اٹھتی رہی ہوں گی تہ آب
اب تو سب کچھ سامنے ہے بالمشافہ بہ رہا ہے

وقت اب وہ ہے کہ سارے بہنے والے تھم گئے ہیں
اور جو جس جا ہے قائم بے محابہ بہ رہا ہے

بے ضمیری کا نشاں ہے یہ جو لہروں پر رواں ہے
نعش کب ہے آدمیت کا جنازہ بہ رہا ہے

◄◄ ● ►►

تیرے سنگ یہ مٹی آسمان ہو گئی ہے
زندگی ہمارے لیے بے تکان ہو گئی ہے

موڑ دی ہے کشتیِ خواب ہم نے سوئے خواہش آب
بادِ مصلحت کی نقاب بادبان ہو گئی ہے

جسم کے درو دیوار ہو گئے ہیں بے آثار
جسم اب مکیں ہے اور جاں مکان ہو گئی ہے

گم ہوئی ہے جب بھی راہ عشق سے ملی ہے پناہ
ناقۂ زمام دل ساربان ہو گئی ہے

لوٹ آئی پھر ارشدؔ خواب کے تعاقب سے
لیجے چشم حیراں کو پھر تکان ہو گئی ہے

◄◄ ● ►►

● ارشد عبدالحمید

غزل

عشق کی راہ میں خود اپنی قیادت نہیں کی
دل نے جو چاہا کیا ہم نے حکومت نہیں کی
غم سے جنگیں نہ لڑیں ہجر سے نفرت نہیں کی
عشق کیا خاک کیا جس نے بغاوت نہیں کی
تو کسی نقش کسی جدول جاں میں نہ ملا
ہم نے تعویذ نہ رکھے کہ ریاضت نہیں کی
آپ دل میں رہے اور درد سے واقف نہ ہوئے
آپ کعبے میں گئے اور زیارت نہیں کی
سر دیوار رہا کھولتی کرنوں کا ہجوم
دھوپ کے ہاتھ پہ سایے نے جو بیعت نہیں کی
بس اسی بات پہ منسوخ ہے شہریت خواب
نیند کے جاگتے صحرا میں سکونت نہیں کی
دودمان شب ہجراں کے تو ہم بھی تھے چراغ
ہم پہ کیوں صبح در افشاں نے عنایت نہیں کی
پہنی زنجیر تو زنجیر کو بجنے نہ دیا
مجھ گرفتار نے تشہیر محبت نہیں کی
خواہشوں پر کبھی مانگا نہ خدا سے تاوان
دل معصوم نے لاشوں پہ سیاست نہیں کی
آج پھر رات کے کانٹوں پہ رہی پھول سی جان
آج پھر بستر شبنم نے کرامت نہیں کی
ہم نے ارشدؔ نہ کہی اپنی حدیث رغبت
جب تلک دل کے ہریرہ نے روایت نہیں کی

◄◄ ● ►►

● ارشد عبدالحمید

غزل

منظر کوئی آنکھوں میں سنہرا نہیں آیا
اک عمر ہوئی خواب کا تحفہ نہیں آیا
لڑکی سے یہ کہتا تھا کہ لے آؤں گا موتی
پانی میں جو اترا تو وہ لڑکا نہیں آیا
یہ چوک میں آزادی کا جو پیڑ لگا ہے
گھر تک کبھی اس پیڑ کا سایہ نہیں آیا
زیتون کی اک شاخ ابھر آئی بھنور میں
ہمت کی ندی کا جو کنارا نہیں آیا
مہلت ہی نہ تھی پیاسے مسافر کو وگرنہ
تالاب نہیں آئے کہ دریا نہیں آیا
پھول اسکے جنم دن پہ نہیں بھیج سکا میں
یہ سال مری عمر کا اچھا نہیں آیا
وہ سو گئے رفتار بہت تیز تھی جن کی
منزل پہ وہ پہنچے جنھیں چلنا نہیں آیا

◄◄ ● ►►

بہت قریب تھا دل کے وہ ماہ پارۂ جاں
تمام رات دمکتا رہا ستارۂ جاں

کہیں بھی درج نشانات اختیار نہیں
ہمارے سامنے رکھا ہے گوشوارۂ جاں

ہوئیں نگاہ میں خوابوں کی سرخیاں روشن
ترے خیال نے جاری کیا شمارۂ جاں

کچھ اور وسعت رزق و ہواضروری ہے
بدن کے دم پہ تو ہوتا نہیں گزارۂ جاں

سمجھ میں آتی ہے لیکن بیاں نہیں ہوتی
یہ جاں ہے آپ کی ارشدؔ کہ استعارۂ جاں

◄◄ ● ►►

Plot No: 64 to 67
Firdos Nagar
Near Rajban
Tonk-304001(Rajasthan)
Mob:9079863942

● ڈاکٹر رمیشا قمر

محبت سیکھ لیں

سہارے ہی
یہ دنیا اب بھی قائم ہے
حقیقی ہو، مجازی ہو
کسی سے بھی ہو، جیسی ہو
اسی سے رنگِ آدم ہے
اسی سے کارِ دنیا ہے
محبت ایسی مٹی ہے
کہ جس میں ہے وفا شامل
کہ جس میں پیار کا مادہ
کہ جس میں عشق کا پانی
اسی نے باغ کے دامن بسائے ہیں
اسی نے گل کھلائے ہیں
اسی سے رنگ ہے ہر سو فضاؤں میں
اسی سے ہے بسی خوشبو ہواؤں میں
اسی مٹی نے گوندھا ہے
خمیر اہل محبت کا
اگا ہے پیڑ دھرتی پر
اسی سے آدمیت کا
اسی سے ہر عبادت ہے

اسی سے زندگی میں چین راحت ہے
اسی سے بس لطافت ہے
محبت سرِّ وحدت ہے
اسی سے درس الفت کا
اخوت کا
مروت کا
اسی سے رنج وغم کا خاتمہ ہوتا
اسی سے یاس کے بادل بھی چھٹتے ہیں
اسی سے کیف وانبساط کی بوندیں برستی ہیں
اسی سے کلفتیں بھی دور ہوتی ہیں
نگاہیں سب اسی کے نور سے پرنور ہوتی ہیں
سبھی روحیں اسی کے لمس سے مسرور ہوتی ہیں
نشے میں چور ہوتی ہیں/محبت موتیوں کو
ایک دھاگے میں پروتی ہے
پروکر حسن کی مالا بناتی ہے
زمانے کو عجب انداز سے باور کراتی ہے
کہ جو بھی چیز اس دنیا میں آتی ہے
محبت ساتھ لاتی ہے/ہر اک کے کام آتی ہے
محبت کی نظر میں
کوئی بھی دشمن نہیں ہوتا
کوئی ظالم نہیں ہوتا
کوئی جابر نہیں ہوتا
سبھی انسان ہوتے ہیں
محبت کا تقاضا ہے/محبت سیکھ لیں سارے

◀◀ ● ▶▶

● **انٹرویو**

● **ڈاکٹر تسلیم عارف**

ادیبوں اور شاعروں کو ہم عصر تقاضوں کے تحت اپنی تخلیقات کو ڈھالنا ضروری ہے: طارق متین

طارق متین سے ڈاکٹر تسلیم عارف کی خصوصی گفتگو

[تسلیم عارف نے طارق متین کا انٹرویو 2012 میں لیا تھا۔ جب وہ پٹنہ میں قیام پذیر تھے اور اپنا رسالہ ''علم وادب'' دوبارہ نکالنا شروع کیا تھا۔]

طارق متین لکھمنیا سے تعلق رکھنے والے ایک اہم شاعر ہیں جو ہم عصر عہد میں ایک اہم شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے اب تک تین شعری مجموعے 'مشکِ سخن' (۱۹۹۷ء)، 'قندیلِ ہنر' (۲۰۰۸ء) اور 'غزالِ درد' (۲۰۱۶ء) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ 'ریاضتِ نیم شب' کے نام سے ۲۰۱۶ء میں ان کا کلیات بھی منظرِ عام پر آکر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ طارق متین کی ایک سو ایک منتخب غزلوں کو 'مسافتِ ہجر' کے عنوان سے مکتبۂ صدف نے شایع کیا ہے۔ ان کی شاعری میں کلاسیکیت اور جدیدیت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انھوں نے سنہ ۲۰۰۱ء میں سیاست میں سرگرمی بھی دکھائی اور ۲۰۰۲ء میں رام ولاس پاسوان کی پارٹی سے ایم۔ ایل۔ اے کا انتخاب بھی لڑا۔ لیکن اپنے ادبی مزاج کی وجہ سے وہ ۲۰۰۶ء میں پھر سے ادبی کاموں میں مصروف ہوئے۔ طارق متین ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی مدیرانہ صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اس کا منھ بولتا ثبوت ۱۹۹۲ء میں ان کے ذریعے نکالا گیا رسالہ 'علم وادب' ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'گل وصنوبر' اور 'سخن وراں' جیسے معیار

رسالے بھی نکالے۔موجودہ وقت میں وہ مونگیر میں سکونت پذیر ہیں اور عظیم آباد آکر اپنے ادبی ذوق وشوق کو باقی رکھتے ہوئے پروان چڑھا رہے ہیں۔انھیں صدیق مجیبی ،لطف الرحمٰن اور سلطان اختر جیسی اہم ادبی شخصیات کی شعری تربیت حاصل ہےلیکن انھوں نے شاعری میں اپنا الگ اندازِ بیان وضع کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان سے لیے انٹرویو کے اہم اجزا پیشِ خدمت ہیں:ڈاکٹر تسلیم عارف،صدر شعبۂ اردو،ایس ایس وی کالج،کہل گانو، بھاگل پور، بہار

تسلیم عارف: طارق صاحب،اپنے وطن اور خاندان کے بارے میں بتائیں۔

طارق متین: میری پیدائش جس وطن میں ہوئی اس کا نام لکھمنیا ہے جو بیگوسرائے ضلع کا ایسا علاقہ ہے جہاں تصوف کی گہری اور پرانی روایت رہی ہے۔وہاں شیخ سلطانؒ نے وہاں قدم رکھا،جس کی صدی ،عیسویں کا اندازہ مجھے نہیں ہےلیکن انھوں نے ہی اس بستی کو آباد کیا۔لوگوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہاں آکر پہلی مرتبہ انسانی خدمت شروع کی۔جس کا حکم انھیں اپنے بزرگوں سے ملا تھا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک بڑے بزرگ فضلِ حق گنج مرادآبادی ان کے پیر تھے۔ تو لکھمنیا کے بارے میں ایک بات تو یہ ملتی ہے۔اس کے علاوہ لکھمنیا کی ایک قدیم مسجد ہے،جس میں ہم لوگ نماز ادا کرتے ہیں اس کے بارے میں بھی ایک روایت یہ ملتی ہے کہ وہ بھی راتوں رات تیار ہوگئی تھی۔اس کا واقعہ بھی بڑا حیرت انگیز ہے۔اس کے سلسلے میں لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ علاقہ بالکل جنگل کی طرح تھا۔وہاں قریب سے ایک پانی کا جہاز گزر رہا تھا،وہ یہاں لنگر انداز ہوا۔ جہاز کے لوگوں نے یہاں ایک چھوٹی سی کٹیا دیکھی اور جب اس کے اندر گئے تو وہاں شیخ سلطان کو پایا۔انھوں نے شیخ صاحب سے کہا کہ حضور ہمارا جہاز کسی طرح یہاں پھنس گیا ہے، آپ اس کے نکلنے کے لیے دعا فرمادیں تاکہ ہمارا سفر جاری رہ سکے۔شیخ سلطانؒ نے ان سے کہا کہ جاؤ،تمھارا جہاز نکل جائے گا۔تو میری غرض ان سب باتوں کے بتانے کی یہ ہے کہ اس علاقے لکھمنیا میں ابتدا ہی سے تصوف کی روایت کا اہم رول رہا ہے۔حال ہی میں شیخ سلطانؒ پر ایک پروفیسر صاحب کی کتاب آئی ہے جس میں انھوں نے اس واقعے کو نقل کیا ہے۔جب جہاز کا مسئلہ حل ہوا تو اس کے مالکان شیخ صاحب کے پاس آئے اور ان سے گزارش کی کہ آپ نے ہمیں بہت بھاری نقصان سے بچالیا،ہم آپ کے لیے کیا کرسکتے ہیں۔تو شیخ صاحب نے ان سے کہا کہ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو اس جگہ اللہ کا ایک گھر تعمیر کرادو۔لہٰذا جہاز کے مالکان نے

یہاں ایک مسجد تعمیر کرا دی، جو آج لکھمنیا کی سب سے قدیم مسجد ہے جو 'پرانی مسجد'، 'شیخ سلطان مسجد' یا 'مسجدِ سلطانیہ' کے نام سے لکھمنیا میں مشہور ہے۔

میری پیدایش اسی علاقے لکھمنیا میں ہوئی۔ میری تاریخِ پیدایش کے بارے میں والدین کا کہنا ہے کہ میں ۱۹۶۸ء میں ہوئی۔ لیکن والد صاحب نے سرٹی فیکیٹ میں تقریباً دو برس بڑھا کر درج کرا دیا۔ تو سرٹی فیکیٹ میں میری تاریخِ پیدایش یکم/مارچ ۱۹۷۰ء ہے جو میرے شناختی کارڈ (آئی ڈی کارڈ) میں بھی درج ہے اور اصل میں یہ تاریخ پیدایش ۱۰/جولائی ۱۹۶۸ء ہے۔ میری سرٹی فیکیٹ کی تاریخِ پیدایش ہی جناب کوثر مظہری کی کتاب 'جواز و انتخاب' میں درج ہے۔ اس میں میرا بایوڈاٹا شایع ہوا تھا۔ یہ کتاب نئے شاعروں کے کلام کا انتخاب تھی جس میں تاریخِ پیدایش کی اس گڑبڑی کی وجہ سے مجھے یہ نقصان ہوا کہ مجھے سب سے آخری انعام ملا اور تمام شعرا سے میں جونیر قرار دیا گیا۔

تسلیم عارف: اپنے والدین اور بھائیوں بہنوں کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔

طارق متین: میرے والد محترم کا نام محمد متین الدین ہے اور والدہ محترمہ کا نام شمیمہ خاتون۔ والد کے نام پر ہی ہمارے نام کا ٹائٹل متین ہے۔ والد صاحب چمڑے کی تجارت کیا کرتے تھے حالاں کہ ہم لوگ خاندانی اعتبار سے قریشی نہیں ہیں۔ یہ صرف پیشے کے طور پر اختیار کیا گیا کام ہے۔ ہماری کوئی بہن نہیں ہے۔ مجھ سے بڑے ایک بھائی شارق متین ہیں۔ وہ ہمارے گانوں میں ہوزیئری آئٹمس کے بہت بڑے بزنس مین ہیں۔

تسلیم عارف: آپ اپنی اہلیہ اور بچوں کی تفصیل بتائیں؟

طارق متین: میری شادی ۱۹۹۵ء میں فوزیہ پروین سے ہوئی۔ یہ تاریخ میں گریجویٹ ہیں۔ ہماری اولاد میں سب سے بڑی بیٹی کا نام ادا متین جو ابھی گریجویشن کر رہی ہے۔ صاحب زادے الماس متین میٹرک کا امتحان پاس کر کے ابھی گانوں میں آگے کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ایک اور صاحب زادی انا متین ہیں جو نارٹنگم پبلک اسکول، مونگیر جو کہ مونگیر کا بہت بڑا مشنری اسکول ہے، اس میں کلاس ۳/ میں زیرِ تعلیم ہے۔ ہم نے اپنے تمام بچوں کے نام 'الف' کے حرفِ تہجی سے رکھا ہے۔

تسلیم عارف: آپ کی تعلیم و تربیت کے بارے میں بھی کچھ بتائیں؟

طارق متین: جہاں تک تعلیم کی بات ہے تو میں نے بنیادی تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی۔ ہمارے خانوادے میں یہ روایت رہی تھی کہ استاد آ کر گھر پر قرآنی تعلیم دیتے تھے اور اسکولی تعلیم بھی ساتھ ساتھ ہوا کرتی تھی۔ میں سب سے پہلے جس اسکول میں داخل ہوا اس کا نام تو یاد نہیں البتہ یہ یاد ہے کہ وہ

اسکول میرا ٹولی میں ہوا کرتا تھا۔اس کے بعد ساتویں جماعت میں ایک دوسرے اسکول میں داخلہ لیااس کا نام تھا آر۔ایس۔ایس ہائی اسکول، بلیا۔اس اسکول میں میری کارکردگی کافی اچھی رہی اور یہیں سے میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اوراپنے اسکول میں ٹاپ پوزیشن حاصل کی۔اپنی جماعت میں میرے مارکس سب سے زیادہ ۶۲۹ نمبر آئے تھے۔جس کے بعد میں نے زمانے کے مطابق آئی ایس سی میں آر۔ڈی اینڈ ڈی۔ جے کالج،مونگیر میں داخلہ لے لیا۔لیکن میرے مزاج نے آئی ایس سی سے مطابقت نہیں کی۔صحبت ایسے لوگوں کی ہوئی اور شعروشاعری کا چسکا لگا تو میں نے تعلیم بیچ میں ادھوری چھوڑ دی۔اس کے بعد سائنس سے آرٹس کی جانب آئے۔جی۔ڈی کالج، بیگوسرائے میں داخلہ لے کرآئی۔اے۔کی تعلیم مکمل کی۔اس کے بعد وہیں سے انگریزی مضمون میں آنرس کیا اور انگریزی ہی میں ایم۔اے۔کیا۔ماسٹر ڈگری میں بھی مجھے فرسٹ کلاس مارکس حاصل ہوئے۔لیکن آگے کی تعلیم میں نہیں حاصل کرسکا۔

تسلیم عارف: آپ کی شاعری کی ابتدا کیسے ہوئی؟

طارق متین: مونگیر کے کالج کے زمانے میں بیکا پور میں ایک لائبریری ہوا کرتی تھی جس میں مختلف پروگرام ہوا کرتے تھے جس میں میری شرکت ہوا کرتی تھی۔وہاں پروفیسر شبیر حسن جن پر میں نے اپنے رسالے 'علم وادب' میں پورا گوشہ شایع کیا ہے، جو سائنس کے استاد تھے،انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنا مضمون اور اسٹریم تبدیل کرلوں۔ مجھے اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی اور لیکن بعد میں ان کی بات صادق آئی اور قسمت سے میرا مضمون تبدیل ہوگیا۔انھوں نے یہ مشورہ میری خاندانی تعلیمی روایت کو دیکھتے ہوئے دیا تھا کہ گھر پر میں نے جو تعلیم حاصل کی تھی اس میں اردو اور فارسی کی تعلیم شامل تھی۔اس سلسلے میں ہمارے ایک استاد جو ہمارے اپنے محترم چچا 'علی حیدر' تھے جو ابھی حیات سے ہیں اور ہم انھیں بڑے ابّی کہا کرتے تھے،ان کی صلاحیت اور لیاقت بہت اچھی تھی۔گرچہ انھوں نے کبھی اسکول میں نہیں پڑھایا لیکن ان کو اردو اور فارسی پر کافی دست رس حاصل تھی۔انھوں نے جو پڑھایا وہی آج میرے لیے سرمایہ ہے۔اسی لیے میں نے اپنے پہلے شعری مجموعے کا انتساب انھی کے نام کیا ہے۔میرے اندر اردو کا ذوق، کلام میں فارسیت اور کلاسیکیت کو کھنگھالنے کا جو ذوق پیدا ہوا،اس میں ان کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کا میں احسان مند بھی ہوں اور شکر گزار بھی ہوں۔

پروفیسر شبیر حسن صاحب نے یہ جو مجھے مشورہ دیا اس میں یہ بات شامل تھی کہ وہ اپنی کچھ ادبی

کارگزاریوں میں مجھے شامل رکھتے تھے اور زبان کے معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔حالاں کہ اس میں وقت میں صرف آئی ایس سی کا طالبِ علم تھا، پھر بھی وہ میری صلاحیت پر اعتبار کرتے ہوئے اپنے افسانوں اور شاعری جن میں نثری نظمیں آتی تھی، اس کی زبان کے بارے میں مجھ سے مشورے لیا کرتے اور آپ کو یہ جان کر کافی حیرت ہوگی کہ میں بھی کبھی کبھی ان کی اصلاح کر دیا کرتا تھا۔اس بات کا اعتراف شبیر صاحب آج بھی کرتے ہیں۔

اس زمانے میں لکھمنیا میں 'حلقۂ ادب' کے نام سے ایک ادبی انجمن آباد تھی۔اس کی نشستوں میں اکثر طرحی مصرعے دیے جاتے تھے۔یہ سنہ ۱۹۸۳ء کی بات ہے کہ ہمارے ایک آشنا عبید گہر صاحب جو ایک شاعر تھے اور مونگیر جمال پور نام کے ایک گاڑیوں کی ورکشاپ میں کام کرتے تھے اور وہ لکھمنیا اور مونگیر کا سفر اکثر کیا کرتے تھے۔ان سے ہماری بات چیت ہوتی رہتی تھی۔انھوں نے ایک مرتبہ ہم سے ذکر کیا کہ حلقۂ ادب لکھمنیا نے اس مرتبہ طرحی مصرعہ فیض صاحب کے مصرعے:

کسی کی مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

طے کیا ہے۔میں نے اس طرح پر بر جستہ دو شعر کہہ دیے۔اور میں نے عبید گہر کو لکھوا کر روانہ کر دیا۔ان میں سے ایک شعر یہ تھا:

متاعِ غم کے سوا اس کو کیا ملا ہوگا　　شبِ دبیرِ ستم جس کے سر گئی ہوگی
ہم آج جا نہ سکے بزمِ یار میں طارقؔ　　کسی رقیب کی قسمت سنور گئی ہوگی

یہ میرے ابتدائی دو شعر تھے۔اور اس میں دیکھیے کہ ابتدائی شعر میں ہی فارسی کا استعمال از خود مجھ سے ہو گیا۔جب بنیاد اچھی ہو تو آگے کی راہ ایسی ہی بہتر ہوتی ہے۔ان میں وزن و بحر کے اعتبار سے کوئی کمی نہیں۔یعنی میری طبیعت موزوں تھی۔ان دو اشعار کو سننے کے بعد تو عبید صاحب بالکل مُصر ہو گئے کہ آپ کو لکھمنیا کے حلقۂ ادب کے مشاعرے میں شریک ہونا ہی ہوگا۔اس مشاعرے میں استاد شاعر معین الدین درد صاحب، منظر حمید غم صاحب، احسان الرحمٰن آتش، قاضی زبیر بیخود صاحب، عبدالصمد تپش جیسے بزرگوار شعرا شامل تھے۔ بعد میں جن بزرگوں کا مجھے ساتھ ملا ان میں پروفیسر ظفر حبیب، شمیم بے تاب، ولی مدنی وغیرہ صاحبان اہم ہیں۔تو بات چل رہی تھی کہ عبید صاحب مجھے ضد کر کے مشاعرے میں لے گئے اور تمام افراد کے سامنے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ایک نئے شاعر کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔میں نے جب اس مشاعرے میں یہ دو اشعار پڑھے تو لوگوں نے ان کی کافی تعریف کی۔جب میں شعر پڑھ رہا تھا تو وفا ملک پوری صاحب نے کہا کہ 'اچھا ہے،

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، جس کی وجہ سے مجھے آگے باضابطہ طور پر شعر کہنے کی تحریک ملی۔ آج تک میری موزونیِ طبع کا یہ عالم ہے کہ کوئی میرے سامنے بے وزن شعر پڑھ کر نہیں نکل سکتا۔ حالاں کہ ابتدائی اشعار کہتے وقت مجھے عروض سے واقفیت نہیں تھی لیکن آگے چل کر میں نے عروض بھی سیکھ لیا۔ اس کے بعد ایک اور طرحی مشاعرے میں مجھے بلایا گیا جس کی طرح تو مجھے یاد نہیں لیکن میں نے اس محفل میں جو غزل کہی اس کا ایک شعر بہت مشہور ہوا تھا۔ وہ شعر یہ ہے:

رو رو کے کس کی یاد میں اے شمعِ بزم تو　　اشکوں کی اوڑھتی ہے رِدا سر سے پانوں تک

یہ شعر میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ میری بہت سی ایسی غزلیں ہیں جو طرحی مشاعروں کے لیے کہی گئی تھیں، جنھیں میں محفوظ نہیں کر سکا اور اسے پھاڑ کر ضایع کر دیا گیا۔ بعد میں نئی شاعری کرنے لگا جس کی وجہ سے میں نے خود ان غزلوں کو ضایع کر دیا۔

تسلیم عارف: آپ کے خانوادے میں آپ سے قبل کوئی شعری روایت رہی؟

طارق متین: میں نے ابھی جن بزرگ شعرا کا ذکر کیا ان میں عبدالصمد تپش (چچا)، نصر حمید خلش (چچا)، منظر حمید غم، ظفر حبیب چچازاد بھائی ہمارے خانوادے کے لوگ تھے۔ قاضی زبیر صاحب نے ہمیں انگریزی پڑھائی اور میں جب شعر کہنے لگا تو ان سے اصلاح لینے کی غرض سے با قاعدہ زانوے تلمّذ تہہ کرنے کی کوشش کی جسے انھوں نے قبول نہیں کیا اور کہا کہ میں آپ کی اصلاح نہیں کروں گا بلکہ آپ خودرَو پودے کی شکل میں ترقی کریں۔ البتہ شاعری کی جو ہنرمندی ہے وہ میں نے قاضی زبیر صاحب سے ہی سیکھی اور میں یہ مانتا ہوں کہ وہ ہی شاعری میں میرے استاد ہیں۔

تسلیم عارف: آپ ابتدائی زمانے میں کن کن رسالے میں شایع کرایا؟

طارق متین: ابتدائی دور میں طرحی مشاعروں کے لیے طرحی غزلیں کہتا رہا۔ میرے خیال میں ۸۷-۱۹۸۶ء میں انشاء، کلکتہ میں شایع ہوا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ ہندستان یا پاکستان سے شایع ہونے والا کون سا ایسا قابلِ ذکر رسالہ ہے جس میں میں نہیں چھپا۔ تمام معیاری پرچوں میں میرا کلام شایع ہوا ہے۔ ایوانِ اردو، آج کل، بیرونی ممالک سے نکلنے والے پرچوں میں جمشید مسرور جو ناروے سے ایک پرچہ نکالتے تھے جس کا نام میرے ذہن سے نکل گیا، اس میں میرا کلام شامل ہوا۔ اس کے علاوہ پاکستان سے نکلنے والے کئی رسالوں میں چھپا۔ آج کل میں ۱۹۸۸ء میں بہت کوشش کے بعد میری غزل جس کا مصرع ہے:

اک یہی معرکہ ایسا تھا جو سر کر نہ سکا

شایع ہوئی۔اس کے بعد زبیر رضوی صاحب نے 'ذہنِ جدید' کے عنوان سے۱۹۹۲ء میں بہت اہم پرچہ نکالا، یہ رسالہ مجھے بہت پسند تھا۔اس میں میری غزلیں زبیر صاحب نے خصوصیت سے شایع کیں۔اس کے علاوہ مغنی تبسم صاحب کے رسالے 'شعر وحکمت' میں بھی مجھے کئی مرتبہ شایع کیا گیا۔کبھی کبھی تو اس میں سات سات غزلیں ایک ساتھ شایع ہوئی ہیں۔

تسلیم عارف: کیا آپ اردو ادب کی کسی تحریک سے وابستہ ہوئے؟

طارق متین: نہیں۔ میں اردو ادب کی کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہوا۔اور تحریک اور ازم کا میں کبھی قائل نہیں رہا۔ میں نے اپنے شعری مجموعے کے پیش لفظ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ میں کسی ازم کا قائل نہیں، راہِ زندگی میں مجھ پر جو گزرتی ہے، وہی تخلیق کی شکل میں ڈھلتی رہتی ہے۔

تسلیم عارف: آپ کی شاعری پر کسی تحریک کا اثر ہے یا نہیں؟

طارق متین: مجھے لگتا ہے کہ میری شاعری پر کسی تحریک کا اثر نہیں ہوا۔شاعری تحریک سے چل بھی نہیں سکتی ہے۔میں اس کا قائل نہیں ہوں۔

تسلیم عارف: قدیم اور جدید شاعروں میں آپ کے پسندیدہ شاعر کون کون ہیں؟

طارق متین: قدیم شعرا میں مجھے غالب میر سے زیادہ بھاتے ہیں۔میر بے شک ایک بڑے اور عظیم شاعر ہیں اس سے مجھے انکار نہیں لیکن مجھے غالب زیادہ پسند آتے ہیں اور میں نے ان کا بالاستعیاب مطالعہ کیا ہے۔ان کے علاوہ مومن بھی پسند ہیں۔ بعد والوں میں مجھے سب کی طرح اقبال نے متاثر کیا۔ان کی اسلامی اساطیر کا میں قائل ہوں۔ چوں کہ میں بھی ایک علمی اور مذہبی خانوادے کا پروردہ ہوں اس لیے ان کے کلام سے متاثر ہونا کوئی غیر فطری بات بھی نہیں ہے۔ بعد کے شاعروں میں مجھے فیض کی جمالیاتی شاعری نے متاثر کیا۔اس کے بعد ناصر کاظمی کی شاعری اپنے لہجے اور اسلوب کے اعتبار سے مجھے کافی پسند آئی۔ مجھے جس شاعر نے جدید شعرا میں سب سے زیادہ متاثر کیا ان کا نام عرفان صدیقی ہے۔اس علاوہ صدیق مجیبی مجھے کافی پسند ہیں۔

تسلیم عارف: عرفان صدیقی کے یہاں کیا چیز آپ کو متاثر کرتی ہے؟

طارق متین: ان کے یہاں کلاسیکی لفظیات سے نئے مفاہیم جس انداز سے ابھارے گئے ہیں، اس کا جواب نہیں ہے اور ان کی ترکیب سازی بھی کمال ہے، وہ مجھے کافی متاثر کرتا ہے۔ان کے یہاں جدیدیت والی جدت نہیں پائی جاتی۔ یہاں شاعری کی اصل جدت دکھائی دیتی ہے۔ جدیدیوں نے تو شاعری کو بگاڑ دیا۔اینٹی غزل اور فلاں فلاں نام دے کر۔لیکن عرفان صدیقی

کے یہاں جو شاعرانہ جدت پائی جاتی ہے، میری نظر میں اصل جدید شاعری یہی ہے۔

تسلیم عارف: اس کے علاوہ آپ کو کسی اور شاعر نے بھی متاثر کیا؟

طارق متین: میں عرفان صدیقی کے علاوہ صدیق مجیبی کی شاعری نے کافی متاثر کیا۔ ان کے علاوہ ایک اور شاعر عبداللہ کمال ہیں جنھوں نے مجھے کافی متاثر کیا۔ وہ غالباً مظفر پور کے شاعر تھے جو ممبئی میں آباد ہو گئے۔

تسلیم عارف: آپ کی شاعری پر کن شعرا کے اثرات ہیں؟

طارق متین: میرے خیال میں یہ بات ناقدین ادب بتائیں گے کہ میری شاعری پر کن کے اثرات ہیں۔ میں نے غالب اور میر اور دیگر شعرا سے استفادہ ضرور کیا ہے اور سیکھا ہے کہ شاعری کیسے کی جاتی ہے لیکن اب اس سوال کا جواب ناقدینِ ادب تلاش کریں کہ میری شاعری میں کن کے اثرات ہیں۔

تسلیم عارف: آپ خود کو کس قبیل کے شعرا میں شمار کرتے ہیں؟

طارق متین: ہمارے معاصرین میں جو اچھے اور معیاری شعرا ہیں جیسے خالد عبادی، خورشید اکبر، عالم خورشید، راشد طراز، نعمان شوق، فرحت احساس، شہپر رسول ہیں۔ میں خود کو انہی کی صف میں اپنی جگہ دیکھتا ہوں۔ یوں تو میں کلاسیکی شاعر نہیں کہا جا سکتا لیکن ناقدین ادب کا کہنا ہے کہ میں قدامت پسند ہوں۔ خالد عبادی نے مجھ پر ایک مضمون میں یہی بات لکھی کہ میں قدیم شعرا کی پیروی کرتا ہوں۔ لیکن میری رائے میں میری شاعری کلاسیکیت جدید شاعری کے امتزاجی عناصر سے عبارت ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ شعر ایسا پیش کروں جس میں تاثیر ہو۔ اوٹ پٹانگ قسم کی شاعری یا لفظوں سے کھلواڑ والی شاعری مجھے بالکل پسند نہیں۔ میں بہ حیثیت رسالے کے ایڈیٹر کے بھی اپنے رسالوں میں اس قبیل کی غزلیں شامل نہیں کرتا۔ علم و ادب میں شایع ہونے والی غزلوں میں ایسے اشعار شامل ہوں تو اسے بھی ہٹا دیتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک شاعر نے ایک شعر میں ٹھرّ الفظ کا استعمال کر لیا تھا تو میں نے وہ شعر ہٹا دیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ شکیل جمالی کی غزل میں ایک شعر تھا:

محبت آڑے آ رہی ہے   وہ دیکھو اک عورت آ رہی ہے

تو ہم نے شکیل صاحب سے کہا کہ شکیل بھائی اس طرح سیدھے شاعری نہیں کی جاتی ہے کہ وہ دیکھو عورت آ رہی ہے۔ ہمارے قدیم اور کلاسیکی شعرا نے کبھی اس طرح سیدھے باتوں کو نہیں پیش کرتے بلکہ استعارے اور کنایے میں پیش کرتے ہیں۔ آپ جو اس طرح شعر میں جدت کے لیے ایسا قافیہ استعمال کر رہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔

تسلیم عارف: موجودہ عہد کے شاعروں میں آپ کن کو پسند کرتے ہیں؟

طارق متین: یہ سوال آپ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔ کیوں کہ میں جن لوگوں کا نام لوں گا وہ تو خوش ہوں گے اور جن کا نام نہیں لوں گا وہ ناراض ہو جائیں گے۔ اس لیے اس سوال سے میں معذرت کرتا ہوں۔ اب میں خواہ مخواہ کسی کو کیوں ناراض کروں۔

تسلیم عارف: لکھمنیا میں رہتے ہوئے آپ نے کیا اردو زبان و ادب کے فروغ کی کوئی کوشش کی؟

طارق متین: جی، اس سلسلے میں آپ کو میں ایک خاص بات بتانا چاہوں گا۔ لکھمنیا کی ادبی اور تہذیبی تاریخ تقریباً پچاس برسوں پر محیط ہے لیکن افسوس کی بات کہ وہاں سے کوئی ادبی پرچہ شایع نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس بحران کو دیکھتے ہوئے سال ۱۹۹۲ء میں 'علم و ادب' عنوان سے ششماہی پرچہ نکال کر اس کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے علاوہ حلقۂ ادب بند ہو گیا تھا۔ اسے متحرک کرنے کی کئی مرتبہ کوشش کی۔ میں نے چھوٹے بچوں کے لیے 'علم و ادب اکیڈمی' کے نام سے ایک اسکول بھی کھلوایا جس میں اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنایا گیا تھا۔

لکھمنیا میں کاروانِ ادب کے نام سے میں نے ایک انجمن بنوائی۔ جس کی نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن میں لکھمنیا میں جب نہیں ہوتا تو اس کی سرگرمیاں بھی مدھم پڑ جاتی ہیں۔ اگر میں لکھمنیا میں موجود ہوتا ہوں تو اس کی سرگرمیوں کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ۱۹۹۶ء میں 'علم و ادب' کو لے کر پٹنہ آ گیا اور یہاں باقاعدہ حکیم شکور منزل، پٹنہ ایک دفتر قائم کر کے اس رسالے کو پٹنہ شہر سے نکالنے کا اعلان کیا۔ یہاں سے 'علم و ادب' کے کئی اہم شمارے یہاں سے نکالے گئے جن میں وہ شمارہ بھی شامل ہے جس میں شمس الرحمٰن فاروقی پر چند مضامین شامل تھے۔ اسی زمانے میں عبدالصمد کو ساہتیہ اکادمی انعام ملا تھا، تو ہم نے رسالے میں عبدالصمد کا ایک گوشہ بھی شایع کیا تھا۔ جسے لوگوں نے کافی پسند کیا اور یہ شمارہ کافی ہٹ رہا تھا۔

رسالے کو سنبھالنے میں جناب صفدر امام قادری تو ابتدا ہی سے اپنی پوری توجہ عنایت کی۔ بعد میں معاونین میں خالد عبادی، خورشید اکبر، عالم خورشید اور دوسرے لوگ شامل ہو گئے۔ ان لوگوں کی ہمارے دفتر میں آمد و رفت ہوتی رہتی تھی۔ اور 'علم و ادب' باقاعدگی سے نکلتا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً سنہ ۲۰۰۰ء تک چلتا رہا۔ اس کے بعد میں پٹنہ سے لکھمنیا واپس چلا آیا۔

تسلیم عارف: سیاست میں آپ کی شمولیت کب اور کیسے ہوئی؟

طارق متین: ۲۰۰۱ء میں لکھمنیا میں آر۔ جے۔ ڈی کا دبدبہ تھا اور شری نرائن یادو نام کا منسٹر ہوا کرتا تھا۔ اس کا

ہمارے علاقے میں کافی دبدبہ تھا۔اسی کے زیرِ اثر کچھ لوگ منسٹر کے نام کا استعمال کرکے اپنا دبدبہ قائم کیے ہوئے تھے اور وہاں کے لوگوں پر ناحق ظلم کررہے تھے۔لوگوں کو بے وجہ ڈرانے دھمکانے کا کام کیا جاتا تھا۔اس کے ردِّعمل میں ایک ادیب اور شاعر ہونے کی وجہ سے مجھے یہ باتیں برداشت نہیں ہوئیں۔کیوں کہ میں ایک حساس شاعر ہوں اور شاعر اور ادیب کے اندر ایک باغیانہ تیور ہوتا ہی ہے۔اس زمانے میں ضلع پریشد کا انتخاب ہونا تھا۔اس وقت جناب چاند مرحوم جو کانگریس کے لیڈر ہوا کرتے تھے،اس وقت وہ حیات سے تھے اور میں اپنے اسکول علم و ادب اکیڈمی کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ چاند صاحب نے اسکول کے باہر موٹر سائیکل لگائی،میرے دفتر آئے اور کہا کہ بھائی!ضلع پریشد کا چناؤ ہونے والا ہے،آپ جس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں،اس علاقے سے آپ بھی اس کے لیے اپنی دعوے داری پیش کریں۔میں نے ان سے کہا کہ بھائی میں ادیب وشاعر ہوں، مجھے سیاست کہاں راس آئے گی۔تب میری بات سن کر انھوں نے ایک جملہ کہا جس کا مجھے قائل ہوجانا پڑا اور میں نے سیاست میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا اور چناؤ میں بھی لڑا۔ان کا جملہ یہ تھا کہ جب سیاست میں اچھے لوگ نہیں آئیں گے تو برے لوگ ہی آئیں گے اور اگر اچھے لوگ سیاست میں آنا شروع کردیں تو برے لوگ دھیرے دھیرے کم ہوتے چلے جائیں گے۔اس کے بعد میں نے ضلع پریشد کا چناؤ لڑا اور مجھے بہت لوگوں نے ووٹ دیے اور بہت زبردست مقابلہ رہا۔حالاں کہ میں چناؤ جیت تو نہیں سکا لیکن شری نرائن یادو کا جو دبدبہ تھا وہ رفع ہوگیا۔چناؤ میں شری نرائن یادو کے زیرِ اثر جو لوگ ظلم و جبر کر رہے تھے،ان ہی میں سے ہی ایک امیدوار راکیش پرساد سنگھ تھا،اسی سے میری سیدھی ٹکر ہوئی اور ہماری ٹکر میں خواہ مخواہ ایک تیسرا امیدوار جیت گیا لیکن میں نے راکیش پرساد سنگھ کو جیتنے نہیں دیا۔چناؤ سے پہلے اس نے میری مقبولیت کو دیکھتے ہوئے راکیش پرساد سنگھ نے مجھے آفر دیا تھا کہ میں اس سے دو لاکھ لے کر انتخاب لڑنے سے انکار کردوں۔میں نے اس سے کہا کہ تم مجھ سے ڈھائی لاکھ لے لو اور تم اس مرتبہ کے انتخاب سے نام واپس لے لو۔اگلے سال میں چناؤ نہیں لڑوں گا۔یہ تمام باتیں ہوئیں لیکن آخر کار وہ بھی نہیں جیت سکا۔ مجھے ۳۵۴۰/ووٹ آئے اور اسے بھی جہاں تک مجھے یاد ہے ۳۶۰۰ یا ۳۴۰۰/ووٹ آئے۔اسی کے ساتھ میری سیاست میں انٹری ہوگئی۔اور ظاہر ہے کہ جس شخص کو پہلے انتخاب میں تقریباً ۳۵۰۰/ووٹ مل جائیں اور ضلع پریشد کے چناؤ میں معمولی نہیں ہوتا ہے تو فطری بات ہے کہ وہ سیاست میں ضرور آنا چاہے گا۔

اس کے بعد ۲۰۰۲ میں رام ولاس پاسوان نے اپنی ایک سیاسی پارٹی بنائی جسے لوک جن شکتی پارٹی کا نام دیا۔ میں چوں کہ ضلع پریشد کے چناؤ کے وقت بہت متحرک تھا، اس لیے مجھے لوک جن شکتی پارٹی (لوجپا) کی جانب سے آفر ملا کہ میں ان کی پارٹی جوائن کرلوں۔ تو میں نے بہت تام جھام اور دھوم دھڑاک کے ساتھ رام ولاس جی کی پارٹی جوائن کر لی۔

اس کے بعد میری بہترین کارکردگی کو دیکھتے ہوئے پارٹی نے مجھے سنہ ۲۰۰۵ء میں ایم۔ ایل۔ اے۔ کا ٹکٹ دے دیا۔ اس چناؤ میں میں نے شری نرائن یادو کو ہرا دیا جو بیس برسوں سے لگاتار منسٹر تھا، حالاں کہ میں اس انتخاب میں کامیاب نہیں ہوا بلکہ جمشید اشرف صاحب نے جیتا۔ لیکن اس پہلوان کو چت کرنے کی وجہ سے میں خود کو ہارنے کے باوجود جیتا ہوا امیدوار سمجھتا ہوں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آر۔ جے۔ ڈی۔ اس کے بعد سے ہوا ہوگئی۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ سنہ ۲۰۰۵ء کے بعد میں نے سیاسی سرگرمی تھوڑی کم کیں اور دوبارہ ادب کی طرف رجوع کیا۔

تسلیم عارف: تو کیا آپ کو سیاست راس نہیں آئی؟

طارق متین: یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ سیاست راس نہیں آئی لیکن میں ہارنے کے باوجود دل میں ا یک اطمینان کی کیفیت پیدا ہوئی کہ میری وجہ سے عوام کو ظلم و جبر سے نجات ملی۔ اور ادب تو ہماری سرشت میں شامل تھا، ظاہر سی بات ہے کہ ادب سے دور تو رہا نہیں جا سکتا۔ ان چھے سات برسوں میں میں نے خود کو ادب سے دانستہ طور پر۔ یا یہ بھی بات تھی کہ وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ علم و ادب رسالہ جاری نہیں رہ سکا اور بند ہوگیا۔ کوئی مالی دشواری اس کا سبب نہیں تھی۔

تسلیم عارف: مونگیر میں آپ اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کی تفصیل بتائیے۔

طارق متین: مونگیر سے میں نے ۲۰۰۶ء میں ایک ادبی رسالہ 'آغاز' نکالا جس کو 'شب خون' کے بند ہونے کے بعد ہم نے اس نیت سے نکالا کہ ہم بھی شب خون جیسا رسالہ نکال سکتے ہیں۔ یہ رسالہ راشد طراز کی معاونت سے نکالا گیا۔ یہ بہت معیاری رسالہ تھا اور ایک مرتبہ شمیم حنفی نے ہمیں لکھا کہ اگر آپ لوگ اتنا معیاری رسالہ نکال رہے ہیں تو شب خون کی کاپی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم نے انھیں یہ بتایا کہ ہم شب خون کا طرز اس لیے اختیار کر رہے ہیں کہ ہم شمس الرحمٰن فاروقی کو چڑھانا چاہتے ہیں۔ خیر، اس کے بعد ہم نے ۲۰۱۱ء میں 'گل وصنوبر' نام سے بھی ایک رسالہ جاری کیا جو تین برسوں تک مسلسل جاری رہا۔ ہم نے مونگیر میں 'بزمِ ادب' کے نام سے ایک ادبی انجمن بھی قائم کی جس کی نشستیں اکثر ہوا کرتی تھیں۔

تسلیم عارف: آپ کن ناقدین ادب کو پسند کرتے ہیں؟

طارق متین: مجھے کلیم الدین احمد کی تنقید پسند آتی رہی ہے۔قاضی عبدالودود کی تنقید وتحقیق کا میں قائل ہوں اوران کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔اس کے علاوہ کسی کے کہنے پر میں نے الطاف حسین حالی کی 'مقدمہ شعروشاعری' کا مطالعہ کیا تھا جس سے شاعری کرنے کا کچھ گُر حاصل ہو۔

موجودہ ناقدینِ ادب میں مجھے شمس الرحمٰن فاروقی پسند ہیں۔فاروقی صاحب کے یہاں سخن فہمی کافی اعلا درجے کی پائی جاتی ہے۔کلام میں اچھا شعر چن کر نکال لینا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں، یہ ہنر شمس الرحمٰن فاروقی میں موجود ہے اوراچھے شعر کی ایسی بہترین تعبیر وتشریح کرتے ہیں کہ شعر پوری طرح واضح ہوجاتا ہے۔ان کی کتاب 'شعرشورانگیز' جو چارجلدوں میں ہیں،اس کا بہترین نمونہ ہے۔میں نے بالاستعاب اس کتاب کا مطالعہ تونہیں کیا۔لیکن اس کے باوجود میں یہ کہنا چاہوں گا کہ فاروقی صاحب نے اردوشاعری کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے،حالاں کہ یہ بات لوگوں کو بری لگ سکتی ہے۔اس کے علاوہ گوپی چند نارنگ کی تحریریں بھی مجھے پسند آتی ہیں۔

پروفیسر لطف الرحمٰن (مرحوم) بھی موجودہ دور کے اچھے ناقد تھے۔ان سے میرے اچھے مراسم بھی رہے اوران کی کتابوں نے بھی کافی متاثر کیا۔وہ موجودہ عہد کے ایک بڑے ناقد مانے جاتے ہیں۔وہ اچھے شاعر بھی ہیں۔ان کی کتاب 'جدیدیت کی جمالیات' ایک طرح سے اردو ادب وتنقید کے لیے میل کا پتھر ہے۔اس کے علاوہ بھی ان کی بہت ساری کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ان سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔

تسلیم عارف: مدیر کی حیثیت سے آپ کن کی تحریروں کواپنا آئیڈیل مانتے ہیں؟

طارق متین: جب میں نے 'علم وادب' نکالنا شروع کیا تواسی زمانے میں 'سوغات' جسے محمود ایاز نکالا کرتے تھے۔میں اس رسالے کواردو کی ادبی صحافت میں میل کا پتھر مانتا ہوں۔اس رسالے نے مجھے بہ حیثیت مدیر کافی متاثر کیا۔اسی زمانے میں 'ذہنِ جدید' بھی نکلا۔یہ الگ بات ہے کہ 'سوغات' نے میں کبھی شایع نہیں ہوا۔محمود ایاز کو میں نے اپنی تخلیقات بھیجیں ضرور لیکن انھوں نے میری شاعری کواس لائق نہیں سمجھا کہ مجھے شائع کیا جائے۔'شب خون' میں بھی تحریریں بھیجی تھیں لیکن فاروقی سے لڑائی ہوگئی تھی اس لیے انھوں نے بھی شایع نہیں کیا۔

یہ دونوں اداریوں کے اعتبار سے قابلِ ذکر پرچے ہیں جنھوں نے مجھے متاثر کیا۔حالاں کہ زبیر رضوی کے پرچے سے زیادہ معیاری محمود ایاز کا پرچہ 'سوغات' تھا۔محمود ایاز کے اداریوں سے

مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ محمود ایاز کی طرز پر اداریے لکھوں حالاں کہ میری صلاحیت ایسی نہیں، لیکن پھر بھی ان کی طرح لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

تسلیم عارف: شمس الرحمٰن فاروقی سے لڑائی کا سبب کیا ہوا۔

طارق متین: فاروقی کی کتاب 'آسماں محراب' جب منظرِ عام پر آئی تو میں نے یہ دیکھا کہ فاروقی دوہری پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ خود تو جدیدیت کے امام بنتے ہیں اور کتاب کے پیچھے اپنی شاعری کے بارے میں علی سردار جعفری سے تحریر لکھوا کر شامل کیے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد شاعری بھی ان کی مجھے کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ میں نے اپنے دفتر میں یہ مجموعہ خورشید اکبر کو دکھایا تو انھوں نے کہا کہ یہ شاعری نہیں کچھ اور ہے۔ تو طے ہوا کہ وہ اس کتاب پر مضمون لکھیں گے۔ انھوں نے تقریباً ۲۸ر صفحات میں اس کتاب کا آپریشن کیا۔ مضمون کا عنوان تھا ''آسماں محراب' یا شاعری کی مٹی خراب' اس کے علاوہ صفدر امام قادری نے بھی کوئی مضمون لکھا اور جمال اویسی نے بھی زبردست تحریر لکھی۔ یہ تمام تحریریں اور کچھ اور تحریریں میں نے اپنے رسالے علم و ادب میں شایع کردیں۔ جس کی وجہ سے اس وقت کے ادبی حلقے میں ایک بوال مچ گیا۔ شہپر رسول نے مجھے بتایا کہ شمیم حنفی نے شمس الرحمٰن فاروقی کو یہ کہتے ہوئے دیا کہ ''یہ لیجیے اپنا نامۂ اعمال'' اب شمس الرحمٰن فاروقی اس سے بالکل چڑھ گئے۔ انھوں نے ہمیں خط بھی لکھا یہ گویا یہ تو مجھ پر پورا گوشہ ہی آپ نے شایع کردیا ہے۔ لیکن اس کے بعد سے انھوں نے ہم لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

تسلیم عارف: ہم عصر ناقدین میں کون کون سے ناقدین آپ کو اچھے لگتے ہیں؟

طارق متین: ہم عصر ناقدین میں مجھے سب سے زیادہ متاثر صفدر امام قادری نے کیا ہے، ہم عصروں میں مجھے زیادہ کوئی پسند آتا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ابوالکلام قاسمی کی تحریریں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ خالد علوی، جو دہلی یونی ورسٹی کے پروفیسر ہیں، ان کے بھی کئی تنقیدی مضامین کافی اچھے ہیں۔

تسلیم عارف: ہم عصر پرچوں میں جو آپ کو پسند ہیں، ان کے بارے میں بتائیے۔

طارق متین: ہم عصر پرچوں میں 'ذہنِ جدید' کافی اہم ہے۔ زبیر صاحب کافی پڑھے لکھے اور اچھے شاعر ہیں۔ رسالہ اچھی طرح ایڈٹ کرنے کا انھیں اچھا خاصہ تجربہ ہے۔ ان کے یہاں افسانوی ادب کی بڑی پرکھ ہے۔ ان کے پرچوں میں کافی اچھے اور معیاری افسانے شایع ہوتے ہیں۔ شاعری کے معاملے میں بھی لوگوں کی بہترین چیزیں سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ وہ غزلوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اپنے پرچوں میں غزلیں کم شایع کرتے

ہیں لیکن جو غزلیں شایع کرتے ہیں وہ معیاری ہوتی ہیں۔ البتہ وہ خود نظم کے شاعر ہیں اس لیے نظموں کی اشاعت ان کے پرچے میں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ پرچہ ایک تہذیب کو پیش کرتا ہے اور ہر طرح کی چیزیں ادب سے متعلق یا فلموں سے متعلق اس پرچے میں مل جاتی ہیں، اس لیے یہ پرچہ الگ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ سب سے خاص بات یہ کہ رسالے کے ہر حرف اور ہر لفظ میں زبیر رضوی کے علم کی وسعت اور ان کا تجربہ شامل رہتا ہے۔

سہ ماہی 'آمد' بھی خورشید اکبر کی ادارت میں نکلنے والا ایک اچھا پرچہ ہے۔ یہ رسالہ معیاری تو ہے ہی اپنی ضخامت کی بنیاد پر بھی یادگار ہے۔ حالاں کہ کسی پرچے کی ضخامت اس کے معیار کی ضمانت نہیں لیکن پھر بھی اردو کی خدمت کے اعتبار سے بھی یہ بات اہمیت رکھتی ہے۔ کوئی شخص اگر ۴۰۰ر یا پانچ سو صفحات کا رسالہ نکال رہا ہے اور اس میں اپنے پیسے یہ سوچے بغیر لگا رہا ہے کہ یہ پیسے اس کو واپس ملیں گے یا نہیں، یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے۔ محمود ایاز صاحب کا رسالہ بھی تقریباً ۸۰۰ر صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ خورشید اکبر میں علمی تنوع بہت پایا جاتا ہے، اور وہ بھی ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور دیگر زبانوں کے ادب سے بھی وہ واقفیت رکھتے ہیں۔ تو اس کی وجہ سے ان کے رسالے میں اداریے بھی اچھے ہوتے ہیں اور مضامین بھی اس میں معیاری ہوتے ہیں۔ اس رسالے میں ایک بڑی خاص بات یہ ہے کہ صفدر امام قادری کے بے لاگ تبصرے اس میں شایع ہوتے ہیں۔ حالاں کہ مختلف لوگوں کی یہ رائے ہے کہ صفدر Negetive writing کے ماہر ہیں۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ وہ منفی لکھنے کے ماہر نہیں بلکہ معروضی نگاہ رکھتے ہیں۔ انھیں ادبی اعتبار سے صاف گوئی پسند ہے اور انھیں جو چیز دلائل و شواہد کی روشنی میں جو چیز جیسی لگتی ہے اسے ویسا ہی کہتے ہیں۔ ان کا علم ہی اتنا زیادہ ہے کہ ان کو ہر جگہ بے علمی دکھائی دیتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ عہد کے لکھنے والوں کے پاس علم کا فقدان ہوتا ہے اور وہ لکھتے زیادہ ہیں۔ اسی وجہ سے جب صفدر امام قادری ان لکھنے والوں کی کی گرفت کرتے ہیں تو لوگ انھیں نیگیٹیو رائیٹنگ لکھنے والا کہنے لگتے ہیں۔

تسلیم عارف: آپ کے خیال میں ادبی سیاست سے اردو ادب کو فائدہ ہے یا نقصان؟

طارق متین: میری رائے میں اس میں دونوں چیزیں ہیں، فائدہ بھی اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ کہ جب مقابلہ ہوتا ہے تو لوگ زیادہ محنت سے کچھ اچھے کام کر جاتے ہیں۔ لیکن نقصان یہ ہے کہ یہ چیزیں زیادہ ہو جاتی ہیں تو یہ ادبی کام میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہے۔ آپ عظیم آباد کی ہی مثال لے

لیجیے، اگر اچھے لوگ کوئی ادبی کام کرتے ہیں تو لوگ اس کی پذیرائی نہ کر کے ٹانگ کھینچنے میں لگ جاتے ہیں۔

تسلیم عارف: پٹنہ میں قیام کے دوران رسالہ نکالنے کے علاوہ آپ نے اور کون کون سے کام کیے؟

طارق متین: ادب لکھا پڑھا۔ شاعری کی۔ اس زمانے میں صدیق مجیبی صاحب بہار اردو اکادمی کے وائس چیرمین ہوا کرتے تھے اور ہمارے دفتر میں وہ بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ میں ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ میرے پاس آئے۔ اس زمانے میں عبدالباری صدیقی محکمۂ تعلقاتِ عامہ (Ministry of Public Relation) کے منسٹر تھے۔ آر۔ جے۔ ڈی کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ مجیبی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ محکمۂ تعلقاتِ عامہ کی جانب سے بہار اردو اکادمی کے بینر تلے ایک مشاعرہ کرانا ہے۔ میری تم سے گزارش ہے کہ تم اس میں میرا ساتھ دو اور میری مدد کر دو۔ میں نے کہا کہ آپ کی مدد ضرور کر دوں گا لیکن آپ کو میری سفارش پر ایک شاعر کو ضرور بلانا ہوگا۔ انھوں نے پوچھا کون؟ میں نے کہا: عرفان صدیقی کو لکھنؤ سے بلانا ہوگا، ہر چند کہ وہ مشاعروں میں شرکت سے گریز کرتے ہیں لیکن پھر بھی انھیں آپ بلائیں۔ تو اس پر انھوں نے برجستہ یہ جملہ کہا جو بہت مزے دار ہے۔ انھوں نے کہا: ''ارے باپ، وہ تو میرا باپ ہے۔'' میں مشاعرہ کرانے میں ان کی مدد کے لیے تیار ہو گیا۔ ان کے ہم راہ میں جناب عبدالباری صدیقی کے گھر گیا۔ وہاں سے عرفان صدیقی کو سرکاری ٹیلی فون لگایا گیا۔ عرفان صاحب نے انکار کیا۔ پھر میں نے فون پر عرفان صاحب سے گزارش کی اور میرے کہنے پر انھوں نے شرکت کی حامی بھری۔ وہ مشاعرہ شاید ۱۹۹۸ء یا ۱۹۹۹ء میں شری کرشن میموریل ہال پٹنہ میں منعقد ہوا تھا اور بہت کامیاب مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں عرفان صدیقی کے علاوہ ملک زادہ منظور احمد، رئیس انصاری شامل تھے۔ بہار سے سلطان اختر بھی شامل تھے۔ میزبانی کی وجہ سے انھوں نے شاعر کے طور پر شرکت نہیں کی۔ کلیم عاجز بھی مشاعرے میں تھے۔ یعنی اسٹیج بڑے شعرا کی بھرمار تھی۔ صدیق مجیبی کے ساتھ میں اسپیشل گیلری میں بیٹھا ہوا تھا۔

اس زمانے میں بشیر بدر کی مشاعروں میں دھوم رہا کرتی تھی۔ اس مشاعرے میں ان کو صدارت دے دی گئی۔ یہ بات ہمیں اور کئی لوگوں کو پسند نہیں آئی۔ اور نظامت بھی وہی فرما رہے تھے۔ نظامت کے دوران ایسی خاص بات ہوئی جس سے عرفان صدیقی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب مشاعرہ روانی سے چل رہا تھا اور بشیر بدر یکے بعد دیگرے شعرا کو بلا رہے تھے اور عرفان صدیقی کو انھوں نے روک کر رکھا ہوا تھا۔ خود صدر تھے تو خود سے پہلے یا ایک شاعر بچا ہوا

تھا اس سے قبل انھوں نے عرفان صدیقی کو دعوتِ سخن دی۔ بشیر بدر کو یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح عرفان صدیقی کا تعارف کرائیں۔ تو انھوں نے کہا: ''حضرات! اب میں ایک ایسے شاعر کو آواز دے رہا ہوں جن کی تعریف میں مَیں یہ ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہندستان کے علاوہ پاکستان میں مشہور ہیں اور پاکستان میں بلا کر باقاعدہ عرفان صدیقی کا کراچی اور لاہور میں ان کا جشن منایا جاتا ہے۔ اس مشاعرے میں عرفان صدیقی نے اپنی ایک معروف غزل سنائی تھی جو مشاعروں میں بہت ہٹ ہوئی تھی۔ اس کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے:

رات سے جیت تو نہیں سکتا لیکن یہ چراغ کم سے کم رات کا نقصان بہت کرتا ہے

اس شعر پر عرفان صدیقی کو بہت داد ملی۔ اس مشاعرے کے بعد عرفان صدیقی سے میرے تعلقات مزید بہتر ہو گئے۔ میں نے علم و ادب کے لیے فرمائش کر کے ان سے غزلیں حاصل کیں اور انھیں شایع کیا۔ وہ مجھ سے خط و کتابت بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے اپنے شعری مجموعے 'مشکِ سخن' شایع کیا تو اس کے سرنامے میں ان کا خط رکھا۔ ان کا یہ خط بہت ہم افزا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لطف الرحمٰن، صدیق مجیبی اور عرفان صدیقی جیسے لوگ مجھے کافی عزیز رکھتے تھے۔ اس کی وجہ تو مجھے نہیں معلوم کہ میری شاعری تھی یا میرا اخلاق لیکن یہ لوگ مجھے عزیز رکھنے لگے تھے اور میں خود کو اس معاملے میں خوش قسمت گردانتا ہوں کہ مجھے اردو کی ایسی ادبی شخصیات عزیز رکھتی تھیں۔

تسلیم عارف: صدیق مجیبی صاحب سے متعلق کوئی واقعہ جو آپ کو یاد ہو؟

طارق متین: جی۔ صدیق مجیبی کے تعلق سے میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناؤں کہ عرفان صدیقی کی غزل کی ایک معروف زمین تھی، اس کا شعر تھا:

ندی سے پھول نہ گنجِ گہر نکلتا ہے جو طشتِ موج اُٹھاتا ہوں، سر نکلتا ہے

اسی زمین کو میں نے بھی استعمال کیا ہے اور میری ایک بہت ہی مشہور غزل جو مشکِ سخن میں شامل ہے، اس کا مطلع بہت مشہور ہوا تھا:

جب آسمانِ ساعت میں در نکلتا ہے مرے سخن کے پرندے کو پَر نکلتا ہے

یہ پوری غزل مرصع ہے۔ یہ غزل میں نے 'آج کل' میں بھیجی اور یہ اس میں شایع بھی ہوئی۔ یہ غالباً ۱۹۹۷ء کے کسی مہینے کے شمارے میں یہ غزل شایع ہوئی تھی۔ اب صدیقی مجیبی کی اپنے عزیزوں سے محبت کا حال دیکھیے کہ وہ اسے پڑھ کر 'آج کل' کا وہ شمارہ لے کر میرے دفتر آ گئے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور یہ کہا کہ 'یار! اب تم بھی استاد ہو گئے ہو۔ میں نے بھی اسی زمین میں

ایک غزل کہی ہے۔' ان کی غزل کا ایک شعر یہ ہے:

یہ کیسا شہر ہے، کیسی ہے سرزمیں اس کی جہاں کی خاک پلٹتا ہوں سر نکلتا ہے

انھوں نے یہ شعر سنایا اور کہا کہ مجھے بھی تمھارے سارے شعر پسند آئے اور مجھے بہت شاباشی دی اور کافی ہمت افزائی کی۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو شاعری میں میرے لیے معاون ثابت ہوئیں اور میں اپنا شعری سفر جاری رکھنے میں آج تک کامیاب ہوں۔ باتیں تو صدیق مجیبی کی بہت ہیں لیکن میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ بس یہ بات ضرور جان لیجیے کہ وہ ان شعرا میں ہیں جنھیں میں حد درجہ پسند کرتا ہوں۔ اس صف میں عرفان صدیقی، سلطان اختر وغیرہ آتے ہیں۔ لیکن ان جید شعرا سے حد درجہ متاثر ہونے کے باوجود آپ میرے مجموعے کو دیکھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں نے اپنی شاعری کا ایک الگ لہجہ تیار کر لیا ہے، یہ ایک شاعر کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے کسی کی تقلید نہیں کی اور نہ تقلید کرنے کی کوشش کی۔ میں اپنے ڈھنگ اور اپنے لہجے میں شعر کہنے کی کوشش کرتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میری خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوتی ہے۔

تسلیم عارف: موجودہ ادبی صورتِ حال خاص کر شاعری کے حوالے سے آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

طارق متین: موجودہ ادبی صورتِ حال سے حقیقت بیان کروں تو میں بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ ادب آج کے دور میں زوال آمادہ ہے۔ خاص کر شاعری کا حال تو اور بھی برا ہے۔ آج کوئی بھی دوسرا تیسرا انسان شاعر اور ادیب بنا پھرتا ہے۔ لیکن اسے کے لیے جو علم و ریاضت، اور بزرگوں کی جوتی سیدھی کرنا ضروری ہے، اس کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ مشاعروں کی تہذیبی اہمیت اپنی جگہ لیکن اسے بھی لوگوں نے بے حد غلاظت سے بھر دیا ہے۔ ہمارے جیسے جینوئن فن کار اور شاعر اب بڑے مشاعروں میں جگہ نہیں بنا سکتے، وہاں متشاعروں کی ایک پروفیشنل جماعت قابض ہے۔ پہلے مشاعروں میں متشاعر منھ چھپایا کرتا تھا۔ آج کل جنیوئن شعرا کو ان مشاعروں سے اپنی عزت و ناموس بچا کر نکلنا پڑتا ہے۔ لہٰذا صورتِ حال کافی خراب ہے اور ادب کے ناقدین، دانش وروں اور مصنفین کو جدید تقاضوں کے تحت خود کو ڈھال کر ادب کی تخلیق کرنا ضروری ہے ورنہ آگے انجام بہت برا ہونے والا ہے۔

◀ ● ▶

Assistant Professor, Department of Urdu,
SSV College, Kahalgaon, Bhagalpur, Bihar-813203
E.Mail: tasleem171@gmail.com,
Mobile & WhatsApp No: 7004846692

● پروفیسر صفدر امام قادری

بجھتے بجھتے بجھ گیا طارق چراغِ آرزو

دوست طارق متین کی یاد میں

ایسا دوست جو جیتے جی محفل سے کنارہ کش ہو کر دوستوں اور دنیا سے بے زارِمحض ہو کر اپنے گھر میں قید ہو گیا ہو،اس کے لیے ایسی خبر کا دھڑ کا لگا ہوا تو تھا ہی مگر خواہش یہی تھی کہ طارق متین اپنی مردم گزیدگی چھوڑ کر پھر سے معمول کی یار باش زندگی میں شامل ہو جائے گا مگر قدرت کو کچھ دوسرا ہی منظور تھا۔ ۱۶ جنوری ۲۰۲۵ء کی شام اچانک یخ بستگی کا سامان فراہم کر گئی جب ایک ملاقاتی اور دوست نے فون پر بتایا کہ آپ کے دوست طارق متین نہیں رہے۔ایک لمحے کے لیے یہ سوچا کہ ہمارا دوست ساری دنیا اور ادبی برادری سے نکل کر بہت پہلے ہی اندھیروں میں جا کر آرام کر رہا تھا۔ پھر بھی دل میں یہ خیال آیا کہ ایسا جی دار دوست بھلا کیسے مرسکتا ہے؟ مونگیر اقبال حسن آزاد صاحب کو فون کیا کہ کسی طرح اس خبر کے غلط ہونے کی اُن سے تصدیق ہو جائے مگر ٹھٹھرتی ہوئی شام اور گھنی ہو گئی جب اقبال حسن آزاد نے کہا کہ میں طارق متین کی رہائش پر اُن کی میّت کے سامنے کھڑا ہوں۔اب بھلا کیا بچ گیا تھا۔انھوں نے مزید اطلاع دی کہ اگلے روز نمازِ جمعہ کے بعد اُن کے آبائی وطن لکھمنیا میں تجہیز و تدفین عمل میں آئے گی۔تھوڑے وقت کے بعد پھر میں نے فون کیا تو انھوں نے بتایا کہ مونگیر سے اُن کا جسدِ خاکی لکھمنیا کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔

میں نے دوست کے آخری دیدار کے لیے صبح سویرے لکھمنیا جانے کا فیصلہ کیا۔رات بھر ۳۰۔ ۳۵ برس کی رفاقتوں کے شب و روز چین نہ لینے دیتے رہے۔ہزاروں واقعات، طارق متین کی ادائیں، ہم لوگوں کی آپسی نوک جھونک اور ایک ساتھ زندگی کے خواب اور تمناؤں کی تعبیر تلاش کرنے کی مہمات میں اُلجھتا رہا۔آنکھیں بند ہیں مگر ۸۹۔۱۹۸۸ سے لے کر اب تک کے زندگی بداماں واقعات لہراتے رہے۔طارق متین کی دوست داریاں، بے تکلفّیاں، ہمہ وقت اور ہمہ تن شعر و ادب میں منہمک رہنے اور جینے کا حوصلہ، نئے لکھنے والوں کی پشت پناہی اور روز روز ادبی محفل آرائی سے خوش ہونے والے شخص کی تصویر آنکھوں سے محو نہیں ہو سکتی تھی۔

۷ارجنوری کی صبح سرد تھی۔ آسمان سے زمین تک کہاسا اس طرح سے چھایا ہوا تھا جیسے زمین و آسمان طارق متین کے لیے ماتم کناں ہوں۔ فضا میں بھاری پن پیدا ہو رہا تھا۔ ہائی وے پر چلتے ہوئے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ماتم ہرسُو ہے۔ سورج اپنے حجرے میں چھپا ہوا گویا مراقبے میں بیٹھا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو کیلومیٹر چل کر طارق متین کے گھر پہنچا۔ میّت کو غسل دینے کا عمل آنگن میں چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کے والد بزرگوار سے اجازت لے کر اپنے دوست کو آخری بار دیکھ لینے کے لیے گھر کے آنگن میں پہنچا تو طارق متین اسی طرح سفید لباس میں مجسم تھا جیسے وہ ہم سب کے بیچ ہمیشہ ہوتا تھا۔ اُس کے کپڑے پہ کوئی شکن نہیں ہوتی تھی۔ مگر یہ بے شکن لباس طارق متین کے لیے آخری لباس تھا۔ میں نے ایک پہلو سے ہی چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی کیوں کہ اس سے زیادہ کچھ اور حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ آخری یادگار کے طور پر ایک موہوم سی تصویر بھی کھینچ لی کہ اپنے یار کو اپنے البم میں محفوظ کر سکوں۔ چند ساعتوں کے بعد وہاں سے اُٹھ کر اُن کے والد صاحب کے پاس آ کر پھر بیٹھ گیا۔

ابھی چھے ماہ پہلے اُن کی والدہ کا انتقال ہوا۔ بہت سارے لوگوں نے بالخصوص اُن کے گاؤں والے اور رشتے داروں نے اُس موقعے سے طارق متین کو ایک عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ سب کو ایک اضمحلال کی کیفیت محسوس ہوئی۔ چوڑے کندھے والا اور مضبوط قدموں سے تیز تیز چلنے والا شخص نڈھال اور ہڈی کا ڈھانچا ہو گیا تھا۔ ان کے والد نے اپنے اوپر پڑے تمام مصائب کو بھلاتے ہوئے بڑی نپی تلی ہوئی بات مجھ سے کہی کہ جب سے اِنھوں نے شاعری ترک کر دی تھی، اُس کے بعد سے سب کچھ بگڑتا ہی چلا گیا۔ مجھے یاد آیا کہ لکھمنیا کے کتنے مشاعروں میں ہم نے اُن کے والد کو ادبی حظ اُٹھاتے ہوئے دیکھا تھا اور اسٹیج سے اپنے بیٹے اور ان کے دوستوں کی شعر و شاعری پر وہ خوش ہو رہے تھے۔ میں نے بھی اُن سے کہا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اُس موقعے سے اُس سے زیادہ کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اُن کے والد کی عمر اور صحت کو دیکھتے ہوئے صبر کی تلقین کے علاوہ ہمارے پاس تھا ہی کیا۔

طارق متین کے جنازے میں شامل ہونے کے لیے اُن کے قرابت دار اور متعلقین آتے جا رہے تھے۔ مونگیر، پٹنہ، مظفر پور اور آس پاس کے لوگ جمع ہوتے جا رہے تھے۔ جمعہ کے وقت پوری مسجد نیچے سے اوپر تک اور آس پاس کی سڑکوں تک نمازیوں سے بھری رہی۔ مسجد کے باہری حصّے کے ایک میدان میں ندی کے کنارے نمازِ جنازہ کا انعقاد ہوا۔ آس پاس کی سڑکوں میں بھی لوگ صف بناتے گئے۔ واقعتاً ہزاروں کی بھیڑ تھی۔ جگہ دیکھنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ یہ وہی خالی جگہ ہے جہاں طارق متین نے ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں عزم شاکری بھی شریک ہوئے تھے۔ ابتدا میں کسی دوسرے نے نظامت کی تھی

اور مشاعرہ کچھ اکھڑا اکھڑا معلوم ہو رہا تھا مگر مشاعرے کو سنبھالنے کے لیے طارق متین اسٹیج پر آیا اور اپنی برجستہ نظامت سے مشاعرے کا اس نے پورا ماحول بدل دیا۔ فجر تک ہم سب مبتلائے شعر رہے۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ میری کار میں طارق متین نے اپنے باغ کے کئی بورے آم بھی تحفے میں رکھوا دیے۔ عظیم آباد کے کئی شعرا اور ادبا کو بھی بعد میں طارق متین کی ہدایت کے مطابق یہ آم تحفتاً پیش کیے گئے۔

لکھمنیا کا قبرستان اچھا خاصا بڑا ہے۔ سڑک کے ایک طرف طارق متین کا گھر اور اُن کے رشتے داروں کے مکانات ہیں اور دس قدم پر دوسری جانب قبرستان ہے۔ قبرستان کا دروازہ زیادہ چوڑا نہیں ہے اور قبرستان میں داخلے کے لیے پگڈنڈیاں اس سے بھی نحیف و لاغر ہیں۔ انتظامیہ نے قبرستان میں آنے والوں کو قبرستان کی حقیقی زندگی کا اشارہ دینے کے لیے ایسے انتظامات غالباً کر رکھے ہوں گے۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی جنازے میں شامل افراد کئی ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ میں نے نمازِ جنازہ کے فوراً بعد ہی تابوت کو آخری کاندھا لگا کر اپنے دوست کو ایک نئی زندگی کے لیے الوداع کہہ دیا تھا۔ قبر میں بڑے اطمینان سے طارق متین کو اتارا گیا۔ عام جگہوں کی قبر کے مقابلے یہاں کچھ زیادہ کشادگی معلوم ہوئی۔ خدا کرے یہ کشادگی تا قیامت طارق متین کو میسّر رہے۔ تین مُٹھّی مٹّی ڈالتے ہوئے میں تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا تھا کہ اپنے ہی جسم و جان کے ٹکڑے کو دفن کر رہا ہوں۔

قدرت کا بھی کیا انتظام ہے کہ ہزاروں کے ساتھ ہم جس اجتماعی انداز میں طارق متین کو قبرستان میں پہنچانے گئے تھے، وہاں سے واپسی میں سب تنہا اور اکیلے تھے۔ سب کے سر جھکے ہوئے اور دل ملول تھے۔ قبر کے اندر جیسے طارق متین تنہا تھا۔ ہم سب اُسی طرح تنہائی میں ماتم خانہ بنے ہوئے تھے۔ قبرستان سے نکلتے ہوئے جب آسمان کی طرف میری نگاہیں اُٹھیں تو دیکھا کہ موسم کا بھاری پن کم ہو رہا ہے، سورج کی شعاعیں معصومانہ انداز میں پھیل رہی ہیں۔ شاید آسمان سے طارق متین کی قبر پہ انوارِ الٰہی برسنے کی یہ گھڑی تھی، اس لیے موسم کی کیفیت بدل گئی اور فضا میں روشنی پھیل گئی۔

طارق متین عمر میں مجھ سے محض تین برس چھوٹا تھا۔ عمر کا یہ فرق رشتے میں آخر وقت تک قائم رہا حالاں کہ طارق متین کی اس معاملے میں خاص شہرت تھی کہ اپنے سے دس پندرہ برس بڑے اور اسی قدر چھوٹے لوگوں بالخصوص ادیبوں اور شاعروں سے اس کا دوستانہ رشتہ قائم ہو جاتا تھا جہاں فوراً 'آپ' کی جگہ 'تم' کی مخاطبت عود کر چلی آتی تھی۔ جسے سگریٹ، پان اور گٹکے سے شوق ہے، وہ طارق متین کا ہم رکاب ہو ہی جائے گا۔ اولاً اسی سے تکلف کی دیوار ٹوٹتی تھی مگر مجھ سے مخاطبت میں اوّل روز سے 'صفدر بھائی' کا جو سلسلہ قائم ہوا، وہ بچارہ گیا جب کہ میں دیکھتا رہتا تھا کہ مجھ سے بڑی عمر کے احباب کو طارق متین تم کہتا تھا۔

جانے کس مرحلے میں یہ رشتہ متعین ہوا۔ وہ ہمارے بچوں کا انکل ہوااور میرے عزیز شاگردوں کا ہمدرد وغم گسار، رہنما اور ہم رکاب۔

یہ ٹھیک ٹھیک اب یاد نہیں کہ طارق متین سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی؟ رسائل و جرائد میں اِدھر اُدھر اس کی غزلوں کی اشاعت ہونے لگی تھی۔ ہم سب اسی ادبی ریلے میں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ غالبًا ۱۹۸۸ء یا ۱۹۸۹ء کا کوئی لمحہ ہوگا جب خورشید اکبر اور شان الرحمان کے ساتھ ایک پختہ رنگ کے بانکے نوجوان کی ہمارے گھر آمد ہوئی۔ ابھی تو عمر کی دو دہائیاں مکمل ہو رہی تھیں۔ بیگوسرائے کے ایک کالج میں ایم۔اے کی جماعت میں وہ انگریزی زبان وادب کے درس میں شامل تھا۔ اس کے عظیم آباد آنے کے بعض ادبی مقاصد تھے۔ ریڈیو کے پروگرام میں شمولیت، ادبا وشعرا سے ملاقات اور رمز عظیم آبادی کے حلقۂ اِدارت میں پہنچنے کے امکانات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ مجھ سے رسالہ نکالنے کے سلسلے سے گفت وشنید ہوئی اور خاص طور سے رسالے کی اشاعت اور ادارت میں معاونت کے عہد و پیمان ہوئے۔ ہم دونوں کے درمیان شاعری، سگریٹ، پان اور دیگر انداز کے تمباکو کے معاملات دیوار کی طرح کھڑے رہے جب کہ خورشید اکبر اور شان الرحمان شاعری اور سگریٹ کے راستے سے بے تکلف دوست بن چکے تھے۔ چوبیس گھنٹے کی شاعرانہ وضع قطع میں جینے کی عادتیں اُس وقت بھی ہماری نہیں تھیں، اس لیے تعلق میں ایک رکھ رکھاو، کم آمیزی اور ادبی صورتِ حال کے تئیں گفت وشنید کی حدیں قائم رہیں۔ کئی گھنٹوں اور پورے دن کے ساتھ میں بھی یہ رکاوٹیں اور حدود ہم دونوں نے بچا کر رکھیں۔

طارق متین عظیم آباد میں آندھی اور طوفان کی طرح آتا اور پھر بہت دنوں تک اس کا کچھ اتا پتا نہیں رہتا۔ عظیم آباد میں اُس کی آمد چند گھنٹے اور چند دن کی نہیں ہوتی۔ ہفتہ عشرہ تو یقیناً وہ شہر کی ادبی گلیوں اور اڈّوں میں گھومتا پھرتا۔ جس ادیب کے گھر آپ جائیے تو معلوم ہوگا کہ آج طارق متین نام کا ایک نیا شاعر وہاں حاضر ہوا تھا۔ پھلواری شریف میں سلطان اختر سے لے کر پٹنہ سٹی میں رمز عظیم آبادی کے گھر تک، سبزی باغ کے ہوٹل، کتاب کی دکانیں اور ادیبوں شاعروں کے اڈّوں پر پہنچنے والا وہ پہلا آدمی ہوتا۔ ہم عصر شاعری کا ایسا چسکا کہ سیکڑوں نئے اور انوکھے شعرا کے اشعار اُس کی زبان پر ہوتے۔ کلاسیکی شعرا کا انداز بھی اُسے مرغوب تھا اور عرفان صدیقی بھی اُسے بے حد عزیز تھے۔ دیکھتے دیکھتے طارق متین عظیم آباد کی ادبی برادری میں اپنی موجودگی درج کرانے میں کامیاب ہو گیا اور ایک طرح سے اس کا لازمی حصہ ہو گیا۔ اب ہمیں بھی یہ انتظار رہنے لگا کہ کب طارق متین لکھمنیا سے وارِدِ عظیم آباد ہوگا اور سرگرمی کے ساتھ ڈھیر سارے ادیبوں اور شاعروں سے اُس کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اِسی دوران ایک روز اُس کی آمد ہوئی اور ایک نئے رسالے پر بات چیت شروع ہوگئی۔ اُس نئے رسالے کا نام ’علم و ادب‘ طے ہوا۔ اب یاد نہیں کہ یہ نام طارق متین کا خود تجویز کردہ تھا یا تبادلۂ خیالات میں یہ نام اُبھر کر سامنے آیا۔ اُس کے پاس اپنے گاؤں سے تعلق رکھنے والے دو چار شعرا کے کلام کے علاوہ غالبًا کوئی اور تخلیق نہیں تھی۔ رسالے میں اُن کی مالی معاونت چودھری حسان الزماں کر رہے تھے۔ اِس لیے یہ طے ہوا کہ وہ چیف ایڈیٹر ہوں گے اور طارق متین ایڈیٹر رہیں گے۔ نئے مواد کی تلاش و جستجو شروع ہو چکی تھی۔ میں نے عظیم آباد کے مختلف شعرا و ادبا سے انھیں رابطہ قائم کرنے کو کہا۔ احمد یوسف نے اپنا ناولٹ دے دیا۔ رمز عظیم آبادی اور خورشید اکبر کی غزلیں آ گئیں۔ اتفاق سے مظہر امام صاحب وارِدِ عظیم آباد ہوئے تھے۔ ایک سوال نامہ تیار کر کے میں خود طارق متین کو لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے ایک انٹرویو کی درخواست کی گئی۔ یہ یاد رہے کہ طارق متین اب بھی ایم۔اے کی منزلوں سے سرفراز نہیں ہوئے تھے اور دس بیس غزلوں سے آگے کا اُن کا کوئی سلسلہ نہیں بڑھا تھا۔ نثر لکھنے کی مشق بھی نہیں تھی۔ میں نے مظہر امام صاحب سے یہ گزارش کی کہ لڑکا نیا اور ناتجربہ کار ہے، اِس لیے وہ اپنے جوابات لکھا دیں۔ مظہر امام صاحب نے ہو بہو یہی کیا۔ اُس زمانے میں صلاح الدین پرویز کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا اور ہر طرف ایک شور برپا تھا۔ میں نے ناول ’آئڈنٹٹی کارڈ‘ پر محمود ہاشمی کے طویل مقدمے کو موضوع بناتے ہوئے ایک نرم گرم مضمون لکھا تھا۔ طارق متین نے کہا کہ اِسے مہمان اداریے کے طور پر شامل کر لیا جائے۔ رسالے کی کتابت کی ذمہ داری ہمارے شاگرد فیاض احمد کے سپرد ہوئی اور ایک مہینے میں رسالہ چھپ کر سامنے آ گیا۔ طارق متین نے اُس رسالے کو ملک بھر کے ادیبوں اور شاعروں تک پہنچانے کا انتظام کیا اور دیکھتے دیکھتے نئے رسائل کی بھیڑ میں ’علم و ادب‘ اپنے پہلے شمارے سے ہی ایک آشنا اور معقول ادبی صحیفہ بن گیا۔ ملک بھر سے طارق متین کو مبارک باد اور تعریف و توصیف کے خطوط آنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ نئی نئی تخلیقات بھی پہنچنے لگیں۔ ۱۹۹۱ء کا سال تھا۔ طارق متین اگرچہ ایک نوآموز شاعر تھا مگر ساتھ ساتھ وہ ایک اُبھرتا ہوا مدیر بھی بن گیا۔

اب طارق متین رسالہ نکالنے کے فن سے واقف ہو چکا تھا اور خاندانی کاروبار کے سلسلے سے کلکتہ آنے جانے کا سلسلہ بھی پیدا ہو گیا۔ پٹنہ سے بہتر چھپائی کے وسائل وہاں بہ آسانی مل گئے۔ اب زیادہ رنگ و روغن کے ساتھ ’علم و ادب‘ کے شمارے آنے لگے۔ رسالہ مرتّب کرنے کا جو یہ چسکا لگا، طارق متین اِس سے کبھی آزاد نہ ہو سکا۔ کئی برسوں تک ’علم و ادب‘ کی بزم خاموش پڑی رہی، پھر سے ایک نیا شمارہ شائع ہو گیا اور طارق متین حلقۂ احباب میں یہ وعدہ کیے چل پھر رہا ہے کہ اب باقاعدگی سے

یہ رسالہ نکلے گا مگرایسا ہوانہیں۔ وقفہ بڑھتا جاتا۔ اِس دوران شادی کے بعد لکھمنیا سے وہ مونگیر آ کر بس گئے ۔گھر گرہستی کے ساتھ ادب کا بھی سلسلہ چلتا ہی رہا۔شاعری سے الگ رسائل نکالنے کے شوق کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ طارق متین نے اِس دوران تنِ تنہا یا کسی کے ساتھ مل کر جو چند رسالے شائع کیے، اُن کے نام کچھ اِس طرح سے ہیں: آغاز،گُلبن ،گل وصنوبر،سخن وراں۔ یہ تمام رسائل زیادہ غوروفکراوراندرونی تیاری کے بغیر نکلے، اِس لیے باقاعدگی ممکن نہیں تھی۔ 'سخن وراں' تو ایک ہی شمارہ نکل سکا۔' آغاز' کے انجام تک پہنچنے میں دوشمارے شائع ہو سکے۔دو چار شمارے سے زیادہ الگ الگ ناموں کے اِن رسائل کی زندگی نہیں رہی۔کبھی کبھی میں کہتا کہ یہ الگ الگ نام غیر ضروری ہیں 'علم وادب' کے نام سے ہی پھر سے رسالہ نکلتا رہے۔مگر طارق متین کوکوئی دوست نئے نئے رسائل شائع کرنے کے اِس شوق سے دست بردار نہ کر سکا۔گذشتہ دس برسوں میں طارق متین بھی نئے رسالہ شائع کرنے اوراُس کی دوسوچار سوکا پیاں ملک بھر میں تقسیم کرادینے کے عمل سے غالبًا تھک گیا تھا۔ اِس لیے اِس دوران اب کوئی نیارسالہ سامنے نہیں آیا۔اِس طرح 'سخن وراں' اُن کی ادبی صحافت کا آخری نمونہ اور یادگار ہے جس کا اجرا پروفیسر لطف الرحمان کے ہاتھوں عظیم آباد میں ہوا تھا۔

طارق متین نے کم عمری میں شاعری شروع کردی تھی اوراپنی سیماب صفتی کے سبب بہ عجلت کلام کو جِلد بند کرنے میں بھی مستعد رہا۔۲۹ برس کی عمر میں 'مُشکِ سخن' عنوان سے اُس کا پہلا مجموعہ ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا جس میں محض پچاس غزلیں شامل تھیں۔۲۰۰۸ء میں ۸۵ غزلوں پر مشتمل مجموعہ 'قندیلِ ہنر' شائع ہوا۔۲۰۱۶ء میں اُس وقت تک کی باقی ماندہ ستّر غزلوں کے ساتھ 'غزالِ درد' مجموعہ شائع ہوا۔ میں نے طارق متین سے کہا کہ ابتدائی دونوں مجموعے موجود نہیں، اِس لیے ایک کلیات قسم کی چیز تیار کر لی جائے۔ 'ریاضتِ نیم شب' ۲۰۱۶ء میں میری نگرانی میں مکتبۂ صدف کی طرف سے شائع ہوا جس میں ۲۰۵ غزلوں کے علاوہ ایک حمد اور ایک نعت بھی شامل ہے۔۲۰۱۸ء میں 'اُس چہرے کے نام' عنوان سے دیوناگری رسمِ خط میں طارق متین کی ۱۲۵ غزلیں مکتبۂ صدف کی جانب سے شائع ہوئیں۔اس کی ترتیب کا کام میں نے اپنی شاگرد ڈاکٹر افشاں بانو کے ساتھ مل کر کیا تھا۔۲۰۱۶ء کے بعد طارق متین نے جوغزلیں کہیں، بالخصوص اردوفورم،مونگیر کی طرحی نشستوں میں شمولیت کے لیے جو کلام لکھا اور پڑھا، وہ اِس سے الگ ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ایسی تیس چالیس غزلیں بے شک بکھری ہوئی ہوں گی جن کی حفاظت اور کلیات میں ازسرِ نو شمولیت ضروری ہے۔طارق متین نے کچھ نظمیں بھی کہی تھیں، اُن کی بھی تلاش کر کے اِس نئے کلیات میں محفوظ کر لینا ہمارے ادبی فرائض کا حصہ ہونا چاہیے۔

طارق متین کی شخصیت شروع سے ہی ایک شعلۂ مستعجل کی طرح تھی۔ کسی آدمی نے اُس شخص کو زیادہ دیر تک ایک جگہ پر چین سے بیٹھے ہوئے نہ دیکھا ہوگا۔ میرے گھر تو یہ عام سی بات تھی کہ کچھ دوستوں اور شاگردوں کے بیچ طارق متین اپنی گل افشانیِ گفتار میں منہمک ہیں۔ طرح طرح کے شعر، ادیبوں اور شاعروں کے واقعات اور خوش گپیوں کا دور چل رہا ہے۔ اچانک طارق متین محفل سے غائب ہو جاتا۔ مجھ سے مروّت کا ایک رشتہ تھا، اس لیے سگریٹ پینے کے لیے وہ میرے گھر سے باہر نکل جاتا۔ کبھی کبھی ہمارے کسی شاگرد نے دیکھا کہ سڑک کے کسی ہوٹل میں کچھ ناشتہ اور چائے بھی اِس وقفے میں وہ فرما رہے ہیں۔ واپسی پر میں نے شکایت کی کہ یہ سب کام تو گھر میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس نے کہا کہ سگریٹ پیتے ہوئے چائے کی طلب پیدا ہوگئی، چائے پینے بیٹھے تو گرم سموسے دیکھ کر کچھ کھا لینے کی اشتہا بھی جاگ اُٹھی۔ ایسا سیکڑوں بار ہوتا رہتا تھا کہ طارق متین ہمارے گھر میں لوگوں کے بیچ سے چند لمحے کے لیے غائب ہو جاتا اور پھر تھوڑی دیر میں واپس آ کر گفتگو کی مرکزی ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیتا۔

طارق متین کی آخری بیماریوں کو چھوڑ دیجیے تو وہ اِنرجی سے بھری ہوئی ایک شخصیت کا نام تھا۔ اِس کے پیچھے اُس کے مزاج کا دخل تو تھا ہی مگر اپنی تمام طرح کی بے توجہی کے برعکس صبح کی چہل قدمی کا مشغلہ بھی اسے بہت محبوب تھا۔ طارق متین جب پٹنہ میں ہوتو یہ ہمارے معمول کا حصہ تھا کہ وہ ڈیزی ہوٹل، سبزی باغ سے نکل کر آٹو سے اِین۔ آئی۔ ٹی موڑ پہنچ جاتا اور پھر ہم پانچ سات کیلومیٹر تیز قدموں کے ساتھ چہل قدمی کرتے۔ طارق متین کی طرح چلنے میں میں بھی تیز رَو تھا، اس لیے دوڑ کے انداز کی ہماری چہل قدمی خوب جمتی تھی۔ جب کبھی میں چار کیلومیٹر پر اُسے روکنے کی کوشش کرتا تو بہلا پھسلا کر ایک دو کیلومیٹر اور آگے لے جانے پر وہ کامیاب ہو جاتا۔ اپنی عادت کے مطابق بیچ بیچ میں رُک کر چائے اور سگریٹ کا اُس کا شوق جاگتا مگر میں اتنی دیر رکنے اور کسی دوسرے مشغلے میں شامل ہونے سے باز رکھنے میں ہمیشہ کامیاب ہو جاتا۔ گنگا کنارے کی یہ چہل قدمی اور ہانپتے دوڑتے شعر و ادب کی گفتگو ہماری زندگی کا وہ حصہ ہے جو شاید بھلائے نہ بھولے۔ کسی پروگرام میں شامل ہونے کے لیے جب میں مونگیر پہنچتا اور اکثر طارق متین کی دعوت پر ہی ایسی گنجائش ہوتی، صبح سویرے طارق متین بائیک سے ہوٹل پہنچ جاتا اور پھر ہم کمپنی باغ کے میدان اور گنگا کے کنارے اُسی طرح سے گھنٹا سوا گھنٹا دل جمعی کے ساتھ ٹہلتے۔

برسوں یہ معمول رہا کہ چہل قدمی کرنے کے بعد ہم دونوں گھر آتے۔ کبھی سورج نکل چکا ہوتا اور کبھی نکلنے کی باری ہوتی۔ میں بغیر دودھ اور چینی کی گرین ٹی تیار کرتا۔ طارق متین کو کالی اور ہری چائے پسند نہیں تھی۔ مگر میرا ساتھ دینے کے لیے وہ شریکِ بزم ہوتا۔ پھل اور بسکٹ میں وہ بہ خوشی شامل رہتا۔ کبھی

کبھار میں نے پوچھا کہ گرین ٹی جب پسند نہیں ہے تو پی کیسے لیتے ہو۔اس کا سُلجھا ہوا جواب ہوتا: مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ چیز مفید ہے، اِس لیے یہ گوارہ کر لیتا ہوں ہر چند اُس کے ذائقے اور خوشبو سے مجھے کچھ اُنس پیدا نہ ہوا۔ چائے نوشی کے دَور کے ساتھ ہم اپنے پسینے سکھاتے اور پھر طارق متین کی خواہش پر دودھ کی چائے تیار ہوتی۔تب اُسے سیری حاصل ہوتی۔ میرے کچھ شاگرد بھی رفتہ رفتہ آنے لگتے۔ کچھ شاگرد طارق متین سے گھل مل گئے تھے۔ وہ تو اور پہلے آجاتے تا کہ معمول کے درس سے پہلے زندہ ادبی درس کا حصہ ہو جائیں۔ بچوں کی پڑھائی شروع ہونے سے پہلے اگر ہماری بوا تشریف لے آئیں تو ہم ساتھ ساتھ ناشتہ بھی کر لیتے ورنہ کتنی بار یہ ہوا کہ میں طلبہ کو پڑھانے میں مصروف ہو گیا۔ طارق متین کنارے کی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے کسی کتاب یا رسالے میں گم ہو جاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ اُسے معلوم تھا کہ یہ درس کا سلسلہ دو گھنٹے تک چلے گا، وہ کہتا: میں اِس بیچ قاسم خورشید کے یہاں سے ہو کر آتا ہوں۔ وقت کی پابندی کے ساتھ گھوم کر پھر ہم لوگ اگلے پروگرام میں شامل ہو جاتے۔ کون ایسا دن ہوگا جب کوئی ادبی منصوبہ نہ بنتا ہو اور پوری اردو دنیا کے مسائل پر ہم تبادلۂ خیالات نہ کرتے ہوں۔

صبح کی محفلیں ہی محدود نہیں تھیں۔ کالج سے واپسی کے بعد شام کی محفلیں بھی شروع ہو جاتیں۔ ہمارے کچھ قریبی شاگردوں سے اس کا ایسا والہانہ رشتہ قائم ہو گیا تھا کہ وہ مجھے بتائے بغیر بھی انھیں فون کر کے بُلا لیتا۔ نہ جانے کتنی بار ہوا ہوگا کہ میری واپسی سے پہلے آدھی ادھوری محفل میرے گھر پر جم چکی ہوتی۔ ڈاکٹر تسلیم عارف، ڈاکٹر الفیہ نوری اور ڈاکٹر افشاں بانو سے اُن کی شفقت حد سے سوا تھی۔ اب سب یہ بچے ہماری یونی ورسٹیوں کے لائق و فائق اساتذہ میں شامل ہیں۔ طارق متین کی حیات رہتی اور پھر سے وہ شعر و ادب کے کوچے میں اپنے دوستوں کے بیچ آ سکتا تو شاید مزید خوش ہوتا کہ جن کی تربیت میں وقتاً فوقتاً اس نے بھی اپنا خونِ جگر صرف کیا، وہ سب نسلِ نو کی تربیت میں باضابطہ طور پر لگ گئے ہیں۔ تسلیم عارف کو تو شاعری کی طرف راغب کرنے میں طارق متین کا بڑا ہاتھ تھا۔ اُس نے ایک ٹوٹی پھوٹی غزل کہہ رکھی تھی۔ میرے کہنے پر اُس نے طارق متین کو اپنی غزل دکھائی۔ کچھ مصرعے طارق متین نے بدلوائے۔ کسی شعر کو نئے سرے سے کہنے کے لیے اُکسایا اور دیکھتے دیکھتے اردو ادب میں ایک اُبھرتا ہوا نقاد شعری منظر نامے پر بھی دستکیں دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اُسی دوپہر میں ادارۂ تحقیقاتِ عربی و فارسی میں شعری نشست طے تھی۔ ہم سب اُس میں جا رہے تھے۔ طارق متین نے تسلیم عارف کو ترنم کے ساتھ غزل پڑھنے کی مشق کرا دی۔ گھنٹے بھر کے بعد تسلیم عارف شاعر کی حیثیت سے عظیم آباد کی محفل میں نہ صرف یہ کہ شامل ہوئے بلکہ عمائدین ادب سے داد وصول کرنے میں بھی وہ کامیاب ہوئے۔ تسلیم عارف نے ایک دو غزل اور کہہ لی

تھی۔ اُسے لکھمنیا کے مشاعرے میں بھی طارق متین نے دعوت دے دی۔ خدا کی مہربانی کہیے کہ ۲۰۱۶ء کا وہ وقت تھا، تسلیم عارف کے پاس ابھی صرف تین غزلیں ہوئی ہیں مگر وہ ہمارے ساتھ قطر، سعودی عرب اور کویت کے ادبی سفر پر نکل پڑے۔ عمرہ بھی کیا اور تین غزلوں کی بنیاد پر ہی تین ملکوں کی سیر کر کے واپس آئے۔ سفر میں تسلیم عارف کی مشق واحد نظیر بھی کمرے میں کراتے رہے۔ طارق متین کے پاس پاسپورٹ نہیں تھا، اِس لیے وہ ہمارے ممالکِ غیر کے اس سفر کا حصہ نہیں بن سکا۔

طارق متین کی سیماب صفتی کا ایک ادبی حلقہ گواہ رہا ہے۔ وہ کب لکھمنیا سے مونگیر، مونگیر سے پٹنہ، پٹنہ سے کلکتہ اور اُسی طرح دلی پہنچ جائے گا، کوئی نہیں جانتا تھا۔ ۹۱۔۱۹۹۰ء کے بعد تین دہائیوں میں اُس نے ایسے ایک سو سفر ضرور کیے ہوں گے۔ پٹنہ کے مستقل اور غیر مستقل قیام کا دورانیہ الگ ہے جہاں ایک مدت تک ڈیزی ہوٹل کا ایک کمرہ اُس کے لیے مخصوص رہا۔ جہاں وہ ٹھہرے یا نہ ٹھہرے، کرائے کی ادائیگی وہ باضابطہ طور پر کرتا رہا۔ طارق متین نے چوں کہ خود کو ملازمت کی زنجیروں سے نہ باندھا تھا، اِس لیے اُسے اِس گھومنے پھرنے میں بڑی مدد ملی۔ دلی کے ایک دو ہفتے میں دس بیس محفلوں کا حصہ بنا، ایک ایک شاعر ادیب کے آستانے پر حاضری دی۔ اپنے پُرانے تعلقات کی تجدید کی اور لوگوں سے نئے نئے ادبی منصوبوں پر گفتگو ہوئی۔ اُبھرتے ہوئے شعرا و ادبا، ریسرچ اسکالرز کے درمیان بھی اُسی طرح گھومتے پھرتے رہا۔ پٹنہ، کلکتہ اور دہلی جیسے شہروں میں طارق متین کے چاہنے والوں کی جو ایک بڑی فوج نظر آتی ہے، اُس میں اِس بے غرض سلسلۂ ملاقات کا بھی بڑا دخل ہے۔ ہر شہر میں کچھ نہ کچھ نئے لکھنے والوں کی وہ شناخت کر لیتا۔ یونی ورسٹیوں کے ریسرچ اسکالرز میں اکثر تازہ ترین ادب اور شاعری سے بے شغفی عام ہے۔ طارق متین اُنھیں اپنے حلقے میں لے کر نئے شعرا کے کلام کی تھپکیاں دے دے کر ذہن سازی کرنے میں کامیاب ہوا۔ بہت سارے لوگوں کو موضوعات دے کر کتابیں لکھنے کے لیے ترغیب دیتا اور عملی معاونت بھی کرتا۔ اِس طرح وہ نئے لکھنے والوں کی ٹھوس پُشت پناہی کرنے میں کامیاب ہوا۔ کہیں کوئی اچھے شعر کہنے والا مل گیا، اُس کی مختلف مشاعروں اور پروگراموں میں متعلقہ افراد سے سفارش کرتا۔ خالد مبشر اور شہزاد انجم برہانی کو بزمِ صدف کی تقریبات میں مجھ سے کہہ کر بلوایا۔ اُس وقت تک یہ بہت نمایاں نام نہیں تھے مگر انھوں نے اپنی بہترین شاعری پیش کی۔ ایک دہائی گزرتے گزرتے یہ سب مستند ناموں کی طرح سے نمایاں ہو چکے ہیں۔ اِسے انگریزی میں Talent Hunting کہا جاتا ہے اور اب رفتہ رفتہ شعبۂ ادب میں بھی باضابطگی کے ساتھ اِسے شامل کر لیا گیا ہے۔ طارق متین بے لوث طریقے سے اپنی طرف سے یہ کام کرتا تھا۔

پٹنہ کے اے۔این۔سنہا انسٹی ٹیوٹ میں ۲۰۱۶ء میں بزمِ صدف انٹرنیشنل کا عالمی سے می نار اور مشاعرہ تھا۔ سے می نار کا ایک جلسہ پروفیسر ناز قادری کی حیات و خدمات کے لیے وقف تھا۔ مشاعرے کی صدارت سلطان اختر فرما رہے تھے۔ ملک بھر سے بہت سارے ادبا اور شعرا جمع تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر شکریے کی رسم ادا کرنے کے لیے میں جیسے ڈائس پر کھڑا ہوا، طارق متین صفِ سامعین میں سے بلند آہنگی کے ساتھ گویا ہوا کہ ایسا ایک سے می نار سلطان بھائی پر بھی ہونا چاہیے۔ آس پاس بیٹھے لوگوں نے اتفاق کیا۔ منتظم کی حیثیت سے اُس رسمِ شکریہ کے دوران ہی میں نے یہ اعلان کیا کہ آیندہ سال سلطان اختر کی ادبی خدمات کے موضوع پر ایک عالمی سے می نار منعقد کیا جائے گا۔ میں نے دوسرا اعلان کیا کہ سلطان اختر کا کلیات بزمِ صدف شائع کرے گی اور اُن کا ایک انتخابِ کلام بھی چھاپا جائے گا۔ میں نے یہ بھی اعلان کیا کہ سلطان اختر کے مصرعۂ طرح پر ایک عالمی مشاعرہ منعقد ہوگا۔ اسٹیج سے اترتے ہی طارق متین نے مجھے گلے لگا لیا کہ ایک دوست کی فرمائش کا میں نے بھرم رکھ لیا تھا۔ اب یہ تاریخ کا حصّہ ہے کہ ایک سال کے اندر ہی بزمِ صدف نے سلطان اختر کی حیات و خدمات پر ایک عالمی سے می نار منعقد کیا۔ اُس موقعے سے سلطان اختر کا ضخیم کلیات 'سرِ شاخِ طلب' شائع ہوا۔ سلطان اختر کی حیات و خدمات پر اکتالیس مضامین کا ایک بھرپور مجموعہ بھی مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ سلطان اختر کی ۱۰۱ غزلوں کا انتخاب 'پسِ عرضِ ہنر' کے نام سے شائع ہوا اور جو طرحی عالمی مشاعرہ 'کاسۂ دل سے لہو، آنکھوں سے پانی لے گیا' منعقد ہوا، اُس کی صدارت شہپر رسول نے کی۔ سلطان اختر بہ نفسِ نفیس موجود رہے۔ قطر، سعودی عرب، ایران، دوبئی اور کینیڈا کے شعرا کے شامل ۴۱ شعرا نے اپنا طرحی کلام پیش کیا۔ ایسا اہتمام کسی زندہ شخصیت کے لیے بہت کم ہوتا ہے۔ طارق متین کے ذہن میں نہ جانے کس موقعے سے اپنے پیش رو بزرگ کی عزت افزائی کا خیال پیدا ہوا اور اتنا بڑا کام مکمل ہوا۔ تقریب میں طارق متین بھی پھولے نہ سماتا تھا۔ خدا اِس تمام نیکی کا اجر طارق متین کو عطا کرے۔ اب نہ طارق متین ہے اور نہ سلطان اختر مگر جو کچھ ہوا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

محفل آرائی طارق متین کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ اپنے گاؤں لکھمنیا میں اور پھر مونگیر اور دوسرے شہروں میں طارق متین نے مشاعرے، سے می نار اور یادگاری تقریبات کے انعقادات کا ایک سلسلہ قائم کر دیا تھا۔ اُن مشاعروں میں ملک کے نامور شعرائے کرام اور نقاد شریک ہوئے۔ چند افراد کو دلّی سے، کچھ کو علی گڑھ سے، دو تین گاڑیوں میں بھر کر پٹنہ اور آس پاس کے علاقے سے شعرائے کرام اور مصنفین کو جمع کر لینا طارق متین کے لیے ایک عام سی بات تھی۔ ایسے مشاعروں میں شہر یار، سلطان اختر، شہپر رسول

اور فرحت احساس سب کے سب شامل ہوئے۔ نئی نسل کا تو ہر نمائندہ مصنف طارق متین کی ترجیحات کا حصہ ہو جاتا۔ کہنا چاہیے کہ شعر و ادب کی اِس ہنگامہ آرائی میں اُس کا دل بستا تھا۔ ہم نے بہت سارے پروگراموں میں شرکت کی۔ پٹنہ سے قاسم خورشید، کاظم رضا، فخر الدین عارفی، خورشید اکبر، شنکر کیموری، حیدر آباد سے محمد زاہد الحق، بتیا سے ظفر امام، رانچی سے تسلیم عارف جیسے شعراے کرام کو گاڑیوں میں بھر کر لے جانے کی ہمیشہ میری ذمہ داری ہوتی تھی۔

دوسرے اداروں کی تقریبات میں بھی اُسی پُر جوش انداز میں طارق متین کی شرکت ہوتی۔ دربھنگا، بتیا، اعظم گڑھ اور بنارس ہم نے کار سے ایک سے زائد بار سفر کیا۔ طارق متین کے ساتھ سفر کرنا اِس وجہ سے بہت آسان تھا کہ شعر و شاعری اور گفتگو کا ایک سلسلہ رہتا تھا۔ بعض شعرا صرف اپنے اشعار کے گھروندوں میں مقیم ہوتے ہیں۔ طارق متین کو دوسرے شعرا کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ کبھی کبھی لگتا تھا کہ عرفان صدیقی کا سارا کلام اُسے ازبر ہے۔ بعض دوستوں نے اِسی وجہ سے اُس کا نام ہی عرفان صدیقی رکھ دیا تھا۔ عرفان صاحب سے اُس کی حد درجہ عقیدت بھی تھی۔ پان، سگریٹ اور گٹکا کھانے والے کے ساتھ سفر کرنا بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ طارق متین سے میں نے کہہ رکھا تھا کہ گاڑی سے اتر کر یہ مشاغل انجام دینے ہیں۔ اُس زمانے میں ہمارے ڈرائیور صاحب بھی گٹکا کھانے والے تھے۔ لمبے سفر میں طارق متین کو قدم قدم پر یہ لوازم بھی چاہیے۔ اگر اُسے آزادی دے دی جاتی تو ہر پندرہ منٹ میں گاڑی روک کر چائے، پان، سگریٹ کے مشغلے سے وہ عہدہ برآ ہوتا۔ میں نے کہا کہ پچاس کیلومیٹر سے پہلے گاڑی نہیں رُکے گی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ہمارے ڈرائیور صاحب سے اُنھوں نے گٹکے کے پچاس پیکٹ ایک بار منگا لیے۔ شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر۔ یہ اُس کی دل ربائی ہی تھی کہ اِن تمام علّتوں کے باوجود میں اُسے رگِ جاں سے قریب سمجھتا تھا اور ایسی عادتوں کے باوجود وہ مجھے پسند تھا۔

طارق متین نے کوئی ملازمت نہیں کی۔ جس زمانے میں اُس نے تعلیم حاصل کی تھی، انگریزی یا اردو درس و تدریس کا وہ حصّہ بن سکتا تھا۔ خاندان کے کاروبار یا کاشت کاری کے کاموں میں وہ اُلجھ سکتا تھا۔ بہت مختصر مدّت کے لیے اِس طرح کے کاموں میں وہ شامل بھی ہوا اور نامرادانہ اُس نے شعر و ادب کے مشغلے میں جائے پناہ ڈھونڈی۔ خاندانی کاموں اور کاروبار میں بہت محدود پیمانے پر اُس نے دل لگایا اور پھر اُس میدان سے گھر والوں نے ہی اُس سے نجات حاصل کر لی۔ خاندان مالی اعتبار سے کمزور نہ تھا، اِس لیے اُن کے اور اُن کے بال بچوں کے اخراجات کا بوجھ تاحیات اُٹھاتا رہا۔ اُن کی فضول خرچی اور شاہ خرچی کو اُن کے گھر والوں سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا، اس لیے ایک طویل مدت سے اُن کی حیثیت نئی مالی

اصطلاح میں Cashless ہو کر رہ گئی تھی۔ کئی دہائیوں تک اُس نے اپنی زندگی انھی حدود اور مالی تحفظات میں بسر کی۔

زندگی کے اِن صبر آزما دنوں اور کچھ کہنے اور کرنے کے مشغلے میں اُس کی زندگی آسان نہیں تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ طارق متین نے اپنی ساکھ قائم کرنے میں خود کو زیروز بر کر دیا تھا۔ اُس کی زندگی کو جس قدر دور یا نزدیک سے دیکھنے کے مواقع ملے، اُس میں ہمیشہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ اپنے گھر کی کشادگی اور ذاتی مالیت کی تنگی کے دو پاٹن میں اُسے اپنی زندگی کو ہوم کر دینا تھا۔ یہ بات سوچتے ہوئے اَب اور تکلیف ہوتی ہے مگر یہ سچ ہے کہ طارق متین نے اِس المیے میں اپنی صلاحیت، اپنی شعر گوئی اور بالآخر اپنی زندگی لٹا دی۔ ہم سب نے پچھلے تیس برسوں میں جس طارق متین کو دیکھا، وہ انھی کشمکشوں میں اُلجھتا ہوا، لٹتا ہوا اور قطرہ قطرہ ڈوبتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ خود اپنی شکست کی آواز بن چکا تھا۔ دو پاٹوں میں پستے ہوئے اُس کے پاس آخری راستہ شاید وہی تھا جسے اس نے آزمایا۔ بھیڑ میں چہکنے والا، تیز تیز بھاگنے والا اپنے کمرے اور گھر میں قید ہونے کی مجبوریوں میں حتمی طور پر ایسا اُلجھا کہ دنیا نے اُس کی لاش ہی دیکھی۔ اِسی خود آزاری اور موت میں اُس کی عزت بھی بچ سکتی تھی اور اُس کے خاندان اور رشتے داروں کا آخری اشارہ بھی مکمل ہو سکتا تھا۔ ہائے یہ کیسا چراغ تھا جس نے ٹمٹماتے ہوئے اور بجھتے ہوئے دنیا جہان کے لیے نہ ایک آہ چھوڑی اور نہ مرتے مرتے کسی اور کی مدد لینے کو روادار ہوا۔ گھر سے اسپتال پہنچتے پہنچتے خدا نے آخری لاج بچالی۔ بقولِ غالب:

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم — مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

کاش اپنے آزاد مزاج کے دائرے میں رہتے ہوئے طارق متین نے زندگی کے کچھ اور پہلو بھی تلاش کر لیے ہوتے۔ یہ ہرگز لازم نہیں تھا کہ اِن اُلجھنوں میں وہ خود آزاری اور عُرفِ عام میں فرار کی راہ ہی اختیار کرتا۔

رسائل و جرائد کی اشاعت کے ساتھ طارق متین کے ذہن میں ایک اشاعتی ادارے کا بھی تصوّر تھا۔ کچھ کتابیں علم و ادب پبلی کیشنز کی طرف سے شائع بھی ہوئیں لیکن اُن کتابوں کی تعداد زیادہ رہی جو اِس اسکیم کا حصہ بنتے بنتے رہ گئیں۔ ایک محدود پیمانے پر ہی سہی مگر طارق متین کو کاروبار کا تجربہ تھا۔ تجارت پیشہ اُن کا خاندان اور گھر بار بھی تھا۔ وہ اپنے اشاعتی ادارے کو قومی سطح پر پھیلانے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ ایک زمانے میں تو پٹنہ میں اُس نے پبلی کیشن کا دفتر بھی کھول دیا تھا۔ طارق متین کے تعلقات ملک بھر کے ادیبوں اور شاعروں سے تھے۔ اشاعتی گھر کو استحکام دینے کے لیے ایسے رشتوں کی بڑی اہمیت تھی۔ طارق

متین کی طرف ایک بڑے حلقے کی توجہ بھی ہوئی مگر اِس کاروبار کو وہ منظّم نہ کر سکا۔ سچائی یہ تھی کہ وہ اپنے رسائل جب باقاعدگی سے شائع نہیں کر پاتا تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ نیم ادبی کاروبار کامیابی سے سنبھال لیتا۔ بار بار اِس موضوع پر ہم لوگ بات چیت کرتے۔ کمال یہ تھا کہ اشاعتی گھر اور اُس کے کاروبار کے مسائل سے وہ پورے طور پر واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کہاں کیا کر دیا جائے تو معاملات درست ہو جائیں مگر یہ ہو نہ سکا۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ طارق متین خود بھی ایسے ادارے کو اِس قدر مضبوط بنانا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اُس کے بعد اُس حصار میں اُسے اُلجھ کر رہ جانا پڑے گا اور وہ اِس مٹّی کا نہیں بنا تھا۔ یہ سب زوال کی راہیں تھیں جہاں سے طارق متین لڑھکتے ہوئے خود اختیار کردہ منزل تک پہنچا۔

طارق متین کے قریبی دوست احباب جانتے ہیں کہ کسی نجی محفل میں وہ موجود ہو تو دوسروں سے اُس کی آواز کا آہنگ تیز بھی رہے گا اور مقدار کے اعتبار سے بھی اُس کی باتیں زیادہ سامنے آئیں گی۔ یہ اکثر ہوتا کہ وہ اپنی روانی سے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کرتا۔ پھر کہتے کہتے خاموش ہو جاتا۔ خاموشی ختمِ کلام کے بعد کی خاموشی نہیں ہوتی۔ یہ اُس کی شخصیت میں پیوست سنّاٹے اور خاموشیوں یا سرگوشیوں کا اظہار تھا۔ محفل میں لوگ اِن سنّاٹوں پر متوجہ نہ ہو جائیں، اِس کے لیے طارق متین کے پاس آزمائے ہوئے حربے اور مشغلے تھے۔ گفتگو کے بیچ میں سے نکل کر کبھی سگریٹ پی لینے یا کبھی پانچ دس منٹ کے لیے چہل قدمی کر کے واپس چلے آنے کی خو، اُن سنّاٹوں کو پوشیدہ رکھنے کی ایک کھلی کوشش تھی ورنہ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ بولتے بولتے اور سنتے سنتے محفل سے کوئی بیچ سے ہی غائب ہو جائے۔ سگریٹ اور پان کے مشاغل ایسے مواقع سے طارق متین کا آخری سہارا ہوتے اور اُس کے اندرون کے خلفشار اور سنّاٹے کی اِس طرح پردہ پوشی ہو جاتی۔

تقریباً تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ بیتا جب طارق متین کی شخصیت کا ایک عیب اُن کے تمام دوستوں پر واشگاف ہوا اور جس سے سب پناہ مانگتے تھے کہ وہ اچانک کئی مہینوں کے لیے مجمعے سے غائب ہو جائے گا۔ وہ دوست جو آپ سے روزانہ مل سکتا ہو یا جن سے بغیر کسی رکاوٹ کے روز روز خیریت کا تبادلہ فون کے ذریعہ ہو رہا ہو، اُس شخص سے ملاقات تو دور کی بات، اُس کے بارے میں اطلاع تک ملنی دشوار ہو جائے۔ لکھمنیا میں اُس کے بارے میں کچھ پتا نہ چلے گا۔ مونگیر سے رابطہ قائم کرتے کرتے آپ تھک جائیں گے، طارق متین آخر کہاں ہے، اِس کا کسی کو بھی اندازہ نہیں ہوگا۔ لوگ کلکتہ، دلّی اور علی گڑھ کے دوستوں سے پتا کریں گے۔ سب تشویش میں مبتلا ہیں مگر طارق متین کسی انجانی راہ پر خود اختیار کردہ سناٹے کے گھر میں مقیم ہو جاتا۔ اقبال نے جو کہا کہ 'اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے' مگر طارق متین ڈوبتا کہاں تھا، یہ سمجھ میں

آنا مشکل تھا۔ پھر چند مہینوں کے بعد اچانک اُس کا ورودِ نو ہوتا کسی نئے رسالے کے ساتھ، کسی مجموعۂ کلام کے ساتھ یا بہت سارے نئے منصوبوں کے ساتھ۔ جن دوستوں سے واقعتاً اُس کا قلبی لگاؤ تھا، وہ بھی کبھی تنہائی میں اِن وقفہ ہائے صفر کے بارے میں طارق متین سے کچھ پوچھنا چاہتے تو وہ اِس سنّاٹے کو توڑنے کے لیے روادار نہ ہوا۔ ایسے مواقع سے ہمیشہ عرفان صدیقی اور دوسرے شعرا کا کلام اور کبھی کبھی اپنے اشعار بھی سہارا ہوتے مگر آپ قسم لے لیجیے کہ طارق متین اُن وقفوں کے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی زبان پر لائے گا۔ وہ اپنی بلند آہنگ زبان، بے روح ٹھہاکوں اور خوش اعتقادی کے فرمودات سے اُس حقیقی جواب کو ہمیشہ غائب کر دیتا تھا۔

رفتہ رفتہ محفلوں سے غیاب اور معمول کی زندگی سے رہ رہ کر پردہ کر لینے کی خو طارق متین کے یہاں مستقل باب بن گئی۔ پہلے بھیڑ سے غائب اور دنیا سے بےخبر ہونے کی میعاد مختصر ہوتی تھی۔ چند مہینوں میں وہ اپنے تن بدن کو جھاڑ کر پھر سے ہمارے بیچ آجاتا تھا مگر یہ سلسلہ رفتہ رفتہ بڑھنے لگا۔ 'غزالِ درد' کی اشاعت کے موقعے سے فراغ روہوی نے ایک دل پذیر مضمون لکھا جس میں طارق متین سے عوامی سطح پر انھوں نے گزارش کی کہ اب پھر ہماری محفلوں سے بھاگ کر تو مت جانا۔ میری شکایت کا خیال رکھنا۔ سچائی یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ہم سارے دوست اِن خدشات میں مبتلا رہنے لگے تھے کہ طارق متین کس اگلی صبح سے ہماری محفلوں سے نکل کر ہم سے روپوش ہو جائے گا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہزار منصوبے اُس نے خود بنا رکھے ہوں مگر اُس ظالم کو اِس غیاب میں پہنچنے کے بعد شاید سب کچھ بھُلا دینے کی عادت ہو گئی تھی۔ یہ بات بھی سچی ہے کہ جو شخص خود کو بھُلائے ہوئے تھا وہ دوسروں کو یا دنیا کو بھُلا دینے کے لیے کیوں کر نہ تیار ہو جائے گا۔

طارق متین کا ایک بڑا مشغلہ سیاسی بھی ہوتا گیا۔ پہلے ضلع پریشد میں قسمت آزمائی کی پھر 'لوک جن شکتی پارٹی' میں شامل ہو کر اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ دونوں مواقع سے شکست خوردگی اُس کا مقدّر رہی۔ ایک دور تھا جب 'انڈین یونین مسلم لیگ' میں وہ شامل ہوا۔ اِن سیاسی مواقع سے وہ صرف انتخاب لڑ کر جیت جانے تک خود کو محدود نہیں رکھتا، وہ سیاسی پارٹی کو متحرک کرنے اور بہار کے سیاسی اور سماجی بدلاؤ کو نشانہ بناتا تھا۔ اس لیے اُس کے تعلقات مختلف سیاسی جماعتوں کے سربراہوں سے قائم ہوئے اور وہ اُن کی اعلا سطحی نشستوں کا حصہ بھی بنا۔ اِس مرحلے میں کہیں نہ کہیں پروفیسر لطف الرحمان سے ذاتی تعلق، ساتھ کام کرنے کا شوق اور سیاسی مداخلت کے خواب بھی شامل تھے۔ اِن مراحل میں طارق متین کی سیاسی نظر اور تقریری صلاحیتوں کا اچھا خاصا استعمال ہوا۔ لطف الرحمان صاحب بھی اِس فن کے ماہر تھے مگر ایک بار کی جیت اور وزارت کی حصولیابی کے بعد اُن کی سیاسی گاڑی کبھی پٹری پر واپس نہ آئی۔ پارٹیاں بدل بدل کر انھوں نے

بھی نئے اندھیروں کو چنا اور طارق متین بھی سیاسی بزم سے راندۂ درگاہ ہوئے۔ ہاتھ میں خشک ریت اور آنکھوں میں سنّاٹوں کے ساتھ صفر حصولیابی پر قانع ہونا اُن کا مقدر بنا۔

2014-15ء میں طارق متین نے ایک بار پھر سے خود کو مجتمع کر کے سیاست کی عملی کمیں گاہ میں اُترنے کا فیصلہ کیا۔ چند بااثر افراد نے اُس کی پُشت پناہی کا فیصلہ کیا۔ اب وہ زیادہ باضابطگی سے پٹنہ رہنے لگا۔ چھوٹے موٹے سرکاری عہدوں کا لالچ اُسے نہیں تھا۔ ہاں اُسے کوئی ایسا عہدہ ضرور چاہیے تھا جس سے ادب اور سیاست دونوں کی سرخیلی نصیب ہو سکے۔ یہ دوڑ بھاگ، صلاح مشورہ اور بارسوخ افراد کے بیچ آنے جانے کا سلسلہ بہت تیز تر تھا۔ کئی بار طارق متین اطلاع دیتا کہ فلاں عہدے کے لیے چیف منسٹر نے میرے لیے فلاں صاحب کو یقین دلایا ہے مگر اِن کئی برسوں میں اونچ نیچ اور دوڑ بھاگ کے کھیل تماشے چلتے رہے۔ طارق متین کی محرومی کا کوئی آسان مداوہ ممکن نہیں تھا۔ 2018ء تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اِس دوران طارق متین نے اپنے لباس، اپنی رہائش اور رکھ رکھاو میں بھی مزید چمک پیدا کر لی تھی۔ گاڑیوں کا بھی وقتی طور سے آنے جانے کے لیے انتظام ہوتا رہا۔ بہت اڈّوں پر میں بھی اُسے لے کر ضرورت کے مطابق دربارانِ عالیہ میں حاضری لگانے کے جتن میں شامل ہوا۔ قدرت کو جو منظور تھا، وہ طارق متین کے لیے جاں کاہ ثابت ہوا۔ جس کی پوری زندگی طرح طرح کی نامرادیوں میں کٹی ہو، ہارنے اور جیتنے کا عجیب و غریب کھیل جو زندگی بھر لڑتا رہا ہو، اُس کے لیے یہ نامرادی تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔

2019ء جیسے جیسے اختتام کے مراحل تک بڑھتا گیا، طارق متین نے خود کو مجمعے سے سمیٹ کر گھر میں قید کر لیا۔ اِس سے پہلے کسی دوسرے شہر یا کسی نامعلوم جگہ میں طارق متین وقفۂ صفر کو آزمانے کا عادی تھا مگر اِس بار اِس Self Exile کے لیے اُس نے اپنے گھر کو منتخب کیا۔ جو شخص سورج کی روشنی میں کبھی اپنے گھر آنگن کا قیدی نہ رہا ہو، اُس نے چوبیس گھنٹے اپنے ادبی اور سیاسی دوستوں سے دور گھر کی تنہائی میں بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو۔ گھر میں دال روٹی گوارا کر لی لیکن دنیا کے کسی آدمی سے ملنا اسے منظور نہ ہوا ۔ مردم گزیدگی کی انتہا یہ تھی کہ مونگیر شہر کی اُس نے ساری تقریبات چھوڑ دیں۔ شہر کا کوئی شخص خیریت جاننے یا ملنے کے لیے اُس کے گھر پہنچا تو اُس کی ہدایت کے مطابق کوئی اُس سے مل نہیں سکتا تھا۔ یہ علاحدہ پسندی خود آزاری کی وہ انتہائی شکل تھی جسے طارق متین نے اپنے اوپر لازم کر لی تھی۔ اپنے شہر اور صوبے میں اُس کے سارے چاہنے والے اُس کے لیے اجنبی ہو گئے۔ تقریبات منعقد ہوتیں، دعوت نامے بھیجے جاتے مگر شمعِ محل روٹھی ہوئی تھی۔

دیکھتے دیکھتے کورونا کا زمانہ آ گیا۔ اس دوران طارق متین کسی فون نمبر پر محوِ گفتگو نہیں ہوتا تھا۔

تشویشات کے لمحوں میں پانچ دس لوگوں سے بس اتنا معلوم ہو پاتا تھا کہ طارق متین مونگیر میں اپنے گھر میں قید ہے۔2020ء کے دسمبر میں رحمانی فاؤنڈیشن نے ایک ادبی تقریب منعقد کی۔طارق متین کی کوششوں سے ہی مولانا ولی رحمانی نے رحمانی فاؤنڈیشن میں فروغِ ادب کا پورا ایک ذیلی ادارہ بنا رکھا تھا اور طارق متین نے ہی مجھے اور دوسرے ادبا اور شعرا کو اُس کا حصہ بنایا تھا۔اُس پروگرام سے پہلے میں نے یہ منصوبہ بنایا کہ کسی طرح طارق متین کو اُس کے گھر سے نکال کر جلسے میں لائیں گے۔ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی بھی پٹنہ سے میرے ساتھ ساتھ گئے تھے۔شہزاد کو طارق متین کی جانب سے خوب خوب محبتیں ملتی رہی ہیں۔مولانا عبدالرؤف رحمانی کے ساتھ شہزاد اور میں طارق متین کے گھر پہنچے۔دو ڈھائی برس کے بعد طارق متین کو میں دیکھ رہا تھا۔ظاہری طور پر کوئی خاص تبدیلی تو نظر نہیں آئی مگر اُس نے ہاتھ جوڑ لیا کہ جلسے میں چلنے کے لیے مجھ سے کچھ نہ کہیے۔کچھ چائے ناشتے میں بھی ہم ساتھ رہے۔دو گھنٹے رہنے اور ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کے باوجود داخل کا سنّاٹا پھیلتا جا رہا تھا۔آنسو ہم دونوں نے پی رکھے تھے۔دل میں یہ خیال آیا کہ چلو بہت کوششوں کے بعد ہی سہی، دوست کا آخری دیدار کر لیا۔نہ جانے کس لمحے یہ خیال آیا، وہ لمحہ نہایت بد شگون تھا۔آخر وہی ہوا۔اُس کے بعد طارق متین کو کفن میں لپٹے ہوئے ہی مجھے دیکھنا نصیب ہوا۔

طارق متین گھر سے نیچے اپنی دیرینہ وضع داری کے ساتھ چھوڑنے آیا۔میں نے پوچھا کہ اِس دوران چھپی میری کچھ کتابیں اُسے پڑھنے کے لیے دے سکتا ہوں؟ اُس نے اُن کتابوں کو لیا اور مدّھم رفتار سے سیڑھیوں پر اوپر بڑھنے لگا۔مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ہم دوست کے دیکھنے کی خوشی اور ایک بار پھر سے بچھڑنے کے غم کے ساتھ رحمانی فاؤنڈیشن کے جلسے میں چلے آئے۔2021ء میں مولانا ولی رحمانی کورونا کی نذر ہوئے اور مونگیر آنے جانے کا سلسلہ بھی گھٹتا گیا۔گذشتہ تین چار برسوں میں کئی بار ہمارے گہرے دوست شاہد اختر نے کہا کہ چل کر ایک بار طارق متین کو دیکھ آتے ہیں۔میں نے کہا کہ میں ہمیشہ تیار ہوں، پلان بنا لو۔کبھی یہی خواہش کاظم رضا نے بھی کی تھی مگر موقع نہ ملا۔میری قسمت میں بس اتنا ہی لکھا تھا کہ اپنے اُس دوست کو سفید کفن میں لپٹا ہی دوبارہ دیکھ سکوں، زندگی کا یہی صدمہ مقدر میں محفوظ رہ گیا۔

یہ خدشہ تھا کہ طارق متین کا Self Exile اب اُس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔اپنے آپ کے ساتھ یہ اُس کا آخری ظلم وستم تھا۔تاریخ میں بہت سارے خود آزار ہوئے ہیں۔ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہماری صف میں بیٹھا ہوا سب سے خوش مزاج، سب سے مصالحت کر لینے والا، سب سے بدگمانیاں ختم کر لینے والا آدمی اس طرح روٹھ جائے گا۔طارق متین نے اپنی جان دے کر اپنے چاہنے والوں، اپنے دوستوں اور اپنے سارے متعلقین سے خاموش بدلہ لے لیا۔اُس نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔اپنی شکستوں کا

کوئی تماشہ نہیں بنایا۔ جہاں وہ جیتتا تھا، مجمع لگا لیتا تھا مگر جب آخری بار ہارا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اُس کے کسی چاہنے والے کو یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ طارق متین اب لَوٹ کر محفل میں نہیں آنے والا۔ ہم میں سے کسی نے اُن خاموشیوں کی آوازیں بھی نہ سُنیں۔ فضا میں جولہریں اُٹھ رہی تھیں، اُن کے زیر و بم کو ٹھیک سے ہم تَول نہ سکے۔ ستاروں کی چالیں سمجھ میں نہ آئیں۔ پرندوں کی مغموم آوازیں ہمیں باخبر نہ کر سکیں اور ہم میں سے ہزاروں کا چمن اُجڑ گیا۔ آخری دور میں طارق متین نے ایک غزل کہی تھی۔ ہم نے یہ سمجھا تھا کہ یہ غزل خوانی ہے۔ مضامین کی گردان ہے اور کوئی بات نہیں۔ اب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ طارق متین نے تو پیشین گوئی کر دی تھی۔ پانچ شعر کی یہ غزل فصیلِ وقت پہ کچھ اِس طرح کندہ ہے کہ دل ونظر کو ہٹانے میں خوف آتا ہے۔ مطلع سے مقطع تک سوز اور سوزش کی کیفیات ہیں۔ غزل کے اشعار ملاحظہ کریں؛

زندگی سے ہار کر اب اپنے گھر جانے کو ہے ... ایسا لگتا ہے کہ اب یہ شخص مر جانے کو ہے
رفتہ رفتہ ہوش اپنا کام کر جانے کو ہے ... اب ہمارے جوش کا دریا اُتر جانے کو ہے
عشق کا انجام کیا ہے رائگانی کے سوا ... میں بھی ڈھ جانے کو ہوں، وہ بھی بکھر جانے کو ہے
ہاں، شہیدانِ وفا میں نام تو رہ جائے گا ... کیا ہے گر اس معرکے میں میرا سر جانے کو ہے
اس فریبِ رنگ و بو میں مت رہو طارق متین ... واہمہ ہے یہ کہ دنیا اب سنور جانے کو ہے

◄● ►

Department of Urdu
College of Commerce,
Arts and Science, Patna
Email: safdraimamquadri@gmail.com
Mob & WhatsApp: 9430466321

ثالث کی ڈاک

نام کتاب : جان عالم ... صنف : ناول
مصنفہ : عرفانہ تزئین شبنم ... ترتیب وتزئین: پروفیسر ایم سہیل
صفحات : ۲۶۱ ... قیمت : ۲۵۰ روپے
ملنے کا پتہ : وجی محی الدین گلی، مسلم پور، وانمباڑی

● پروفیسر صفدر امام قادری

ہمارے شعر بھی کچھ مختلف تو ہوتے ہیں

عہدِ نو اور شعرِ تازہ یعنی ریاضتیں طارق متین کی

ہم عصر اردو شاعری کا منظر نامہ مختلف طرح کی آوازوں سے بھرا پڑا ہے۔ اب بھی چند ترقی پسند شعر گو نظر آ جاتے ہیں۔ جدیدیت کے علم بردار شعرا کی درجنوں مستحکم آوازیں اپنے لہجے کے وقار کے ساتھ زندہ و توانا موجود ہیں۔ مابعد جدید شاعروں کا ایک جمِ غفیر بھی گذشتہ چار دہائیوں میں ابھر کر سامنے آیا جن میں کم از کم پچاس ایسے شعرا بہ آسانی مل جائیں گے جن کے تین چار مجموعے سامنے آ چکے ہوں یا جن کی ڈیڑھ دو سو غزلیں نظمیں شائع ہو چکی ہوں۔ ان تین مستقل رویّوں میں کئی ایسے صاحبِ اسلوب شعرا بھی ہیں جنھوں نے اپنی زبان، طریقۂ استعمال، موضوعات پر خصوصی توجہ اور بیان کے انفرادی ڈھب سے اپنی شناخت کا دعوا کبھی تیز لہجے میں اور کبھی دھیمے سُروں میں پیش کر رکھا ہے۔ تین سے پانچ دہائیوں تک کی ریاضت کے باوجود ان میں سے بہت کم ایسے فن کار ہوں گے جنھیں عوام و خواص کی سطح پر سکۂ رائج الوقت ہونے کا موقع نصیب ہوا۔

اس عرصے میں کچھ ایسے شعرا بھی سامنے آئے جنھیں ان کے عہد کے غالب ادبی رویّوں میں محدود کر کے پہچاننے میں دشواری ہوتی ہے۔ وہ ترقی پسند بھی ہیں اور جدید یا مابعد جدید بھی۔ مگر سب سے دبڑی شواری ایسے شاعروں کے سلسلے سے پیدا ہوتی ہے جو نہ اپنے عہد کے رجحانات کے مکمّل طور پر تابع ہونا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی سابقین کے آزمائے ہوئے راستوں کو اُسی انداز میں اپنانے کے خوگر معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کی شاعری یا ان کا ادب آسمان میں معلّق معلوم ہوتا ہے مگر اتنا ضرور درست ہے کہ وہ آزمائے ہوئے ادبی رویّوں سے کبھی بے ارادہ اور کبھی بالارادہ اجتناب برتتے ہوئے خلا میں کوئی نئی تفہیم یا انوکھی راہ تلاش کرنے میں منہمک ہوتے ہیں۔ ان کے لیے ایک طرف یہ آسانی ہے کہ روایت کے ہر مرحلے سے سلسلۂ فیضان ان کی شریانوں تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ وہ روایت کی گھنی چھاؤں میں بہ عافیت رہنے کے تمنائی ہو جائیں تو پھر ان کے لیے یہی آسان تھا کہ وہ اپنے عہد کے

مخصوص ادبی رویّوں میں خوش وخرم رہ کر سیرِ گلستاں میں مگن رہتے مگر وہاں انھیں قرار کہاں آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں آنے والے وقت کے ادبی رویّوں کی تشکیل وتعمیر میں اپنا لہو صرف کرنا ہے۔ کہنے کو تو یہ بات باعثِ تمسخر ہونی چاہیے کہ جو ہوا نہیں، اس کی پہچان کی جائے؛ جو زمین پر اُترا نہیں، اس کی صورت گری کی جائے۔ آسانی کے لیے شعر گوئی کے اس عمل کو نجم شناسی، پیشین گوئی یا مستقبل آشنائی کے صیغے میں رکھا جاسکتا ہے۔ کیا شاعری کو اسی وجہ سے ''جز ویست از پیغمبری'' کہا گیا؟ بے شک شعر گوئی کا یہی وہ طورِ نو ہے جس سے ہمارے عہد کا نیا شاعر پیدا ہوسکتا ہے۔

ہمارے عہد کے ایسے شعرا جن کی طبعی عمر چھے دہائیوں کو پہنچ رہی ہو اور کم وبیش تین دہائیوں کی مشق مکمل کر کے وہ خود کو اپنی پہچان کے لیے آمادہ کررہے ہوں؛ ایسے شعرا میں طارق متین کی شخصیت کو پہچاننے میں کسی طرح کی دشواری نہیں ہوسکتی۔ پندرہ برس کی عمر سے طارق متین نے شعر کہنا شروع کیا۔ تیس برس سے قبل ہی اپنا پہلا مجموعہ ''مُشکِ سخن'' ۱۹۹۷ء میں پیش کر دیا تھا۔ اس کے بعد ایک ایک دہائی کے وقفے سے انھوں نے ''قندیلِ ہنر'' (۲۰۰۸) اور ''غزالِ درد'' (۲۰۱۶) سامنے لاکر اپنا ادبی سرمایہ وقفے وقفے سے برسرِ عام کرنے میں کامیابی پائی۔ ۲۰۱۶ء میں انھوں نے ''ریاضتِ نیم شب'' عنوان سے اپنی ۲۰۵ غزلوں اور ایک حمد اور ایک نعت کی کلیاتِ اوّل پیش کر کے پڑھنے والوں کو ذرا چونکایا بھی تھا۔ اس قدر تواتر کے ساتھ شعر گوئی اور پھر اسے عوام کے سامنے پیش کرنے کی مستعدی سے شاعر کے اس اعتماد کا اندازہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس نے لفظ سازی کی اس طلسمی دنیا کا باشندہ بننا پسند کیا۔ ایک آخری دور کی ایک طویل خاموشی اور ۲۰۲۵ء میں بالآخر رخصت سے پہلے طارق متین کی مشقِ سخن پینتیس (۳۵) بہاریں دیکھ چکی تھی اور اس دوران ان کا مطبوعہ کلام ہمیں مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرنے کے لیے مواقع فراہم کرتا ہے:

الف: طارق متین نے لگاتار شعر کہے اور ان کے اب تک کے ادبی سفر میں کوئی طویل وقفہ ایسا نظر نہیں آتا جس کی وجہ سے ان کی جولانیِ طبع پہ دوسرے شعرا کی طرح سے حرف آتا ہوا معلوم ہو۔

ب: پینتیس برس کو اگر مہینوں میں تقسیم کریں تو چار سو بیس مہینے حاصل ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہر دو مہینے میں ایک غزل کا تناسب قائم ہوتا ہے۔ پورے مجموعے میں نوّے فی صدی غزلیں پانچ چھے شعر پر مشتمل ہیں۔ یعنی قادرالکلامی کے زعم میں شاعر نے دفتر سیاہ نہیں کیے بلکہ منتخب کلام پیش کر کے خود کو فضول گوئی اور بسیار نویسی سے بھی بچایا۔ دوسری طرف اپنے جذبات وخیالات

پیش کرنے میں ایک محتاط رویہ پیش نظر رکھا۔ انعام اللہ خاں یقین سے لے کر غالب اور مجروح سلطان پوری تک یہ طور نظر آتا ہے کہ شاعر اپنا سرمایۂ سخن پیش کرتے ہوئے اپنی تنقیدی نگاہ کو بھی بروے کار لائے اور عوام کی عدالت میں خود بھی بہ کمال سنجیدگی اترے۔

وہ شاعر جو بنے بنائے سابقہ اور عصرِ حاضر دونوں رویوں سے گریز کر کے کسی طلسم خانۂ حیرت کی تشکیل میں منہمک ہونا چاہتا ہے، اس کی پہچان میں واضح رکاوٹیں سامنے آتی ہیں۔ وہ عصرِ حاضر کے مسلّمہ اصولوں سے الگ اپنے اصول گڑھتا ہے۔ ایسے میں اس عہد کی عمومی فضا میں رچے بسے نقاد کو اس میں کیوں کر محبوبیت نظر آئے گی۔ وہ بزرگ نسلوں کا مطیع اور فرماں بردار نہیں ہے، اس وجہ سے ادب فہمی کے پرانے زاویے اور اوزار اس پر کام نہیں آ سکتے۔ ایک مخصوص ماحول کے تربیت یافتہ نقاد کی نگاہ میں ایسا شاعر کیوں کر پسندیدہ قرار دیا جائے گا کیوں کہ اس نئے شاعر کی شاعری بہ قول غالب ''کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے'' کا تقاضا کرتی ہے مگر آزمائی ہوئی تنقیدی راہوں سے چل کر ایسے شاعر کے ایوانِ شعر میں بھلا کیوں کر داخل ہوا جا سکتا ہے؟ نیا شاعر اور تمام آزمائے ہوئے فنّی رویوں سے الگ کھڑا ہونے والا فن کار شاید اسی وجہ سے ہماری توجّہ سے محروم اور unattended رہ جاتا ہے کیوں کہ بنے بنائے سانچوں میں اس شاعر کو پہچاننا اور اس کی قدرتِ کلام کا احتساب کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسے ناممکنات میں شمار کرنا چاہیے۔ تقریباً ہر دور کے نقادوں پر ایسے الزامات عائد ہوئے ہیں کہ وہ سہل پسند واقع ہوئے ہیں اور نئے فن کار کو پہچاننے یا اس کا مکمل احتساب کرنے کے لیے نئے اصول وضوابط اور نئے اوزار ایجاد کرنے میں اکثر وبیش تر ناکام ہوتے ہیں۔ کہنے کو طارق متین کی شاعری پر طویل ومختصر تین درجن سے کم تحریریں سامنے نہیں آئیں۔ ان میں مختلف نسلوں کے نقاد اور شعراے کرام شامل ہیں جن میں سے متعدد مشاہیر کی صف میں شمار ہوتے ہیں مگر اس مجموعی تنقیدی اثاثے کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات صاف صاف کہاں نظر آتی ہے؟ یا ایسے سوالوں کے حل کہاں تلاش کر لیے گئے:

۱۔ طارق متین کے شعری امتیازات کے کون کون سے خاص پہلو ہیں؟

۲۔ اپنے ہم عصروں سے وہ کن باتوں میں مختلف ہیں؟

۳۔ کیا طارق متین نے غزل کی کوئی نئی زبان ایجاد کی ہے؟

۴۔ کیا طارق متین کی شاعری بزرگ غزل گو شعرا کے رنگِ سخن سے اکتساب کا نمونہ ہے یا انحراف کا کوئی پیمانہ وہاں وضع ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے؟

۵۔ کیا طارق متین نے اپنا کوئی نیا شعری استعاراتی نظام قائم کیا جس سے انھیں الگ سے پہچانا جا سکے؟

۶۔ کیا طارق متین کے یہاں کوئی ذاتی شعری فلسفہ یا فکری نظام مرتب ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے؟

۷۔ کیا ہم عصر شاعری کے سرمایے میں زبان و بیان یا مضامین کے کسی انفرادی رویے کی وجہ سے طارق متین کو الگ سے پہچانا جاتا ہے؟

۸۔ کیا طارق متین نے اپنے عہد کے ادبی اسالیب کو اپنے لیے رہنما بنایا اور ان پر چلتے ہوئے کوئی انفرادی یا اختصاصی سرمایہ پیش کر دیا۔

۹۔ کیا موجودہ عہد کی زندگی کو طارق متین نے اپنے شعری سرمایے میں بہ طریقِ احسن پیش کرنے میں کامیابی پائی؟

۱۰۔ الفاظ، تراکیب، استعاراتی نظام اور پیکر کو اپنے شعر کا حصہ بناتے ہوئے طارق متین نے کیا کوئی نتیجہ خیز صورت حال پیش کر دی ہے؟

۱۱۔ کیا طارق متین کا مجموعی سرمایہ اس بات پر ہمیں راضی کرتا ہے کہ موجودہ عہد کے شعری افق پر وہ ایک قابلِ اعتبار نام کی طرح توجہ کے حامل ہیں؟

۱۲۔ کیا طارق متین کو آنے والے دور کی صفِ اول کے شعرا میں جگہ مل سکے گی؟

۱۳۔ کیا طارق متین اپنے ہم عصروں یا اپنے بعد آنے والی نسل پر اپنے شاعرانہ امتیازات کے اثرات قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟

یہ اور ایسے بہت سارے سوالات ہیں جن کے واضح جوابات دیے بغیر ہماری تنقید کا وہ کام ادھورا رہے گا جسے طارق متین شناسی کہہ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے طارق متین کے سلسلے سے جو تنقیدی سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے، وہ ناکافی ہے اور اس کے نتائج علمی اور ادبی بنیادوں پر مکمل نہیں مانے جا سکتے۔ کسی مختلف انداز کے شاعر یا کسی نئی فکر کے حامل فن کار کو اسی زمانے میں اگر سرسری طور پر پہچانا جانے لگے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ تنقید نے پرانے اوزاروں یا آزمائے ہوئے نسخوں کو استعمال میں لایا ہے۔ پوری ہم عصر شاعری اور خاص طور سے وہ سرمایہ جس میں انوکھے پن کے امکانات بدرجۂ اتم موجود ہیں، ان کے ساتھ ہماری زبان اور اس کے نقادوں کا یہ سرسری برتاو ہی وہ رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے تیس چالیس برس سے ریاضتِ فکر کے باوجود ہماری نئی نسل جو اَب اچھی خاصی پختہ کار ہو چکی ہے، اس کا ایمان دارانہ

ادبی احتساب ممکن نہیں ہو پا رہا ہے اور اس پورے عہد کا علمی اعتبار طے ہونے میں پریشانیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ ترقی پسند اور جدیدیت کے علم بردار نقادوں یا ان کے زیرِ اثر پروان چڑھے افراد نے ایک ایسی فضا بندی کر رکھی ہے جس میں ۱۹۸۰ء کے بعد پیدا ہوئی شاعری اور ادب کا انفرادی اصولوں اور نئی فکری بنیادوں پر جائزہ لینے کا چلن عام نہیں ہو رہا ہے۔ طارق متین اور اسی طرح ان کی نسل کے درجنوں شعرا بلا شک وشبہ ان ہم عصر علمی معذوریوں کا شکار ہیں جس کے سبب ان کے ادبی کارناموں کی پڑتال ادھوری رہ گئی ہے۔

یہ کہنا مشکل تر ہے کہ طارق متین نے اپنی کوئی علاحدہ شعری زبان ایجاد کی ہے۔ صنفِ غزل کا سانچا کئی صدیوں کی کاوشوں کے نتیجے میں اپنے آپ میں کچھ اِس طرح سے متعیّن ہو گیا کہ وہاں انقلاب آفریں تبدیلیوں کے لیے بہت کم امکانات موجود ہیں۔ اختر الایمان نے ایک زمانے میں یہ کہا تھا کہ غالب کی شاعری میں غزل نے اپنا Saturation Point پا لیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس کے بعد غزل میں امکانات نہیں۔ یہیں وہ صنفِ نظم کے لیے جواز پیدا کرتے ہیں۔ اختر الایمان کے خیالات سے اگر پورے طور پر اتّفاق نہ کیا جائے تب بھی اُس جزوی صداقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ صنفِ غزل کی روایت اتنی مستحکم اور معیّن ہے کہ اُس دائرے سے نکلنا کسی بھی شاعر کے لیے مشکل ہے مگر یہ بھی ایک سچّائی ہے کہ اِس صورتِ حال میں بھی بہت سارے شعرا نے محدود پیمانے پر ہی سہی اپنا رنگ ابھارا ہے۔ طارق متین کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اُن کی ٹھوس تربیت کلاسیکی غزل گوئی کے سائے میں ہوئی تھی مگر کثیر المطالعہ ہونے کی وجہ سے وہ جدید اور مابعدِ جدید شعرا کے اندازِ شعر گوئی سے پورے طور پر باخبر تھے۔ شاعری کی ابتدائی دور میں ہی عرفان صدیقی کی شاعری اور مخصوص اسلوب کے وہ حد درجہ قائل تھے۔ عرفان صدیقی کی کئی غزلوں پر اُنھوں نے غزلیں کہہ کر اپنی عقیدت کا اظہار بھی کیا تھا۔ طارق متین نے عرفان صدیقی اور اُس عہد کے دوسرے شعرا کی کوئی نقل تو نہیں کی مگر اُنھیں یہ سمجھ میں آیا کہ اگر اُن کے لہجے میں بانکپن پیدا ہو جائے تو اُن کی شاعری قابلِ توجّہ ہو سکتی ہے۔ غالباً یہ عرفان صدیقی کے مطالعے کا فیض بھی ہو مگر عرفان کی موضوعاتی د نیا سے طارق متین کی فکر قدرے مختلف ہے۔ عرفان کو جو ادبی ماحول ملا، وہ جدید شعرا اور نقّادوں کا ہے۔ طارق متین کو اِس سے مختلف ماحول ملا جس نے اُن کی فکر کے نئے وسائل پیدا کیے۔ جدیدیت کے ابہام کے مقابلے اُن کے یہاں ترقی پسندانہ شفّافیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اِس سے طارق متین کے یہاں ایک فکری صلابت قائم ہوتی ہے۔ اُن کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں نے بھی اِس نظامِ فکر کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ عصری آگہی کی گونج نے اُن کی غزل گوئی کو عرفان صدیقی ہی نہیں، دیگر ہم عصروں

سے بھی الگ بنایا۔ ایسا بہت کم شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے کہ مابعدِ جدید عہد میں موضوعاتی سطح پر ترقی پسندوں کی سماجی فکر کو اپنے لیے رہ نما بنائیں۔ حالاں کہ اِسے آزمانے کے لیے طارق متین نے ترقی پسندوں کے اسلوب کو یکسر نہیں آزمایا۔ اِس سلسلے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چاہتے ہیں کہ تری آنکھ کا کاجل ہو جائیں — تیری نظروں میں رہیں، ایسی ادا چاہتے ہیں
سوچ لو سرحدِ امکاں سے گزرتے ہوئے تم — وقت آواز نہ دے گا کہ ٹھہر جاؤ گے
دہر میں آنے کی کیا خوب سزا پائی ہے — خود تماشا بھی ہوں میں اور تماشائی بھی
جو بھی امکان نمو آج مری خاک میں ہے — یہ کرشمہ تو اسی کا ہے جو افلاک میں ہے
ملکۂ شہر و وفا تیری گلی میں آ کر — صدقۂ جاں بھی نہ دیں ہم تو محبت کیسی

طارق متین کے منتخب اشعار کے حوالے سے گفتگو کر لینے کے بعد ایک ضروری کام یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار سے ان کی چند غزلوں کا مکمّل طور پر جائزہ لیا جائے تا کہ کوئی تخلیق شاعر کے ذہن و دل میں حقیقتاً کس طرح سامنے آتی ہے؟ شاعر کے تخلیقی نظام کو اس کی پوری وسعت میں دیکھنے کا یہ انداز لازمی ہے۔ منتخب اشعار کے کہنے والے شاعر کے یہاں اکثر ذہنی ارتعاشات یا مخصوص انداز کے بکھراو کو پہچاننے میں کئی بار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تخلیقِ شعر کے مرحلے میں شاعر کی تنقیدی بصیرت بڑھ چڑھ کر اپنا کام کرنے لگتی ہے اور قاری یا نقاد کے پاس خار وخس وخاشاک کی سیر کا موقع ہاتھ نہیں آتا۔ غالب نے انتخاب کرنے اور دوسروں سے کرانے کی اضافی مشقت کی تھی مگر نتیجے کے بارے میں خود اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے: شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے۔ شاعر کے دل و دماغ میں اتر نا یوں بھی ناممکنات میں ہے مگر یہ بات لطف سے خالی نہیں کہ کوئی مکمل غزل شاعر کے یہاں کس صورت اور کیفیت میں نازل ہوئی ہے، اسے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ طارق متین کے پہلے مجموعے کی ابتدائی غزلوں میں سے ایک غزل 'میری پرواز ہے اب شمس و قمر سے آگے' جس میں کُل بارہ شعر ہیں۔ یہ غزل اپنے آپ میں عجیب و غریب کیفیت کا اظہار یہ ہے۔ پہلے غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

میری پرواز ہے، اب شمس و قمر کے آگے — کوئی ٹکتا ہی نہیں میرے ہنر کے آگے
جس کی تابانی سے روشن ہوا جاتا ہے وجود — ایک تصویرِ خیالی ہے نظر کے آگے
خواب تو آتے ہیں تعبیر نہیں ملتی ہے — محوِ حیرت ہوں ہر اک خوابِ سحر کے آگے
کتنی آسانی سے کر لیتے ہیں سودا ہم لوگ — اپنے ایمان کا اک لقمۂ تر کے آگے
اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے منزل کا نشاں — میں ہوں سرگرمِ سفر گردِ سفر کے آگے

جانے کیا ہو مری معصوم دعاؤں کا نصیب ۔۔۔ میں ہوں مصروفِ دعا ' بابِ اثر کے آگے
میری حق گوئی سلامت رہی ہرچند کہ تھا ۔۔۔ اک چمکتا ہوا خنجر مرے سر کے آگے
خوف کس بات کا؛ غم کاہے کا؛ الجھن کیسی؟ ۔۔۔ کوئی پیچھے ہے نہ ہم خاک بسر کے آگے
تجھ کو جھکنا ہے تو اللہ کے آگے جھک جا ۔۔۔ کیا ملے گا کسی انسان کے در کے آگے
جاگ اٹھتا ہے جب احساسِ پشیمانی بہت ۔۔۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے بشر کے آگے
کتنے عیّار ہیں لوگ اب سرِ میدانِ عمل ۔۔۔ پیچھے رہ جاتے ہیں خود؛ اوروں کو کر کے آگے
کتنا کامل ہے یقیں اپنا خدا پر طارقؔ ۔۔۔ رکھ دیا کرتے ہیں کشتی کو بھنور کے آگے

شاعر کی پرواز شمس وقمر سے آگے کی ہے۔اس لیے اس کے ہنر کے سامنے کوئی ٹِک نہیں پا رہا ہے۔اسے روایتی طور پر تعلّی ماننا ضروری نہیں۔مطلعے میں ہی شاعر قوتِ پرواز کا تذکرہ کرتا ہے۔اگر اسے انسان اور انسانیت سے وابستہ تصور کر لیں تو آسانی سے عظمتِ آدم کے مضمون سے مطابقت قائم ہو جائے گی۔یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ شاعر نے ابھی چند برسوں سے شعر کہنا سیکھا ہے تو بھلا وہ اپنی شخصیت اور کمالات پر ایسے دعوے کیوں قائم کرے۔دوسرے شعر میں تصویرِ خیال پر توجہ دینا اور یہ اعلان کرنا کہ اسی کی روشنی سے ہمارا وجود منوّر رہے۔سوال یہ ہے کہ کیا کوئی خیالی تصویر ہمارے وجود کو روشن کر سکتی ہے؟ اگر ہاں تو بڑی آسانی سے اس شعر کو عارفانہ گھنی چھانو میسر آجائے گی۔

خواب کی تعبیر کا حاصل نہیں ہو پانا کائنات کا ایک مشہور سوال ہے۔شاعر اعتراف کرتا ہے کہ خواب آتے رہتے ہیں مگر ان کی تعبیر پر پہرے لگے ہوئے ہیں۔صبح کے خواب کے بارے میں یہ سب کو پتا ہے کہ ان کے سچے ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر انسان کے ہاتھ میں وہی ریت پڑی ہوئی ہے جسے وہ ناکامی کے دنوں سے ڈھونڈ رہا ہے۔حقیقتاً اس شعر میں شاعر شکوہ سنج ہے اور اپنی خدمات کا حقیقی صلہ چاہتا ہے۔اگلے شعر میں شاعر ایک حقیقی کیفیت کو اعترافِ بیان اور پسپائی کے طور پر بہ طورِ طنز پیش کرتا ہے کہ ہماری زندگیوں میں کس طرح لقمۂ تر کی اب اہمیت ہو گئی ہے۔فقر و فاقہ کرنے والوں کی بساط اٹھ چکی ہے اور اب ضمیر کا سودا کرنے اور ایمان کو بیچ کھانے میں کون پیچھے رہ رہا ہے۔اس لیے شاعر نے ہم لوگ کا استعمال کرتے ہوئے ایک اعترافِ شکست اور بے چارگی میں یہ بیان حاضر کر دیا ہے کہ ایمان کا سودا کرنے والے ہم میں کم نہیں اور دو روٹیوں کے عوض میں یہ کام کر لیا جاتا ہے۔شاعر چاہتا تو اس مشہور مضمون کو گہرے طنز میں پرو کر پیش کرتا اور معاشرے کو گہرے تیر لگاتا مگر 'کتنی آسانی سے' کا فقرہ جوڑ کر اظہار کی راستی سے بہ حسن وخوبی کام لینا اُسے زیادہ معقول لگتا ہے۔

اس غزل کا پانچواں شعر ایک الگ کیفیت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ زندگی کی جد و جہد اور طولِ سفر کا نقشہ یہاں کھینچا گیا ہے۔ گر دِسفر سے آگے سرگرمِ سفر ہونے کا جو جوش یہاں موجود ہے، اُس کے پیچھے ایک یہ بھی حقیقت ہے کہ منزل کا نشان راوی کو معلوم ہے جس خواب اُس کی آنکھوں میں بسا ہوا ہے۔ یہ سفر اندھیری سرنگ کا سفر نہیں ہے بلکہ اپنی محنت و مشقت، ارادۂ مصمم اور خوابوں کی تعبیر کی تلاش و جستجو سے عبارت ہے۔ یہاں ذوق وشوق کے ساتھ حصولِ آرزو اور اُس کی تکمیل کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ دونوں مصرعوں میں ایک عجیب و غریب تصویریت نظر آتی ہے۔ شاعر کو منزل کا نشان معلوم ہے لیکن اُس کی حفاظت اُس نے آنکھوں میں بسا کر کی ہے۔ اپنے عزائم سے پُر زندگی کے اِس سفر کو شاعر نے مزید ایک تصویر کے ساتھ بیان کا حصّہ بنایا ہے۔ عام طور سے گر دِسفر کی ایک جہت یہ ہوتی ہے کہ اُس کے پیچھے کارواں کی تصویریں کھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں مگر یہاں پختہ ارادہ اور کامرانی کا جوش کچھ اس طرح سے ہے کہ راوی کی طرف سے صرف یہ واضح کیا جاتا ہے کہ گر دِسفر سے آگے منزل کی طرف بڑھنے والے تنہا مسافر کا سفر جاری ہے۔ یہ سفر بے پناہ حوصلوں اور کامیابی کے ساتھ ساتھ قوّتِ بازو کے امتحانات سے عبارت ہے۔

اگلے شعر میں شاعر نے دعائیہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ یہاں مناجات کا رنگ ہے۔ طارق متین کے یہاں بہت ساری غزلوں میں حمد اور نعت کے مفرد شعر اپنے آپ اُس غزل کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہاں بھی مناجات کا رنگ ہے۔ شاعر نے پہلے مصرعے کو ایک حد تک سوالیہ اور ایک سطح پر استعجابیہ رنگ میں پیش کیا ہے اور اپنی معصوم دعاؤں کا نصیب دیکھنا چاہتا ہے۔ دست بہ دعا ہوتے ہوئے نہ کوئی ضدی انسان کا طور یہاں موجود ہے بلکہ شاعر صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ میری دعاؤں کا کیا ہوگا؟ دوسرے مصرعے میں بھی وہ سادہ بیانی قائم رہتی ہے اور شاعر یہ کہتا ہے کہ میں بابِ اثر کے سامنے مصروفِ دعا ہوں۔ باقی کام خدا کا ہے کہ بندے کی دعاؤں کو وہ کس طرح قبولیت کے مدارج تک پہنچنے دیتا ہے۔ شاعر نے گفتار کے اسلوب پر حد درجہ قابو رکھا ہے۔ کیوں کہ اُسے معلوم ہے کہ مناجات میں لب ولہجہ کس انداز کا ہونا چاہیے۔

اِس غزل کا ساتواں شعر طارق متین کے سیاسی و سماجی شعور کی غمّازی کرتا ہے۔ اپنی حق گوئی کے سلامت رہنے کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ زندگی ایسی ملی کہ حق گوئی کا کھرا امتحان بھی اپنے آپ ہوگیا کیوں کہ سر کے سامنے ایک چمکتا ہوا خنجر ہمیشہ تنا ہوا رہا۔ زندگی امتحان ہے اور حق و باطل کی آویزشوں سے نکھر کر انسان کو اپنی منزل تک جانا ہے۔ کئی بار اپنے حقیقی مقاصدِ زندگی کے ساتھ سرگرمِ سفر ہوتے ہوئے طرح طرح کی مزاحمتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اِن راستوں میں کبھی حسین اور کبھی منصور کی طرح اپنی جان کو قربان بھی کرنا پڑتا ہے۔ اِسی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے شاعر فرطِ مسرّت

کے ساتھ یہ واضح کرتا ہے کہ زندگی کے اِس مشکل سفر میں وہ کامران گزرا اور حق گوئی وحق پرستی کو ثابت و سالم رکھنے میں وہ کامیاب رہا۔ جب کہ سچّائی یہ تھی کہ سرقلم کرنے والے خنجر اُس کے سامنے اُس کا امتحان لینے کے لیے ہمیشہ کھڑے رہے مگر وہ اپنی حق گوئی کو سلامت رکھ پانے میں کامیاب رہا۔ ایسے مضامین طارق متین کی شاعری میں بار بار آتے ہیں جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایک مخصوص ترقی پسندانہ فکر سے وہ کبھی دور نہ ہوئے اور اپنے نئے اسلوبیاتی نگارخانے کو صالح انسانی اقدار اور مزاحمت کے موضوعاتی حربوں سے ہمیشہ اعتبار بخشتے رہے۔ اِس بات کی فکر نہیں کی کہ اب ترقی پسندانہ موضوعات اور اُن کے شفّاف اظہار کا وقت نہیں ہے۔ اِس غزل کے اگلے شعر کا انداز بالکل بدلا ہوا ہے۔ صنعت کے اعتبار سے غور کریں تو لف ونشر کا ماحول ہے۔ پہلے مصرعے میں تین باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ خوف، غم اور الجھن کے معاملات کو استفہامیہ رُخ سے دیکھا جا رہا ہے۔ بڑے مختصر تین فقرے ہیں۔ ایک بھی اِضافی مصرعے کا حصّہ نہیں بنا ہے۔ تین سوالات پیدا کر دیے گئے ہیں۔

۱۔ خوف کس بات کا
۲۔ غم کا ہے کا
۳۔ الجھن کیسی

زندگی کی رکاوٹوں کا بیانیہ اِن تین ٹکڑوں سے واضح ہوتا ہے۔ ہر مرحلے میں ہم اِنھی سوالوں کے دائرے میں مبتلا رہتے ہیں لیکن شاعر برمَلا اظہار کرتا ہے کہ آخر کس کا خوف زندگی کو اُس کی سچّی شکل میں آگے بڑھنے سے روک رہا ہے۔ کون سا غم ہے اور کیوں ہے جس سے ہماری زندگی بکھر رہی ہے۔ تیسرا سوال الجھن کے سلسلے سے ہے کہ کچھ کر پانے میں اِن رکاوٹوں کی کوئی جگہ تو نہیں تھی، آخر کس طرح کی الجھن پیدا ہوگئی۔ سوالوں کی اِس یلغار میں آج کے آدمی کی زندگی پسپا ہو رہی ہے اور حقیقی راستے بہت حد تک مسدود ہو چکے ہیں لیکن طارق متین نے اِن تمام طرح کی الجھنوں کا جو جواب اور جواز فراہم کیا ہے، وہ صوفیانہ زندگی سے کشید کیا ہوا ہے۔ کیا سادہ سا مصرع اُنھوں نے لکھا ہے:

کوئی پیچھے ہے نہ ہم خاک بسر ہے آگے

شاعر نے جیسے ہی انسان کو خاک بسر کہا، ساری الجھنیں واضح ہوگئیں۔ زندگی نہ آگے کچھ ہے اور نہ ہی پیچھے۔ ایک شاعر نے پہلے ہی کہہ رکھا ہے:

سامان سو برس کے ہیں، پل کی خبر نہیں

طارق متین بھی کہتے ہیں کہ جب خاک بسری آ جائے گی تو مٹّی کے پتلے کو بھی اپنی حقیقت سمجھ

میں لازمی طور پر آ جائے گی۔ جب سب کو اُسی کی طرف جانا ہے جہاں سے وہ آیا ہے تو اتنا شور اور ہنگامہ، اتنے سوال و جوابات اور اِس قدر رسّا کشی کیوں ہے۔ طارق متین نے تصوّف کی اصطلاحوں کو نہیں آزمایا ہے بلکہ اپنی مخصوص لفظیات میں ہی صوفیانہ معنوں کی سمائی کر کے ایک فطری فضا پیدا کر دی ہے۔ خود کو خاک بسر کہتے ہوئے انسان کو اُس کی بنیاد پر لا کھڑا کر دیا۔ ردیف میں ' آ گئے' لفظ کی گردان ہے مگر اِس کے ساتھ اِس کی ضد پیچھے کا استعمال کر کے اُنھوں نے صرف ایک صنعتی کیف کا اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ اِس کے بہانے زندگی کی حقیقی بنیادوں تک ہمیں پہنچا دیا ہے۔

یہ عجب اتّفاق ہے کہ اِس غزل میں حمد وثنا اور مناجات کے کئی شعر غزل کے سانچے میں ڈھل کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ نوّیں شعر میں بھی ایک نیم مبلغانہ خود آ گہی ہے کہ اگر انسان کو کہیں جھکنا ہے تو اُسے صرف اللہ کے سامنے جھکنا چاہیے کیوں کہ جن توقعات کے طفیل وہ دنیا کی چوکھٹوں پر بار بار جھکتا ہے، حقیقتاً وہاں سے کچھ ملتا نہیں ہے۔ اِس لیے شاعر کا مشورہ درست ہے کہ اگر سر جھکانا ہی مقصود ہے تو غیر اللہ کے بجائے سیدھے خدا کے سامنے جھکنا چاہیے۔ دنیا کی بھیڑ کا حصّہ بننے میں انسان جو کھوتا اور پاتا ہے، اُس کا اظہار دسویں شعر میں ہوا ہے۔ دوڑتی بھاگتی دنیا میں کب ہم نے دوسرے کا حق مارا یا کب اپنے حق سے زیادہ حاصل کرنے کے درپے رہے، یہ اکثر قابلِ غور بات نہیں ہوتی ہے۔ نام نہاد کامیابی میں معیارِ اخلاق کو کون دیکھے مگر طارق متین اپنے اِس شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ایک ایسا لمحہ ضرور ہمارے رؤ بہ رؤ ہوتا ہے جب احساسِ پشیمانی جاگ اٹھتا ہے اور انسان اپنا حقیقی احتساب کرتا ہے۔ شاعر کو اِس بات کا یقین ہے کہ اِس دنیا میں انسان بھلے پاتال تک پہنچ جائے مگر اُس کا ضمیر ایک بار ضرور جھنجھورتا ہے۔ اُس احساسِ پشیمانی کو شاعر نے بڑی اہمیت دی ہے۔

گیارھویں شعر میں میدانِ جنگ کا منظر بیان ہوا ہے اور قوم کی عیّار صفت طبیعت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح میدانِ عمل میں جب مقابلہ کرنا ہوتا ہے یا اپنی جان کی نذر پیش کرنی ہوتی ہے، اُس وقت لوگ خود پیچھے رہ کر دوسروں کو آگے کر دیتے ہیں کہ جان اُن کی جائے اور خود بچے رہ جائیں۔ دنیا کی اِس عیّاری اور غلط کاری پر صاف لفظوں میں طارق متین نے اظہار کیا ہے۔ اِس غزل کا مقطع نہایت انوکھا ہے جسے بھی کہیں نہ کہیں خدا سے مکالمہ یا حمد کے بیانیہ سے قریب تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے مصرعے میں شاعر نے خدا پر اپنے کامل یقین کا اظہار داد طلب نظروں سے کیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں بیان کی سطح اچانک مقامِ ارفات تک پہنچ جاتی ہے۔ سادگیِ زبان کے اوصاف کے ساتھ مصرعۂ ثانی یوں سامنے آتا ہے:

رکھ دیا کرتے ہیں کشتی کو بھنور کے آگے

طارق متین نے اپنی دیوانگی کی کیفیت کا بیان کیا ہے۔آخر کوئی بھنور میں اپنی کشتی کو کیوں کر ڈالے گا؟اِس کے ساتھ راوی کو اِس بات کا یقین ہے کہ زندگی طرح طرح کے امتحانات کا نام ہے۔ اِسی میں ایک امتحان یہ بھی ہے کہ بھنور کے بیچ میں راوی اپنی کشتی ڈال دیتا ہے۔اُسے اِس بات کا یقین ہے کہ اگر حیات لکھی ہوئی ہے یا خدا نے کچھ اور دن کی زندگی مقرر کر رکھی ہے تو وہ کیوں بھنور کی نذر ہو جائے گا۔ یہ شعر خدائی کا اقرار اعتماد کا مظہر ہے۔ بالعموم طارق متین کی شاعری میں ایمان وایقان کے شواہد بطنِ شعر میں پیوست نظر آتے ہیں۔ وہ فیشن پرست لامذہبیت کے دائروں سے اکثر وبیش تر دور ہی رہتے ہیں۔

اِسی طرح طارق متین کے دوسرے مجموعۂ کلام 'قندیلِ ہنر' سے 'اور کچھ بھی نہیں اس کے سوا چاہتے ہیں' یا 'غزالِ درد' کی غزل 'وسعتِ دشت میں مانا کہ اتر جاؤ گے' جیسی غزلوں کا مکمّل تجزیہ کیجیے تو اِس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ طارق متین کے یہاں حشو وزوائد اور برائے بیت اشعار بہت مشکل سے ملتے ہیں۔اشعار کی بھیڑ لگانے اور قادر الکلامی کے لیے دادِ سخن پانے کی تمنّا میں شاعری کو ایک میکانیکی تجربہ بنا دینے میں طارق متین کا کبھی یقین نہیں تھا۔طارق متین نے اپنی شاعری کو کلاسیکی بنیادوں پر سجایا اور عصری تقاضوں کے زیرِ اثر اپنی شاعرانہ شخصیت کی شیرازہ بندی کی۔ بے وقت موت اور اُن کی طویل بیماری نے بھی سرمایۂ سخن کو جمع کرنے میں ایک رکاوٹ کا کام کیا۔ ۲۰۱۶ء میں اشاعت پذیر 'ریاضتِ نیم شب' میں ۲۰۵ رغزلیں شامل ہیں۔کم از کم دو درجن غزلیں اُن کی اِس کے بعد عالَمِ وجود میں آئیں۔تین دہائیوں کی مشقِ سخن کے اعتبار سے یہ سرمایہ کم نہیں ہے۔طارق متین کی غزل گوئی پر متعدد نقّادوں نے اُن کے ادبی مقام کے تعلّق سے سنجیدہ کاوشیں کی ہیں۔۱۹۹۰ء کے بعد ابھرنے والی نسل میں طارق متین واقعتاً ایک توجّہ طلب شاعر کے طور پر ہمیں یاد آتے رہیں گے۔

◀ ● ▶

Department of Urdu
College of Commerce,
Arts and Science, Patna
Email: safdraimamquadri@gmail.com
Mob & WhatsApp: 9430466321

● پروفیسر لطف الرحمن

طارق متین کی شعری کائنات

طارق متین کی شاعری عصر حاضر کا منظر نامہ بھی ہے،غزلیہ روایت کی تعبیر نو بھی اور ان کی شخصیت کا بے محابہ مخلصانہ اظہار بھی۔ یہ اجمال تفصیل طلب ہے۔ طارق متین کی شعر گوئی ابھی منزل شباب میں ہے خارجی سطح پر بھی اور داخلی اختیار سے بھی۔یعنی ان کا مشق سخن گذشتہ تقریباً بیس برسوں پر محیط ہے۔اس جہت سے وہ اپنے فن کی جوانی کے سنگین مرحلوں سے گزر رہے ہیں۔دوسری طرف ان کے یہاں فکر وخیال اور جذبہ و احساس میں ایک کائناتی ہم آہنگی نظر آتی ہے،جس میں کوئی تصنع ،تکلف، بناوٹ یا ظاہر داری نہیں ہے۔ان کا تخلیقی شعور خلوص، بے ساختگی ،سچائی، دروں بینی پر مبنی ہے۔فن کے ساتھ ان کا رویہ بہت ہی مخلصانہ اور بے محابہ رہا ہے۔بعض ناقدین ادب کا خیال ہے کہ فن شخصیت سے گریز کا نام ہے اور بعض لوگ مصر ہیں کہ فن شخصیت کے اظہار سے عبارت ہے۔معاملہ کچھ بھی ہو اتنی بات یقینی ہے کہ انکشاف حقیقت ہو کہ اخفائے راز فن بہر طور فنکار کی داخلیت کے ارتقاء کی داستان ہوتا ہے۔شرط یہ ہے کہ فنکار اظہار و بیان اور جذبات و محسوسات کی یک رنگی وہم آہنگی اور امتزاج کے نازک مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ گزر جانے کی قدرت رکھتا ہوں۔طارق متین کے یہاں ایسی مثالیں جا بجا نظر آتی ہیں۔جوان کی داخلیت کی ارتقاء کی کامیاب نمائندگی کرتی ہیں مثلاً

مری خانہ خرابی میں ہے میرا عشق روشن
سو اپنے آپ کو برباد رکھنا چاہتا ہوں

مجھے وحشت نے وہ اعجاز بخشا ہے کہ خود کو
در و دیوار سے آزاد رکھنا چاہتا ہوں

ہم باغیوں سے ہو نہ سکا اور کچھ مگر
فتوی فقیہ شہر کا چلنے نہیں دیا

بحر ظلمات کی سنسان سیاہ راتوں میں
ایک مٹھی تیری یادوں کا اجالا ہے بہت

مثل گل حلقہ یاراں میں مہکتے رہنا
بزم اغیار میں پتھر کا جگر ہو جانا

شام سے صبح کیا صبح سے پھر شام کیا
ہم نے اس عمر گریزاں کو خوش انجام کیا

اپنے اجداد کی عظمت کا حوالہ چھوڑو
یہ بتاؤ کہ تمہاری کوئی پہچان ہے کیا

ہم کڑی دھوپ میں جل کر نہیں تھکتے طارقؔ
ایک آنچل کی گھنی چھاؤں ہے ستانے کو

ایک سے حال میں کچھ بھی نہیں رہتا طارقؔ
جو حقیقت تھا وہی خواب ہوا جاتا ہے

غموں کی دھوپ میں لب پر تبسم یہ جینے کا ہنر دیکھا تو جائے

یہ شعار اس بات کے بھی شاہد ہیں کہ طارق متین کی شاعری سنگ مرمر سے تراشا ہوا کوئی حسین مجسمہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک دھڑکتا ہوا پیکر رکھتی ہے، جس میں حرکت وحرارت بھی ہے، نزاکت ونفاست بھی، حسن وجمال بھی اور گداختگی ورعنائی بھی۔ فن میں یہ کیفیت تو اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب فنکار کا داخلی وجود اپنی عصری زندگی اور تمام تہذیبی وثقافتی قدروں سے تخلیق کسی نازک لمحوں میں یک جاں دو قالب ہو جاتا ہے اور من دیگرم تو دیگری کا فرق محو جاتا ہے۔ طارق متین پر تخلیقی مرحلوں میں ایسے لمحے روشن ہوئے ہیں جو ان کو میر و غالب کی عظیم ترین روایتوں کی امین نئی نسل میں قابل قدر اہمیت کا حامل بناتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

مندمل ہو گیا جو زخم وہ ناسور ہوا یہی بہتر ہے کہ پھر سے وہ ہرا ہو جاتا
مجھ کو روشن کیا قندیل ہنر نے طارق ورنہ میں سب کا مسافر تھا فنا ہو جاتا
اپنی یہ شان فقیری بھی دکھا دی ہم نے جس نے معتوب کیا اس کو دعا دی ہم نے
زندگی تیری بدولت ہی تو پامال ہوں میں تو نے پستی میں بلندی سے اتارا ہے مجھے
گو وہ منکر بھی نہیں ہم سفری کے طارق راستہ اپنا مگر سب سے جدا چاہتے ہیں
فاصلہ کم نہ ہوا روز ازل سے اب تک عجز درویش میں اور سطوت سلطانی میں
سخت کوشی کے ہم عادی تھے سو اپنی طارق مشکل اور بڑھیں راہ کی آسانی میں

ان اشعار میں حسن کا رانا ریاضت بھی، تپ اور تپسیا بھی اور فن کی سادھنا بھی۔ جس نے طارق متین کے شعری مجسموں کو قوت گویائی اور حرکت وحرارت سے اس طرح معمور کر دیا ہے کہ وہ زندہ وجود کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ تخلیقِ فن میں یہ کامیابی بے حد اہم ہے۔ داخلی تجربات ومحسوسات اور اظہار و بیان میں قطبین کی دوری حائل ہوتی ہے۔ اس بعد کو صرف ایک مخلص تخلیقی فنکار ہی آسانی سے پاٹ سکتا ہے ورنہ بسا اوقات تو تخلیق فن کے نام پر بھی تجریدی زبان واسلوب ہی کے ذریعہ اپنے تجربات ومحسوسات کو پیش کرنے کی کوششیں ملتی ہیں۔ لیکن طارق متین کے یہاں موضوعی تجربات زندگی کو پیش کرنے کے لئے حساس تخلیقی رویہ اظہار نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں طارق متین کا اسلوب تخلیقی اور مخصوص زبان کے رموز ونکات کا پروردہ ہے۔ جس نے ان کے شعری تجربات میں سادگی اور طرحداری کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اور اس جہد سے وہ غالب سے زیادہ میر کی امت نظر آتے ہیں مثلاً

دولت غم کے سوا کیا تھا مرے دامن میں بادشاہوں کی طرح وہ بھی لٹا دی صاحب
ایک لمحہ بھی تری یاد سے خالی نہ گیا ہم نے معمول شب و روز ترے نام کیا

غالب کو سادگی و پرکاری کا وہ ہنر آتا تھا جو بےخودی و ہشیاری کے امتیاز کا حامل تھا تغافل اور جرائت آزمائی کا کھیل بھی آسان نہیں، لیکن اس کے لئے تو عرفان ذات کے اس کرب سے دوچار ہونا ناگزیر ہے یہاں فنکار بےساختہ کہہ اٹھتا ہے:

ایں بندہ خداوند نداشت

لیکن یہاں پر معاملہ یہ ہے کہ شرح ستم ہائے زمانہ کے باوجود طارق متین ایک خدا بھی رکھتے ہیں جو ان کی داخلی شخصیت کی ایک بڑی سچائی ہے اور جس کا اظہار جابجا ہوا ہے۔

مرے مولا میں تجھ کو یاد رکھنا چاہتا ہوں دل اپنا نور سے آباد رکھنا چاہتا ہوں
یہ کرشمہ تو اسی کا ہے جو افلاک میں ہے جو بھی امکان نمو آج مری خاک میں ہے

غالب اور میر کے ذکر سے یہ مقصود نہیں کہ میں غزل کے ان اساطیر سے طارق متین کا موازنہ کر رہا ہوں۔ بلکہ طارق متین کی تخلیقی شخصیت، ذہنی رویے اور باطنی کیفیت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ جو ایسے چراغ کی حیثیت رکھتی ہے جس سے آنے والی نسلیں اپنے چراغ روشن کرتیں ہیں اور اپنی انجمنوں کو قندیل فراہم کرتی ہیں۔ ''قندیل ہنر'' کا خالق طارق متین بھی ایک ایسا ہی فنکار ہے جو عصر حاضر کے ملحدانہ ماحول اور معاشرے میں بھی داخلی تنظیم و انضباط سے بہرہ مند ہے اور اپنے تمام تر زورِ جنوں کے باوجود پاس گریباں سے بےخبر نہیں ہے:

در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست با چنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم

طارق متین کے یہاں اقبال کی یہ روایت بھی کارفرما نظر آتی ہے اور اس جہت سے میر و غالب اور اقبال کی روایتوں کو نئی سمت و جہت سے آشنا کرنے والے ان تمام قابل ذکر فنکاروں سے طارق متین کی نیازمندی رہی ہے جنھوں نے زخموں کہ یہ امانت ایمانداری کے ساتھ اگلی نسلوں تک پہنچانے کی مخلصانہ سعی کی ہے:

ہم یہ زخموں کی امانت دور تک لائے بہت اب یہاں سے اور آگے اور لے جائے کوئی

اب وہ فیض ہوں کہ فراق، جمیل مظہری ہوں کہ اجتبیٰ رضوی، جگر ہوں کہ حسرت و فانی، خلیل الرحمٰن اعظمی ہوں کہ بانی غرض کہ ایک پوری نسل جس نے گزشتہ صدی کے تغزل کی روایت کو نئے آفاق و جہات سے آشنا کرتے ہوئے پوری کمیت و کیفیت کے ساتھ بیسویں صدی کے آخر میں نئی نسل کے حوالے کیا تھا اس پوری نسل سے گہری شناسائی کی جھلک طارق متین کے کلام میں موجود ہے۔ جو ان کے وسیع مطالعے اور حساس تخلیقی ایجاب و قبول اور استخراج و ترمیم کی کی صلاحیت کو روشن کرتی ہے۔ غزل میں زندہ پیکر تراشی ظاہر ہے کہ اس فنی ریاضت اس تپسیا اور سادھنا کے بغیر ممکن نہیں۔:

اٹھا چکے ہیں عبادت میں جس کو اہل خدا ۔۔۔۔۔ تپسیا کا وہی دکھ مرے ہنر میں رہا

طارق متین کا تخلیقی سفر تو ابھی صرف دو دہائیوں پر محیط ہے انہیں بہت لمبے جانکاہ مرحلۂ احساس واظہار سے گزرنا ہے۔ جس فنکار کا آغاز اتنا بھرپور ہے اس کا اختتام یقیناً انفرادیت کی منزلوں سے ہمکنار ہوگا جو عصریت و ابدیت کی سازگار ہم آہنگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ طارق متین کے یہاں ایسے امکانات جا بجا روشن نظر آتے ہیں۔

شہر کی لعنت یہاں تک آ گئی ۔۔۔۔۔ گاؤں میں بھی کار خانہ ہو گیا
کاروباری ہوگئی دنیا بہت ۔۔۔۔۔ ہر تعلق تاجرانہ ہو گیا
بڑی منھ زور ہیں پاگل ہوائیں ۔۔۔۔۔ پرندہ شاخ پر سہا ہوا ہے
نرالی ہے طلب دنیا کی طارقؔ ۔۔۔۔۔ جسے بھی جو ملا ہے کم ملا ہے

یہ اشعار فی نفسہٖ اس بات کی شاہد ہیں کہ طارق متین نہ صرف یہ کہ نئے منطقوں کی تلاش میں رہتے ہیں بلکہ زندہ تخلیقی استعاروں کی زرخیزی ان کی اپنی انفرادیت ہے۔ ان کے یہاں اسری حسیتوں کی متعدد کیفیتوں کا احساس واظہار ان کی ذہنی وسعت اور نئے تخلیقی منظر نامے کا ثبوت ہے۔ موجودہ عہد کے تہذیبی انتشار میکانکی تمدن اور ثقافتی جارحیت نے فرد کو داخلی جلاوطنی کا اسیر بنا دیا ہے ایسے جانکاہ المیوں منضبط کلاسیکی معاشرہ محفوظ تھا۔ جس نے شاعروں اور ادیبوں کے پاؤں کے نیچے کم ازکم ان کی اپنی زمین تو رہنے دی تھی لیکن عہد حاضر نے نہ صرف یہ کہ موجودہ نسل کے پاؤں کے نیچے کوئی زمین نہیں رہنے دی بلکہ اسے کی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح خلا میں معلق چھوڑ دیا ہے۔

عصر حاضر کی برق رفتار زندگی کے تقاضوں نے تمام داخلی اور انسانی رشتوں سے آج کے انسان کو تقریباً محروم کر دیا ہے۔ چنانچہ نئی نسل داخلی کشمکش و کشائش کے اس مرحلے پر ہے جہاں اسے اپنی حقیقی وجود کے حصول کے لئے صبر آزما آزما قربانیوں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ حساس فنکار زمانے کی سطحیت، پیچیدگیوں اور ذات کی زیاں کو برداشت نہیں کرتا وہ اپنے حقیقی امکانات سے بے تعلق رہ کر ایک مصنوعی وجود کو انگیز نہیں کر سکتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ غیر محفوظیت اور بے جڑی سے عبارت ہے۔ آج فرد کے باطن میں جو ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جس نے روحانیت اور ایمان وایقان سے اسے محروم کر دیا ہے اور جسے پر کرنے میں موجودہ میکانکی سماج ناکام ہے۔ اس خلا کو صرف جذبہ وجدان ہی کے ذریعے پر کیا جا سکتا ہے لیکن مذہبی رسمیت اور روحانی خانہ پوری نے نئی نسل کو اس سے بھی محروم کر دیا ہے جس کی وجہ سے ترسیل وتفہیم ناممکن نظر آنے لگی ہے۔ نئی نسل تشکیک، ناامیدی، خوف اور کشمکش کی اسیر اور چونکہ خاندانی نظام منتشر ہو چکا ہے اس لئے فرد اب جنس اور شئے کی سطح پر جینے لگا ہے۔ ہمہ جہت انتشار و بحران اور جنگ و جارحیت نے اس پورے عہد کو بیمار بنا دیا ہے۔ یعنی

انسانی زندگی کے کی تحقیر و تذلیل نے وسیع پیمانے پر ایک کھوکھلی نسل کو فروغ دیا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان کی داخلیت مریضانہ ہو چکی ہے۔ اس پس منظر میں طارق متین کے یہاں داخلیت کا ارتقا صحت مند قدروں کا غماز ہے اور یہی وجہ ہے کہ عصری حیثیتوں کی ترجمانی کے باوجود ان کے یہاں ابہام، انتشار، لفظی بازیگری اور تکلف وتصنع کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ طارق متین کی شاعری نئے تخلیقی تناظر میں نئے لسانی اظہار کا خوبصورت ہنر رکھتی ہے۔ ان کی شاعری واضح طور پر یقین واعتماد اور مثبت تہذیبی قدروں پر مبنی ہے۔ جس نے ان کو سکہ بند ادبی فیشن کا شکار ہونے سے بچالیا ہے جو ان کی داخلی بصیرت کا ثبوت ہے اور یہ ان کی ایک اہم انفرادیت ہے۔

ہمیں بے کارمت جانو کہ ہم سے　　　میان ایوان شاہی ہل رہا ہے
جنوں شوق کی جو انتہا ہے　　　ہر اک رستہ اسی سے پھوٹتا ہے

طارق متین کے یہاں ہنگامی مسائل عصری سنجیدگی اور فنکارانہ لذت مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ محض فیشن کے طور پر عصری مسائل کو نہیں چھوتے بلکہ ایک دردمند تخلیقی فنکار کی حیثیت سے عصری شعور کی سطح پر روشن کرتے ہیں یہ فنکارانہ طریقہ کار داخلی اعتبار اور ایقان کا زائیدہ ہے اور یہ سعادت بہ زور بازو حاصل نہیں ہوتی۔ طارق متین انگریزی ادب کے اسکالر رہے ہیں۔ انہوں نے انگریزی جمالیاتی روایت سے وسیع پیمانے پر استفادہ کیا ہے لیکن ترسیل وابلاغ کی منزلوں میں انہوں نے غزل کی کلاسیکی رچاؤ کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس لئے لفظوں کے استعمال و انتخاب میں ان کے یہاں ایک مخصوص تہذیب کا احساس ہوتا ہے جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان کی شاعری فارمولہ، فیشن پرستی یا سکہ بند نئے پن کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ ان کے یہاں روایت وجدت میں ایک معتدل امتزاج ملتا ہے جس نے ان کو اپنی نسل کا ایک معتبر نمائندہ بنا دیا ہے۔ کلام کی جدت، ندرت، نیا پن، انوکھا پن بہر جیت ان کے اپنے تجربات ومحسوسات کے لئے اسلوب کی انوکھی پیکر تراشی کرتے ہیں۔ لفظوں کی حقیقت تک رسائی کا یہ ہنر طارق متین کو آتا ہے۔ ان سے ان کی نسل کے کم لوگ واقف ہیں اور اس کا واحد سبب مغربی جمالیات اور مشرقی شعریات سے ان کی معتبر آگہی ہے جس نے اعتبار ووقار کے ساتھ ان کو تازہ ترین غزلیہ روایت کا ایک نمائندہ فنکار بنا دیا ہے۔ اتنی کم مدت ریاضت میں اس منزل تک پہنچ جانا انی کی تخلیقی بصیرت وبصارت کا ثبوت ہے۔

● پروفیسر علیم اللہ حالی

طارق متین میری نظر میں

میں محسوس کرتا ہوں کہ غزل کی صنف میں نئی اور پرانی کوئی تقسیم نہیں ہوسکتی ہر اچھا شعر نیا نیا سا لگتا ہے اور ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ جو لوگ نئے پن کی تلاش کرتے ہوئے اظہار و بیان کے عجوبہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہیں نئی نئی ترکیبیں تلاش کرتے ہیں۔ نہ آشنا اور نامانوس لہجہ اختیار کر کے اپنی جدت طرازی کا ثبوت فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل جیسی لطیف و نزیف صنف سے ناآشنا ہیں۔

غزل بنیادی طور پر حدیثِ دل ہوتی ہے یہ دل سے نکلتی ہے اور قاری و سامع کے دل تک پہنچ جاتی ہے اس میں الفاظ و بیان کی ہنر مندی بسا اوقات اس کی روح کی قاتل بن جاتی ہے۔ یہ تصنع تو کیا تکلف بھی برداشت نہیں کرتی۔ یہ خارجی تجربات کی بھی متحمل نہیں ہوتی۔ یہ شعوری طور پر عصری موضوعات کی پیشکش سے بھی ناخوش رہتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ غزل موضوعات سے زیادہ محسوسات سے اپنا رشتہ استوار رکھتی ہے۔ غزل اس وقت نہ غزل بننے لگتی ہے جب شعر بحر و وزن اور قافیہ و ردیف کے چوکھٹے میں شعوری طور پر پر موضوعات پرونے کی کوشش کرتا ہے۔ ''ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں۔'' والا نسخہ ممکن ہے مرثیہ نگاری کے لئے کارگر ہو تو ہو لیکن غزل میں یہ صنعت کاری ہرگز فائدہ نہیں پہنچاتی۔

میں یہ باتیں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ ادھر عام طور پر غزل گوئی کا جو لہجہ سامنے آ رہا ہے اس میں اس بے ساختگی بے محابا پن بے اختیاریت، برجستگی اور شدتِ احساس کی کمی کھٹکتی ہے جس سے غزل کے فن کی توسیع ہوسکتی ہے۔ غزل اساسی طور پر بے ریا اور حد درجہ احساس فنکار کی وراثت ہے، یہاں کسی طرح کی فریب کاری ممنوع ہے۔ آج غزل گویوں کی بھیڑ بھاڑ میں بہت کم ایسی شخصیتیں ملتی ہیں جو غزل کے صحیح تیور سے آشنا ہوں جو میرؔ اور ناصر کاظمی کے تخلیقی تیور کا عرفان رکھتے ہوں، جن کے اشعار تعلق سے زیادہ تأثر کے راستے پر آگے بڑھتے ہوں، جن کے اشعار اندرون کی سچائیوں تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ طارق متین کی غزلیں پورے طور پر اس معیار کی حامل ہو چکی ہیں۔ جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی تخلیق کا رخ غزل کی سچی شاعری کی طرف ہے جو ہمیشہ قائم

رہتی ہے اور جو غزل کو نہ غزل نہیں بننے دیتی۔ یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ غزلیہ شاعری تہ داری کی حامل ہوتی ہے غزل کا شعر Multi Dimensional ہوتا ہے۔ یہ وضاحت وصراحت نہیں بلکہ علامت واشارات سے متصف ہوتی ہے متصف ہوتی ہے۔ یہ ساختہ نہیں بلکہ بے ساختہ ہوتی ہے۔ اور فنکار کی داخلی کیفیت کی اور فنکار کی داخلی کیفیت کی ہے اور فنکار کی داخلی کیفیت کی ترجمان ہوتی ہے یہاں فنکار کا لہجہ مادی اور خارجی ہونے کے باوجود ماورائی ہوتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں حقیقت اور مجاز ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ طارق متین کی غزلوں میں یہ خصوصیات موجود ہیں۔ میں یہ بھی واضح کر دوں کہ سچا فنکار غزل کے اشعار میں ان خصوصیات کے اظہار کے لیے کوئی کاوش نہیں کرتا۔ طارق متین کی طبع رواں، محنت وریاضت اور کد وکاوش کے بغیر اس لہجے کی گرفت میں بہت حد تک کامیاب ہے۔

طارق متین کی شاعری میں موضوعات کے سلسلے میں کسی سراغ رسانی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے اشعار سوچے ہوئے موضوعات سے متشکل نہیں ہوتے بلکہ یہ احساسات کے خلائی اور ماورائی عمود سے اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ان کے مندرجہ ذیل اشعار پر غور کیجئے۔

ایک ہلچل تو رہی عشق کے دریا میں میاں
ہم اگر پار نہ ہو پائے شناور تو رہے

کشتیِ دل کو ڈبو دے نہ کہیں موجِ بلا
اپنے اُمڈے ہوئے جذبات سے خوف آتا ہے

میری کی طرف گرفتارِ بالا ہو جاتا
کاش اس عہد سخن کا میں خدا ہو جاتا

ہر لمحۂ موجود میں خوشبو سی بسی ہے
کس پیکرِ گلفام سے رشتہ ہے ہمارا

جیتے ہیں اسی آس میں ہم اہل محبت
امروز ہے اوروں کا تو فردا ہے ہمارا

نیک و بد روز ازل سے ہی صف آرا ہیں مگر
یار یہ معرکہ اب بھی تروتازہ ہے بہت

تو پھر یہ عیش فراواں بھی کیا کرے لے کر
ہمیں جب اپنا تشخص سی پارہ پارہ ملے

غموں کی دھوپ میں لب پر تبسم
یہ جینے کا ہنر دیکھا تو جائے

مجھ کو بے رحمیٔ حالات سے خوف آتا ہے
دن گذر جائے تو پھر رات سے خوف آتا ہے

نہ کوئی شور نہ ہنگامہ نہ کوئی رونق
میری آنکھوں کی طرح شہر بھی ویران ہے کیا

جس سے ہم حلق سے تر کرتے تھے وہ چشمۂ آب
دیکھتے دیکھتے زہر آب ہوا جاتا ہے

ان اشعار کی قرأت تازہ کار اور خوشگوار لہجے کی یافت کا پتہ دیتی ہے۔ یہاں فنکار اپنی ذات سے لے کر کائنات کے متعدد مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن طارق متین کے لہجے میں عام طور پر اس بات کا شائبہ ملتا ہے کہ ان کے یہاں موضوعات ثانوی منزل پر نظر آتے ہیں جو خصوصیت واضح اور ظاہر ہے

وہ ان کا احساسی غلبہ ہے۔ یہ اور ان جیسے بہت سے اشعار میں طارق متین کے یہاں اندرون کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنے آپ میں اتر کر خارجی مسائل سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ غزل کا یہ لہجہ سچی اور اصلی تخلیقیت کا اشاریہ ہے۔ طارق متین کے لہجے کی یہ پر کشش انفرادیت ان کے پہلے مجموعے کے مقابلے میں پیش نظر دوسرے مجموعے ''قندیل ہنر'' میں زیادہ روشن ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے عمودی سفر پر گامزن ہے۔ اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے۔

◂◂ ● ▸▸

Fakhruddin Plaza
Langer Toli
Patna-800004
Mob: 6122300144

فیاض احمد فیضی کی کتابیں

نام کتاب: بال کی کھال
صنف: انشائیہ
سن اشاعت : ۲۰۲۴(دوسرا ایڈیشن)
صفحات: ۲۶۴ قیمت: ۳۵۰/روپے

نام کتاب: خندہ زیر لب
صنف: انشائیہ
سن اشاعت: ۲۰۲۴
صفحات: ۲۲۴ قیمت: ۳۰۰/روپے

نام کتاب: قندوزقند
صنف: انشائیہ
سن اشاعت: ۲۰۲۴(تیسرا ایڈیشن)
صفحات: ۱۸۴ قیمت: ۳۲۵/روپے

نام کتاب: قندمکرر
صنف: انشائیہ
سن اشاعت: ۲۰۲۴(دوسرا ایڈیشن)
صفحات: ۱۸۴ قیمت: ۳۲۵/روپے

ملنے کا پتہ :
W22/Flat 2902, Case Greenwood
"B" Lodha Amara, Kolshet Road, Thane (West) - 400607

● ڈاکٹر منظر اعجاز

مشک سخن۔ایک مطالعہ

اردوغزل کے تازہ ترین افق پرطارق متین کی حیثیت ایک ایسے تابناک ستارے کی ہے جس کی تجلیاں شعاعِ مہر کو آئینہ دکھاتی ہیں جب کہ ان کی تخلیقی میلان کا وطیرہ ان کی زبان میں کچھ اور ہی ہے ۔

تختِ شاہی کی رعونت کو مری مسندِ خاک   یوں بھی ہوتا ہے کہ آئینہ دکھا دیتی ہے

یہ تیور اس جواں سال اور خوش فکر شاعر کا ہے جس کے مشق سخن کی مدت تیرہ چودہ برسوں سے زیادہ نہیں۔طارق متین مسلسل اور متواتر غزلیں کہتے اور ہندو پاک کے موقر و معتبر ادبی جرائد میں چھپتے آرہے ہیں۔

میں طارق متین سے پہلی بار ۳/مارچ ۱۹۹۲ء کے راج بھون (پٹنہ بہار) کے آل انڈیا مشاعرہ میں متارف ہوا تھا جس میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی ، اختر الایمان، مجروح سلطان پوری، خمار بارہ بنکوی، والی آسی اور سہر یار جیسے بین الریاستی شعرا کے علاوہ صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر ظفر حمیدی اور ڈاکٹر سید مرتضٰی اظہر رضوی کے علاوہ شہر عظیم آباد سے تعلق رکھنے والے شعرا میں کلیم عاجز برصغیر ہندو پاک کے مشہور مزاحیہ شاعر رضا نقوی واہی بھی شریک تھے۔علاوہ ازیں پٹنہ کے شینئر سیٹی ایس۔پی امریک سنگھ ممبران پوس ہی وردی میں اپنی صاف ستھری غزل کے ساتھ موجود تھے اور انھوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اپنی غزل سنائی تھی۔شرکائے مشاعرہ میں خاکسار بھی تھا۔اس کی افتتاح بہار کے سابق وزیراعلٰی جناب لالو پرشاد یادو جی کے ہاتھوں ہوا تھا۔سردار جعفری صاحب صدر مشاعرہ تھے اور ناظم مشاعرہ جناب شفیع مشہدی تھے جو افسانہ نگار ہونے کے ساتھ شاعر بھی ہیں۔

بہر حال طارق متین کا یہ دور اٹھان کا تھا۔وہ ہر چند کے اپنی غزلیں ترنم سے نہیں پڑھتے لیکن ان کے اشعارِ غزل اور پڑھنے کے انداز سے مشاعرہ قدرے اٹھ گیا تھا۔اسی سلسلے کا دوسرا مشاعرہ دوسرے ہی دن مقامی نرتیہ کلا مندر میں تقریباً ان ہی شرکا کے ساتھ منعقد ہوا تھا۔طارق متین کے ساتھ ناچیز بھی تھا اس مشاعرہ کا افتتاح عالی جناب عزت مآب ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب (سابق اور موجودہ گورنر، بہار) کی عالمانہ اور سحر انگیز تقریر سے ہوا تھا۔مشاعرے دونوں فلاپ رہے لیکن طارق متین دونوں مشاعروں میں کامیاب رہے تھے اور جیسا کہ قبل عرض کیا گیا ان کی غزل ترنم کی پٹری پر دوڑنے والی ریل نہیں ہوتی ،اس لئے ان کی کامیابی کا

سہرہ بہرحال ان کے اشعار کے سر ہوتا ہے اور پڑھنے کا انداز آٹے میں نمک کی طرح ذائقہ اور لطف پیدا کر دیتا ہے۔ تب سے اب تک طارق متین پڑھتے رہے اور میں سنتا رہا، وہ چھپتے رہے اور میں پڑھتا رہا۔ علم وادب شمارہ نمبر(۱۰) کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی ایک غزل پر خامہ فرسائی کا موقع ملا تو میں نے بعض اشعار کے حوالے سے بجا یا بیجا اعتراضات کئے اور ان پہلوؤں پر میں آج بھی معترض ہوں۔ وہ بھی اپنے موقف پر قائم ہیں۔ یعنی یہ کہ انہیں اپنی وضع بدلنے میں تامل ہے اور میں اپنی عادت سے مجبور۔ چنانچہ طارق متین کے سلسلے میں اس وقت میں نے جو رائے قائم کی تھی وہ آج بھی میرے نزدیک قابل اعتماد ہے اور وہ یہ ہے :

> ''جدید ترین متغزلین میں طارق متین اپنے منفرد اسلوب اور شناخت کی تلاش میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں بعید از قیاس نہیں کہ مستقبل قریب میں وہ غزل کے تازہ افق پر خورشید جہان تاب کی طرح چھا جائیں اور میں ابھی سے اس خوشگوار اور روشن مستقبل کا منتظر ہوں۔ (علم وادب، شمارہ ۱۰: ایک تجزیاتی مطالعہ ص ۴۰)

فن کاری کو فن کار کے خون جگر کا چسکا روز ازل ہی سے لگا ہوا ہے۔ روایتی طور پر اس مفروضے کے قائل طارق متین بھی ہیں۔ ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

خونِ دل میں اے طارقؔ انگلیاں ڈبونے سے   شاعری نہیں آساں یہ ہنر تو آتا ہے

یہ خیال بہت پرانا ہے لیکن جتنا پرانا ہے اتنا ہی تازہ کار بھی اور جتنا تازہ کار ہے اتنے ہی تازہ لفظی ماحول میں طارق متین نے اسے برتا بھی ہے لیکن ہر شعر میں یہ کیفیت نہیں پائی جاتی اور شاید یہ خصوصیت جلدی پیدا بھی نہیں ہوتی۔

ویسے روایات کے احترام کے ساتھ طارق متین اپنی غزلوں کو جدید اسلوب سے مزین کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہاں جدید اسلوب سے میری مراد عمر میں زندگی کے عام تجربات و مسائل ہیں جن کے تجزیے حکیمانہ اور فکری بنیادوں پر نہیں کئے جاتے بلکہ جذباتی تبصرے ہوتے ہیں۔ یہاں جو تضادات اور تصادم یا کش مکش کی کیفیت ہوتی ہے اسے تنوع کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً

ہر شخص یہاں اپنے مسائل میں گھرا ہے   فرصت ہے کسے اوروں کی کچھ خیر و خبر لے

عصری سیاسی، سماجی اور معاشی بحران کی وجہ سے اخلاقی قدروں کا جو حال ہے، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ایسی ہی عام باتیں اور عام تجربات مشک سخن میں پیش کئے گئے ہیں لیکن عمومیت کہیں کہیں کوئی خاصیت ایسی بھی دکھائی دیتی ہے جو شعر کو شعریت کے قریب لے آتی ہے اور اس کا تعلق بالعموم زبان و بیان سے ہوتا ہے۔ مثلاً محولہ بالا شعر ہی کے مصرع اولیٰ میں ''خیر خبر'' کا استعمال...... حالانکہ ہر جگہ طارق متین کا شعری میلان محاورۂ

زبان کا پابند نہیں۔ ظاہر ہے کہو ایک ایسا اسلوب وضع کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں جس کے ذریعہ الفاظ کے پیکر سے معنوی حسن کا منظر تراشا جا سکے اور یہ کام وجدان کی رہنمائی کے باوجود ہمہ دانی کے نہیں بلکہ ہنرمندی ہی سے ممکن ہے۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں جیسا کے درج ذیل شعر سے بھی واضح ہو جائے گا۔

بہت دشوار ہے فکرِ غزل میں طاق ہو جانا ہنر مندی ضروری ہے ہمہ دانی سے کیا ہوگا

اس اعتبار سے تخلیق شعر کے فنی مسائل کو بھی فکری بنیادوں پر سمجھنے کی کاوش طارق متین کے یہاں ملتی ہے حالانکہ میں ایسی باتوں سے اس قدر متاثر نہیں ہوا ہوں جس قدر ان کے دعائیہ اشعار سے جو اس مجموعے میں تعداد کے اعتبار سے قابلِ لحاظ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پختہ مکاں نہ دے، ہمیں چھپر کا گھر تو دے کیا اس کرم کے اہل بھی مولیٰ نہیں ہیں ہم
تیری دنیا میں میں برباد تو ہوں رب کریم گر یہی تیری رضا ہے تو شکایت کیسی
اپنے بندے سے حساب نامۂ اعمال کیا تیری رحمت بے کراں ہے یا الٰہی چھوڑ دے

اور یہ شعر بھی خوب ہے۔

جانے کیا ہو مری معصوم دعاؤں کا نصیب میں ہوں مصروفِ دعا بابِ اثر کے آگے

طارق متین کے اشعار دوسرے تناظرات میں بھی متاثر کرتے ہیں۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

وہم وگماں سے ساحل پر ہم ریت اڑاتے پھرتے ہیں کیسے پہنچیں حدِّ یقین تک کوئی اشارہ بھی تو نہیں
مری زندگی بھی عذاب ہے، مری آگہی بھی عذاب ہے مجھے راحتوں کا جہاں ملے، مرے واسطے یہ دعا کرو
کیا کوف سمایا ہے کہ ہم گھر میں بھی طارق لرزے ہوئے سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے ہیں
کبھی کسی سے کوئی بے غرض نہیں ملتا ہر ایک رشتہ یہاں تاجرانہ ہے بابا
زمین میرے لئے ماں کی گود جیسی ہے یہ آسمان مرا شامیانہ ہے بابا
کتنا کامل ہے یقیں اپنا خدا پر طارق رکھ دیا کرتے ہیں کشتی کو بھنور کے آگے
ہنر ہمیں بھی ہے صاحبِ سخن طرازی کا غزل کے فن سے ہماری بھی آشنائی ہے

طارق متین سخن طرازی کے ہنر میں جیسے بھی طاق ہوں اور غزل کے فن سے ان کی جو بھی آشنائی ہو یا آشنائی کی نوعیت جیسے بھی ہو، اس کے تجزے کا یہ موقع نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ غزل نگاری کے وسیلے سے وہ دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت کر چکے ہیں۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں بلکہ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ ''مشک سخن'' باذوق قارئین کو اپنی طرف ضرور متوجہ کرے گا۔

● اقبال حسن آزاد

طارق متین کی شاعری قندیل ہنر کی روشنی میں

شاعری طارق متین کے لیے زندگی بھی ہے اور زندگی کا جواز بھی۔ یہ ان کی شناخت کا وسیلہ بھی ہے اور اظہار کا ذریعہ بھی۔ طارق متین اگر شاعر نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتے۔ خود ان کا کہنا ہے کہ:

مجھ کو روشن کیا قندیلِ ہنر نے طارق　　ورنہ میں شب کا مسافر تھا فنا ہو جاتا

اور اس قندیلِ ہنر کی روشنی میں طارق متین کی شاعری کا وہ جگمگاتا ہوا روشن چہرہ نظر آتا ہے جس پر نظریں پڑتے ہی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ان کی شاعری کوئی نئی نویلی، سجی سنوری خوبصورت دلہن ہے جس پر آنکھیں ٹک نہیں پا رہی ہیں بلکہ اس کے برخلاف اس میں ایک ایسا فطری حسن ہے جس میں سادگی، دل آویزی اور کشش کے ساتھ وہ سحر انگیزی ہے جس کی مثال کم از کم موجودہ دور کے اردو شاعروں میں کم ہی کم ملتی ہے۔ افلاطون نے فن شاعری کو عطیۂ الٰہی قرار دیا ہے۔ طارق متین بھی اس حقیقت سے واقف ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

جو بھی امکان نمو آج مری خاک میں ہے　　یہ کرشمہ تو اسی کا ہے جو افلاک میں ہے

اور میں سمجھتا ہوں کہ خدا شاعری کا فن اسی کو ودیعت کرتا ہے جس کا دل گداز ہو کیونکہ شاعری تو دل کی آواز ہے۔ اچھی شاعری ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق دل سے نکلتی ہے اور دل میں گھر کر جاتی ہے۔ بہت زیادہ غور فکر کے بعد کہا گیا شعر دل پذیر نہیں ہوتا۔ اس میں آورد کا رنگ صاف جھلکتا ہے اور صاحب نظر پہلی ہی نظر میں پہچان لیتے ہیں کہ شاعر نے دل سے نہیں دماغ سے شاعری کی ہے۔ طارق متین کی شاعری ان کے دل کی آواز ہے اور اسی لئے دل پذیر ہے۔ طارق متین نئی زمینوں کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہوتے، دور از کار ردیف اور قوافی کی جستجو میں ہفت خواں طے نہیں کرتے بلکہ اپنی شاعری کو اس فطری انداز میں پیش کرتے ہیں جس پر تصنع اور بناوٹ کا گمان تک نہیں گزرتا۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے:

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو　　کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

یہی فطری انداز طارق متین کے کلام میں ہر جگہ رواں دواں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

بس یہی شرط ہے پھر باب اثر کھلتا ہے　　دل کو مصروف دعا چشم کو تر کر لیا جائے

بڑی بے پایاں ہے یہ دولت سرشاریٔ دل بانٹتے جایئے لیکن کبھی گھٹتی ہی نہیں
کچھ بھی باقی نہیں ویران حویلی کے سوا کیسا اس شہرِ فضیلت پہ زوال آیا ہے

عام لب و لہجے میں کہے گئے یہ اشعار معنی آفرینی اور اثر پذیری میں بے مثال ہیں۔موقر ادبی رسالے''آجکل'' کے مدیرڈاکٹرابراررحمانی نے آجکل جنوری ۲۰۱۰ کے اداریئے میں کیا ہی اچھی بات کہی ہے کہ:

''سچا اور کھرا ادب وہی ہوسکتا ہے جو عوامی ہو۔شعر و ادب کا تعلق براہ راست عوام سے ہوتا ہے اور جمہوری اقدار کا حامل ہوتا ہے۔''اس کسوٹی پر طارق متین کے اشعار کو پرکھا جائے تو وہ ایک سچے اور کھرے شاعر کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ہر اک گھر اب سمٹتا جا رہا ہے کئی خانوں میں بٹتا جا رہا ہے
اندھیرے ہیں کہ بڑھتے جارہے ہیں اُجالا ہے کہ گھٹتا جا رہا ہے

کیسا سیدھا سادا انداز ہے۔کیسی دل پذیری ہے۔ذرا غور فرمایئے،عصری حسیت سے مملوان اشعار کے اندر کتنی تہہ داری ہے۔معنی و مفہوم کی کتنی جہتیں ہیں۔بظاہر یہ اشعار عام فہم اور بالکل سامنے کے ہیں لیکن اگران کی تشریح کی جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہوجائیں۔آج ہر گھر انتشار کا شکار ہے۔بھائی بھائی کا دشمن ہے۔ہر گھر سمٹتا جا رہا ہے۔دلوں سے کشادگی ختم ہوتی جارہی ہے۔اور ان میں صفائی کی جگہ کدورت آگئی ہے۔اپنا پن ماضی کا قصہ بن چکا ہے۔ایک آنگن میں کئی دیواریں اُٹھ رہی ہیں۔اور ہر گھر کئی کئی خانوں میں بٹتا جارہا ہے۔اور آگے بڑھیئے تو بس یہی دکھائی دیتا ہے تیرگی چہار طرف چھاتی جارہی ہے اور اُجالے کا دم گھٹ رہا ہے۔آج ہر شعبۂ حیات میں اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ایک اندھی کھائی ہے جس میں تمام روشن چیزیں یکے بعد دیگرے گم ہوتی جارہی ہیں۔اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیا اچھے لوگوں سے خالی ہوتی جارہی ہے۔شاید اسی لئے کسی روشن ضمیر شخص کی موت پر کہا جاتا ہے کہ:

تیرگی اور بڑھی، اور بڑھی، اور بڑھی

سادے پیرائے میں عمدہ اشعار کہنا بھی ایک فن ہے اور طارق متین کو یہ فن بخوبی آتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ایک سائل یہی آواز لگاتا گزرا بانٹ کر کھایئے پھر مال میں برکت ہوگی
چاہتے ہیں نیا جادہ نئی منزل کوئی زندگی کے لئے اک رنگ نیا چاہتے ہیں

اوراسی نئے جادہ کی تلاش میں انہوں نے اپنا راستہ اپنے تمام اہم ہمعصروں سے بالکل جداگانہ اختیار کیا ہے۔چاہے وہ فرحت احساس ہوں یا احمد محفوظ،خورشید اکبر ہوں یا عالم خورشید،شہپر رسول ہوں یا منظر اعجاز،خورشید طلب ہوں یا کوئی اور کہتے ہیں:

نیا رستہ نہیں کھلتا تو ٹھہر جاتے ہیں — ہم ادھر جاتے نہیں لوگ جدھر جاتے ہیں
رنگ سخن کو ہم نے بدلنے نہیں دیا — سانچے میں طرز عام کے ڈھلنے نہیں دیا
کچھ بھی باقی نہیں ویران حویلی کے سوا — کیسا اس شہر فضیلت پہ زوال آیا ہے
زخم دل، زخم جگر، زخم تمنا طارق — ہم انہی زخموں کی اب چارہ گری میں گم ہیں
خون رونے کو مرا دیدۂ تر کافی ہے — درد مندی کو تری ایک نظر کافی ہے
کسی کوزے میں سماتا نہیں دریا لیکن — راکھ کے ڈھیر کو اک رقصِ شرر کافی ہے

طارق متین کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ ان کی شاعری میں کہیں کہیں میر کا رنگ در آیا ہے۔ مگر وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ میر تقی میر جس بلندی پر متمکن ہیں وہاں تک پہنچنا از حد دشوار ہے۔ البتہ ان کے دل میں یہ خواہش ضرور انگڑائیاں لیتی ہے کہ کاش وہ بھی اپنے عہد کے میر ہوتے۔ کہتے ہیں:

میر کی طرح گرفتار بلا ہو جاتا — کاش! اس عہد سخن کا میں خدا ہو جاتا

طارق متین اپنے عہد کے خدائے سخن ہوں یا نہ ہوں مگر بقول پروفیسر لطف الرحمان طارق متین اپنا ایک خدا بھی رکھتے ہیں۔ میں اس قول کی تائید کرتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ نہ صرف اپنا ایک خدا رکھتے ہیں بلکہ اس کی وحدت اور رحمت پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان خطا ونسیاں کا پتلا ہے اور یہ بھی کہ جو بندہ اپنی خطاؤں پر شرمسار ہوتا ہے خدا اس کی ساری خطائیں معاف کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں:

اپنے بندوں کی ندامت سے وہ خوش ہوتا ہے — رہیے مصروفِ دعا بارشِ رحمت ہوگی

بندگی طارق متین کا مزاج ہے۔ اور بندگی کے ساتھ ساتھ فقر و قناعت ان کے مزاج کا حصہ۔ فقیری دراصل ایک نظریۂ حیات ہے جس میں اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا مقدم ہوتا ہے۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ صوفیانہ مزاج ایک الگ چیز ہے اور فقیرانہ الگ۔ طارق متین درد کی طرح صوفی شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ آتش لکھنوی کی طرح کج کلاہی میں ایک فقیرانہ شان رکھتے ہیں۔ آتش نے کہا تھا:

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار — بوریئے پہ بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کے

طارق متین کہتے ہیں:

یہ فقیری بھی عجب چیز ہے طارق صاحب — شان سے اپنی چٹائی پہ جیا کرتے ہیں

اس قبیل کے اشعار قندیل ہنر میں جابجا روشن ہیں، چند اور اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ہم تو سلطان ہیں اک سلطنت دل کے میاں — مسند خاک پہ بھی تاجوری میں گم ہیں

ہم فقیروں کا کوئی کام نہیں اس کے سوا — فاقہ کش ہو کے بھی ہم دیدہ وری میں گم ہیں
جسم پر ملتے ہیں مٹی کو بھی مرہم کی طرح — ہم فقیروں کے لئے خاک گزر کافی ہے
ہم کو چڑیوں سے قناعت کا سبق ملتا ہے — چند تنکے بھی بہت ہیں کسی کاشانے کو
مجھ کو افراط زر و سیم مقدم نہ ہوا — میرا فانوس قناعت کبھی مدھم نہ ہوا
اپنی یہ شان فقیری بھی دکھا دی ہم نے — جس نے معتوب کیا اس کو دعا دی ہم نے

یہ وہی شان اور اکڑ ہے جو میر اور آتش کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور غالباً یہی اکڑ ہے جس نے ان کی شاعری پر جا بجا تعلیٰ کی رنگ چڑھا دیا ہے۔ تعلیٰ گو کہ اچھی صفت نہیں مگر شاعری میں جائز ہے۔ میر، غالب اور اقبال سے لے کر کلیم عاجز تک کے یہاں تعلیٰ کسی نہ کسی طور پر موجود ہے۔ یہ دراصل شاعر کا اپنے اوپر اعتماد ہے۔ اس طرز کے چند اشعار دیکھئے:

ہمارے کارناموں سے ملا ہے مرتبہ ہم کو — فضیلت اوڑھ لینے سے کوئی افضل نہیں ہوتا
ہاتھ یوں ہی نہیں آیا غزل گوئی کا فن — ہم نے اس باب میں جی جان سے محنت کی ہے
ہمارے شعر بھی کچھ مختلف تو ہوتے ہیں — مگر یہ فن ہے کہ مہمل کبھی نہیں ہوتے
انداز ہی کچھ سب سے نرالا ہے ہمارا — یوں ہی تو نہیں شہر میں چرچا ہے ہمارا

بے شک طارق متین کا انداز سب سے نرالا ہے۔ انہوں نے اس باب میں جی جان سے محنت کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار اوروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ انہوں نے غزل جیسی نرم و نازک صنف میں ہندی کے سبک الفاظ کو اس حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ چند اشعار دیکھئے:

یہ شب ہجر کسی حال میں کٹتی ہی نہیں — پھن پسارے کوئی ناگن ہے کہ ہٹتی ہی نہیں
تیری یادوں کا سہارا ہے کی جی لیتے ہیں — بادۂ ہجر کی تلچھٹ کو بھی پی لیتے ہیں
مصروف ہیں تعمیر نشیمن میں پرندے — یہ کم تو نہیں ٹھور ٹھکانے میں لگے ہیں
غریبی میں جو پلتے ہیں وہ بچے اہل ہوتے ہیں — بگاڑ اولاد میں زر کی فراوانی سے ہوتا ہے
جیون کو ساکار اگر کرنا ہے پیارے عشق کرو — آخر شب میں آتی رہی آواز کسی سودائی کی

درج بالا اشعار میں پھن، تلچھٹ، ٹھور ٹھکانے، بگاڑ، جیون اور ساکار جیسے ہندی الفاظ کا فنکارانہ استعمال طارق متین کی کہنہ مشقی پر دال ہے۔

طارق متین کی شاعری کی عمر لگ بھگ بیس بائیس سال ہے۔ یہ وہ عمر ہے جب بے خودی اور سرمستی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ شوخی، الھڑ پن اور منہ زور جوانی کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور

رکھ رکھاؤ بھی آنے لگتا ہے۔اس عمر میں یوں تو نادانیاں کم ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی پاسبان عقل کو تنہا چھوڑ دینے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔طارق متین کبھی کبھی جان بوجھ کر نادان بھی بنتے ہیں اور یہی دراصل ان کی سب سے بڑی دانائی ہے۔اپنے پہلے شعری مجموعے ''مشک سخن'' میں ہی وہ اس طرف اشارہ کر چکے ہیں:

دل ناداں نے سارے معرکے سر کر لئے آخر ‏ ‏ ‏ یہ نادانی تھی ہم سمجھے تھے نادانی سے کیا ہوگا

اور ''قندیل ہنر'' میں فرماتے ہیں:

جو کام آتش نہیں کرتی ہے وہ پانی سے ہوتا ہے ‏ ‏ ‏ نہیں ہوتا جو ہشیاری سے نادانی سے ہوتا ہے

اور آخر میں میں پھر اسی بات کو دہرانا چاہوں گا کہ طارق متین کی کل شعری کائنات ان کے دل کی آواز ہے اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ دل کا تعلق عشق و محبت سے ہے اور عشق و محبت سے ہی انسان رہبری حاصل کر سکتا ہے نہ کہ عقل سے۔بقول میر تقی میر:

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور ‏ ‏ ‏ نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

◀ ● ▶

Shah Colony Shah Zubair Road,
Munger Bihar 811201

افسانوی مجموعے

نام کتاب: سنوفال
صنف: افسانے
مصنف: اسلم سلازار
سن اشاعت: ۲۰۲۰ ‏ صفحات: ۱۴۴
قیمت: ۳۵۰/روپئے
ملنے کا پتہ: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

نام کتاب: رانگ نمبر (دوسرا ایڈیشن)
صنف: افسانے
مصنف: نشاط پروین
سن اشاعت: ۲۰۲۵ ‏ صفحات: ۱۴۴
قیمت: ۲۵۰/روپئے
ملنے کا پتہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، مونگیر

نام کتاب: کیسا انتظار
صنف: افسانے
مصنف: پروفیسر افسانہ خاتون
سن اشاعت: ۲۰۲۳ ‏ صفحات: ۱۳۲
قیمت: ۲۰۰/روپئے
ملنے کا پتہ: ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، نیو دہلی۔۲

نام کتاب: قطرہ قطرہ احساس (دوسرا ایڈیشن)
صنف: افسانے
مصنف: اقبال حسن آزاد
سن اشاعت: ۲۰۲۴ ‏ صفحات: ۱۶۰
قیمت: ۲۵۰/روپئے
ملنے کا پتہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، مونگیر

● ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی

طارق متین کے شعری رویے اور تعین قدر

اردو شاعری کے ابتدائی زمانہ سے معاصر عہد تک غزل کی ہمہ گیریت کے زیر اثر اس بات کا پتہ لگانا کہ وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بدولت اردو غزل اپنی اثر پذیری اور ہر دلعزیزی سے دلوں کو نبھاتی رہی ہے؟ دہرائے ہوئے چند جملوں اور مخصوص فقروں کے علاوہ کوئی نیا نکتہ، کسی وضاحت طلب گفتگو کا پیش خیمہ نہیں ہوسکتا۔ اردو غزل کی تاریخ نے اپنے دامن میں انفرادی اسالیب کے نمائندہ فنکاوں کو ہمیشہ قدرومنزلت کے مقام پر فائز رکھا ہے۔ انفرادی اسالیب/اسلوب دراصل ایک اندازِ فکر، طرز اظہار اور مخصوص نقطۂ نظر کی بدولت پہچانا جاتا ہے یعنی کائنات کے مختلف النوع موضوعات کو فنکار جس حوالے سے دیکھتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہے، وہ اس کا انفرادی نقطۂ نظر ہونا چاہیے کیونکہ یہی انفرادی فکر اور کائنات کے مطالعہ کا انفرادی نقطۂ نظر اس کے اسلوب کو متعین کرنے کا جواز ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں میر، غالب اور اقبال کی مثالیں موجود ہیں۔ مذکورہ شعرا کی شناخت ان کے اسلوب کی وجہ سے نمایاں ترین حیثیت رکھتی ہے۔ روزمرہ کی زبان کو شاعر کا اعلیٰ ترین نمونہ بنا کر میر نے اپنے ساتھ اردو ادب کو بھی دنیا کے عظیم شاعروں اور ادب کے ساتھ لاکر کھڑا کردیا۔ مرزا غالب نے روش عام سے ہٹ کر زبان کے خلاقانہ استعمال اور شاعری میں انتہائی پیچیدہ استعاراتی طرز اظہار اور مخصوص تہذیب اور اہل زبان کے مزاج کے مدنظر جو تخلیقی نمونے پیش کیے، ان سے غالب اسالیبِ غزل اور شاعرانہ کمال کے بلند مقام پر فائز ہوگئے۔ اسی طرح علامہ اقبال کے عجمی اور حجازی لے کے ساتھ ان کے فلسفیانہ خیالات، مذہبی اساطیری حوالے اور آفاقی فکری رویے ان کے اسلوب کی انفرادیت کے غماز ہیں۔

غزل کی شاعری کے متعلق عموماً رویہ یہ رہا ہے کہ اس میں شاعر کے ذاتی احساس اور تجربے کو دخل ہوتا ہے۔ شاعر کے طرز اظہار، اس کے موضوعات اور ترجیحات میں وہی باتیں اہم ہوتی ہیں جن کا تعلق اس کی ذات سے ہوتا ہے۔ اسی لیے غزل کی شاعری کو ذاتی واردات کا بیان بھی سمجھا جاتا رہا ہے حالانکہ اس طرح کے رویے کا تعلق حقیقت سے نہیں ہے۔ شاعر کے محسوسات سے قطع نظر، اس کے تجربے اور

مشاہدے کو جن کا اظہار غزل کے شعروں میں ہوتا ہے، ذاتی نوعیت کے خانوں میں تقسیم کرنا، خود فنکار کے ساتھ اور اس کے فن کے ساتھ غیر دیانتداری اور زیادتی کے مترادف ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کہیں لکھا ہے کہ شاعری کے بارے میں شاعر کے بیانات کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک خود اس کی تخلیقات ان بیانات کا جواز فراہم نہ کر دے۔ یعنی تخلیق کار کی بیان کردہ کوئی بات آنکھ بند کر کے یقین کرنے کے لائق نہیں ہوتی۔ اسی طرح غزل کی شاعری کسی تجربے کی پیشکش کو شاعر کے ذاتی احساس اور واردات یا تجربے کا اظہار نہیں کہا جا سکتا۔

ہمارے یہاں جدیدیت کی بحث نے ان تمام مفروضات کو چیلنج کیا، جو روایتی انداز فکر، واضح طرز اظہار، اجتماعی فکر کی نمائندگی کے غماز، اخلاقی، قومی، سماجی و ملی مفاد کے خیر خواہ اور کلاسیکی یا روایتی زبان و بیان کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ جدیدیت کہیں نہ کہیں روایت شکنی کی مرتکب بھی رہی اور کلاسیکی اسالیب سے فیضیاب ہونے کے رویے بھی اس رجحان یا تحریک کے زیر اثر سامنے آئے۔ اسی لیے جدیدیت کی حمایت کرنے والے ادیبوں میں بھی اختلافات پیدا ہوئے۔ بعض ادیب، روایت سے مکمل بیزاری اور ناوابستگی کو جدیدیت سے جوڑ کر دیکھ رہے تھے اور بعض اہل علم کے نزدیک روایت کا عرفان اور اس سے استفادہ ہی جدیدیت کی پائیداری کی ضامن تھا۔ معائب و محاسن کا معاملہ ہر عہد کی شاعری میں کم یا زیادہ موجود رہا ہے اور دوسری اہم بات یہ کہ ہم اپنے کلاسیکی ادب و شاعری سے یکسر لاتعلق رہ کر زمانے کے تقاضے کو پورا کرنے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا روایت اور کلاسیکیت سے بیزاری کا مظاہرہ کرنے والے ادیب و شاعر معاصر عہد کے مسائل کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر عہد کا فنکار اپنے مسائل و معاملات کے مطابق اظہار کے لیے زبان بھی وضع کرتا ہے۔ الفاظ کے لغوی معنی کی قلب مائیت ہی وہ ثبوت ہے کہ ہر عہد میں زبان اور معنیاتی نظام معاصر عہد کے تقاضوں کے مطابق تبدیل بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس تبدیل شدہ صورت کو روایت کے عرفان و آگہی کے بغیر نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو روبہ عمل لایا جا سکتا ہے۔

جدیدیت کے عہد میں سامنے آنے والے ادیب و شاعر اپنے اثبات کے لیے گذشتہ اور ہم عصر موضوعات و ترجیحات سے بدظن تھے اور اسی لیے انھوں نے سابقہ نظریات اور ترجیحات سے انحرافی رویہ اختیار کرتے ہوئے اپنی بات اور تجربات کے اظہار کو انفرادی اور تخلیقی رنگ عطا کیا۔ جدیدیت کے عہد میں تخلیقی انفرادیت یا رنگ سے مراد جس میں فنکار نے اپنے محسوسات کو ذات اور کائنات کا تجربہ بن کر پیش کیا۔ یہی وجہ تھی کہ عدم وابستگی کی نمایاں مثالیں جدیدیت کے دور میں روبہ عمل آئیں۔ جدیدیت کے رجحان کے زیر اثر لکھی جانے والی تحریروں اور نگارشات نے جہاں ادب میں نئی روایت کو قائم کیا وہیں چند

برسوں میں ایسی چیزیں سامنے آئیں، جن سے تخلیق چیستاں بنادی گئی۔تخلیق کار کے مبہم اور انتہائی پیچیدہ طرز اظہار نے ترسیل کے مسئلے کو پیدا کیا۔دوسری طرف تنقیدی تحریروں نے تخلیق سے متعلق ایسی موشگافیاں، سوالات اور پیچیدگیاں پیدا کردی کہ ان سے ایک قسم کی بیزاری بھی پیدا ہوئی۔یعنی جدیدیت یا جدت پسندی کی بہت سی اچھائیوں نے مختلف قسم کی برائیوں کو بھی جنم دیا۔

اس فضا میں جدیدیت کے آغاز سے لے کر دو دہائی کے بعد ایسی نسل بھی پروان چڑھی جسے جدید ادب کے اچھے، برے کی تمیز کرنے کا موقع ہاتھ آگیا، لہٰذا اس دور میں جو نسل سامنے آئی اسے اپنے پیش روشعرا کی تخلیق سے ردوقبول کے مواقع خوب ملے اور یہ کہ اس نسل نے اپنے لہجہ کی ساخت اور اسلوب کی پیشکش میں ایک محتاط رویہ برتا۔

۹۰-۱۹۸۰ء کی دہائی میں جن شعرانے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اور کسی افراتفری اور شدت کے بجائے متانت اور بردباری کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے بڑی ہنرمندی کے ساتھ اپنی تخلیقات کو بروئے کار لائے اور اپنی ادبی دنیا میں اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی، ان میں طارق متین کا نام بلاشبہ اطمینان کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔طارق متین نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانہ ہی سے متاثر کرنا شروع کردیا تھا حالانکہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''مشکِ سخن'' (۱۹۹۷ء) میں کوئی ایسا مبسوط اندازِ نظر اور مستقل لہجہ نہیں ہے، جس کی بدولت انہیں صاحبِ اسلوب شاعر قرار دیا جائے مگر 'مشکِ سخن' میں موجود غزلوں کے بعض اشعار ایک انفرادی اسلوب کی نشاندہی کرنے میں مدد ضرور کرتے ہیں۔حالانکہ مجموعی طور پر طارق متین نے اب تک جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے ان کی شناخت اور انفرادیت ضرور قائم ہوگئی ہے۔طارق متین زبان کے معاملے میں اپنے پیش روشعرا سے مختلف طرز اظہار کے قائل ہیں۔جدیدیت کی جس شعریات نے شاعروں کا لائق اعتنا نہیں ہونے دیا اس شعریات سے طارق متین کا کلام انحراف کی نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔جدید شاعری کی شعریات میں غیرمانوس زبان کا استعمال، تجریدیت، ابہام اور انتہائی پیچیدہ ترکیبات اور علامتوں کا استعمال وغیرہ شامل ہیں، جس نے اردو قارئین اور سامعین کو بہت جلد متنفر کردیا۔۱۹۸۰ء کی دہائی میں سامنے آنے والی نسل اپنے پیش روشعرا کے انہیں شعری رویوں سے محتاط رہی اور محفوظ طریقہ سے اپنا علمی و ادبی محاسبہ کرتے ہوئے روایتی شعریات کو جدید آہنگ اور معنی عطا کرنے میں مصروف ہوئی۔طارق متین کے یہاں شعری زبان کسی پیچیدگی کے بجائے دلنشین اسلوب کے حسن سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ان کے یہاں لفظیاتی دروبست میں کلاسیکیت کے حسن کو دیکھا جاسکتا ہے۔ہمارے یہاں اردو میں عرفان صدیقی نے جو اسلوب پیش کیا ہے اسے اردو

غزل میں اضافہ قرار دیا گیا اور بلا شبہ عرفان صدقی اردو غزل یا جدید اردو غزل کے اہم شاعر تسلیم کیے گئے۔

طارق متین کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت عرفان صدیقی بار بار یاد آتے ہیں۔اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ طارق متین کے یہاں عرفان صدیقی کے خیالات،لفظیات نے ایسا تاثر پیدا کیا ہے بلکہ اس کا اہم سبب شاعری کی وہ زبان ہے جسے عرفان صدیقی نے وضع کیا تھا۔تہذیبی شائستگی،ثقافتی اظہار،معاصر صورت حال کے بیان کے ساتھ ہی روایت کی بھرپور پاسداری قدیم وجدید کے جس امتزاج نے عرفان صدیقی کو صف اول کا شاعر بنا دیا۔اسی اسلوب،زبان اور معیار کا خیال طارق متین کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔بہت ممکن ہے یہ ہنر انھوں نے عرفان صدیقی سے ہی سیکھا ہو لہٰذا طارق متین کو عرفان صدیقی کے اسلوب کی روایت کے امین کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔طارق متین کو غزل کہنے کا ہنر خوب آتا ہے کیونکہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ اس کے لیے کثیر العلم ہونا نہیں بلکہ ہنر مندی ضروری ہے اور غزل کہنے کے ہنر کے بغیر حسینۂ غزل کی مشاطگی دشوار کن کام ہے۔

بہت دشوار ہے فکرِ غزل میں طاق ہو جانا　　ہنر مندی ضروری ہے ہمہ دانی سے کیا ہوگا

یہی ہنر مندی ان کے کلام میں جا بجا اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔طارق متین کی شاعری زندگی کے رموز و اسرار کی گرہ کشائی ہے۔ان کے کلام میں زندگی مختلف رنگوں اور جلوؤں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے،ان کی شاعری میں قنوطیت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا بلکہ بعض موقعوں پر زندگی اور زمانہ کے معاملات میں طارق متین ایک تجربہ کار صوفی اور ایک دانشور کی طرح تبصرہ کرتے ہوئے،زندگی اور زمانہ کی بے بضاعتی اور انسانی جدوجہد کی ہر کارکردگی کو بے معنی بتاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ساتھ ہی ان کے یہاں انسان کے مقام اور کائنات میں اس کی عظمت کا احساس بھی موجود ہے۔

سودا بلندیوں کا مرے سر میں رکھ دیا　　اڑنے کا فن بھی اس نے مرے پر میں رکھ دیا
اک قطرہ خوں میں رکھ دیا طوفانِ غم کا شور　　کیسا سکوت اس نے سمندر میں رکھ دیا

طارق متین کے یہاں صوفیا کی طرح بے نیازی کا انداز ملتا ہے۔وہ دنیاوی عیش و عشرت سے بے نیاز اپنی ذات میں درویشانہ صفات رکھتے ہیں۔جو ان کی شخصیت کا اہم پہلو ہے۔بظاہر طارق متین کا طرز زندگی جتنا والہانہ ہے،اتنا ہی ان کے اندرون میں بے نیازی کی صفات موجود ہیں۔اس ضمن میں چند شعر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں:

مشتاق تخت قیصر و کسریٰ نہیں ہیں ہم　　درویش ہیں اسیر تمنا نہیں ہیں ہم
اپنی یہ شان فقیری بھی دکھادی ہم نے　　جس نے معتوب کیا اس کس دعا دی ہم نے

فاصلہ کم نہ ہوا روز ازل سے اب تک — عجز درویش میں اور سطوت سلطانی میں
ہم ایسے گوشہ نشینوں کی ایک جنبش سے — رکا ہوا یہ جہاں پھر سے چلنے لگتا ہے
بچا کون یہاں وقت کے تھپیڑوں سے — ہے میرے عمر گریزاں بھی ماہ و سال میں گم

فن کی آرائش وزیبائش کی تکمیل روایت کے حسن اور استفادہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ روایت شکنی کا مرتکب ہونے کے بجائے طارق متین روایت پسند ہے ہیں۔ زبان و بیان کے معاملے میں ان کے یہاں انفرادی اسلوب کی شناخت دراصل ان کی روایت سے عقیدت اور استفادہ کی ضامن ہے۔ درج ذیل شعر، شاعر کی روایت پسند طبیعت کے ضمن میں بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں:

تاثیر میں اس کا متبادل نہیں کوئی — جس شعر میں تہذیب روایت ہے زیادہ
وہ غزل کیا جو تغزل سے ہو خالی یارو — کوئی جدت نہیں ٹکتی روایت کے بغیر

طارق متین کی شعری کائنات میں اول تا آخر غزل کی ہی حکمرانی ہے۔ دیگر کسی صنف میں طبع آزمائی کرنے کے لیے وہ خود کو آمادہ نہیں کر پاتے، اسی لیے غزل پڑھنا، سننا اور لکھنا ہی شب و روز کا مشغلہ ہے۔ تاہم غزل سے اس درجہ شدید لگاؤ انہیں غزل کے اہم شاعروں کو پڑھنے اور غزل کے تمام رموز واسرار سے واقف ہونے کا موقع اور ترغیب بھی دی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ فنکاری کو سنوارنے اور غزل کو بنانے کے لیے اپنے پیش رو اہم غزل گو شعرا سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ناصر کاظمی، احمد مشتاق، اطہر نفیس، سلیم احمد، عرفان صدیقی، ساقی فاروقی، شجاع خاور، اسعد بدایونی، شہریار وغیرہ شاعروں نے غزل کی شاعری اور جدید غزل کی شعریات اور امکانات کو وسیع کیا ہے۔ یہ نام ضمناً لکھے گئے ہیں اور ان سے غزل گو شعرا کی حتمی فہرست بنانا مقصود نہیں ہے۔ طارق متین نے اپنے اکابرین اور بزرگوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس سے اپنے لہجہ اور آہنگ کو سنوارنے میں مدد لی ہے۔ طارق متین کا ایک شعر ہے۔

نہ کوئی شور، نہ ہنگامہ نہ کوئی رونق — میری آنکھوں کی طرح شہر بھی ویران ہے کیا

اس شعر کو پڑھ کر ناصر کاظمی کا مشہور شعر فوراً ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے:

دل تو میرا اداس ہے ناصر — شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

طارق متین کے شعر میں آنکھوں کے ویران ہوجانے کا تذکرہ موجود ہے، مگر اس بات کا اشارہ کہیں موجود نہیں ہے کہ آنکھوں میں ویرانی کیوں ہے؟ ساتھ ہی مصرعہ اولیٰ میں شور، ہنگامہ جیسے الفاظ کا تعلق سماعت سے ہے، آنکھوں سے نہیں، ماسوا رونق ہے۔ شاعر کا منشا محض یہ ہے کہ کیوں کہ کوئی شور، ہنگامہ اور رونق شہر میں نہیں ہے تو شاید میری آنکھوں کی ویرانی شہر میں سرایت کرگئی ہے۔ مگر سوال باقی رہتا

ہے کہ آنکھوں کے ویران ہونے کی کیا وجہ ہے؟

اس کے علاوہ ناصر کاظمی کے شعر میں تاثرات کی تجسیم کر کے جو شعری فضا پیدا کی گئی ہے، وہ ناصر کاظمی کا خاص فن ہے۔ دل اداس ہونے کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں، کسی کے وعدے کے وفا نہ ہونے پر اداسی ہے، عشق میں ناکامی کے سبب پیدا ہوئی اداسی، زندگی میں کسی خواہش کے پورا نہ ہونے پر اداسی وغیرہ وغیرہ تعبیرات پیش کی جاسکتی ہیں۔ جب انسان اندر سے ٹوٹ پھوٹ جائے اور اس کے دل میں محزونی اور اداسی گھر کر جائے تو پھر دنیا کا کوئی ہنگامہ، خوشی، شور وغوغا اسے متاثر نہیں کرتا اور یہ کہ اس کے اندرون اور بیرون کی فضا ایک سی ہوجاتی ہے۔ خوب شعر ہے:

جب آفتابِ جہاں تاب ڈھلنے لگتا ہے   ترے خیال کا سورج نکلنے لگتا ہے

اسی پس منظر میں عبیداللہ علیم کا شعر بھی سنیں:

خیال و خواب کے کیا کیا نہ سلسلے نکلے   چراغ جلتے ہوے آفتاب ڈھلتے ہوئے

یہاں طارق متین کے شعروں کے ساتھ کسی اہم شاعر کے شعر کا حوالہ دینے کا مقصد، تقابل کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے جواز یہ ہے کہ کسی خیال، تجربے کو پیش کرنے کا رویہ ۱۹۸۰ء کے بعد شاعروں کے یہاں کس نوعیت کا ہے۔ عموماً ہماری غزلیہ شاعری میں دن ڈھل جانے کے بعد شام کا منظر/وقت اور پھر ہولناک رات کی تنہائی شاعروں/عاشقوں کے لیے وبال جان رہی ہے۔ اس حوالے سے ہماری کلاسیکی غزل سے لے کر موجودہ عہد تک شاعروں نے اپنے اپنے اندر سے اس کیفیت اور تجربے کو نظم کیا ہے اور یہ کہ اس احساس نے شاعروں کے غم، تڑپ اور کرب آمیز تجربات کو پیش کیا ہے مگر طارق متین کے یہاں اس احساس یا تجربے کی قلب ماہیت ہوجاتی ہے۔ یعنی آفتاب جہاں تاب کے ڈھلنے کے بعد کسی خیال کا سورج طلوع ہونا، روایتی خیال کے بالکل مختلف تجربہ ہے۔ شاعر رات کی ہولناک تاریکیوں اور تنہائیوں سے پریشان نہیں ہے بلکہ وہ کسی شخص کے خیال سے اپنی تنہائی اور تاریکی کو روشن اور تابناک محسوس کرتا ہے۔ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک آفتاب سے زیادہ اہمیت کا حامل کسی کی یاد/خیال کا سورج ہے۔ عمدہ شعر کہا ہے۔

طارق متین کی غزل کے مطالعہ کے دوران اندازہ ہوتا ہے کہ بعض شعروں میں ابہام موجود ہے۔ شاعر نے قافیہ کی مجبوری کے تحت یا پھر کسی ایک لفظ یا تجربے کی تئیں جو احساس پیش کیا ہے وہ کسی قدر پیچیدہ ہوگیا ہے مثلاً:

کرشمہ یہ بھی دیکھا ہے زمانے کی نگاہوں میں   دہکتی آگ کو پل بھر میں شبنم کردیا اس نے

کس نے آگ کو شبنم کیا؟ کون سی آگ کو شبنم کیا اور کیوں کیا؟ اس بارے میں کہیں کوئی اشارہ

شعر میں موجود نہیں ہے اگر اسے تلمیح کے طور پر ابراہیم خلیل اللہ والے واقعے کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو وہاں آگ کا شبنم ہونا چہ معنی دارد؟ آگ کا گلزار ہونا تو سمجھ میں آتا ہے جو مذہبی اساطیر کا اہم واقعہ ہے لیکن شبنم ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ مصرعہ اولیٰ میں نگاہوں کی مناسبت سے لفظ دیکھا اور کرشمہ میں ربط ہے، وہیں مصرعہ ثانی میں دہکتی آگ اور شبنم میں جدلیاتی لفظی مناسبت ضرور ہے مگر مجموعی طور سے شعر معنی کی کوئی جہت متعین نہیں کر پاتا اور محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے محض قافیہ کی پابندی کی وجہ سے شبنم کا لفظ استعمال کیا ہے۔

کچھ بھی باقی نہیں ویران حویلی کے سوا   کیسا اس شہر محبت پہ زوال آیا ہے

شاعر کس شہر کی فضیلت اور اس کے زوال آمادہ ہونے کی بات کر رہا ہے، شعر میں پتہ نہیں چلتا ہے۔ اگر اسے علم و تہذیب کے کسی مرکز، اخوت و محبت کی مثال کسی خطے یا علاقے سے مربوط کر کے دیکھا جائے (جو موجودہ صورت حال کے تحت مناسب بھی معلوم ہوتا ہے، تو پھر یہ ابہام ختم ہو جاتا ہے۔)

جدیدیت کے زیر اثر شاعروں نے عام طور پر تنہائی، اداسی، اجنبیت، بیزاری، دنیا اور اس کے شب و روز سے ایک قسم کی اکتاہٹ وغیرہ وغیرہ جیسے موضوعات کو استعمال کر کے اور دہرا دہرا کر بالکل فرسودہ کر دیا تھا۔ مذکورہ موضوعات کو اپنی تخلیق میں بروئے کار لانا جدید شاعر کی شناخت کا حوالہ بن گئے تھے۔ چاہے اس میں شاعر کا تجربہ، مشاہدہ اور قلبی یا روحانی احساس شامل ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ ان موضوعات یا اس قسم کے احساسات کا استعمال نئے معاشرے کی پیدا کردہ صورت حال کے عین فطری رویہ تھا، مزید یہ کہ اس عہد کے اہ شعرا کے یہاں نظم اور غزل ہر دو اصناف میں ان موضوعات پر بہت عمدہ شاعری کے نمونے موجود ہیں۔ اب اسے بطور فیشن جن لوگوں نے استعمال کیا وہ اپنے انجام کو بھی پہنچ گئے۔ طارق متین کی غزل جدید کلاسیکی اسلوب کی مثال بن کر بھی ہمارے حواس کو متاثر کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ انہیں پڑھتے وقت ہر حس کو آپ متحرک محسوس کریں گے۔ معاصر عہد کی حیرت افزا اور افسوس ناک صورت حال کا بیان طارق متین کے یہاں ذات کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ انسان کی کارکردگی کا اظہار بطور شاعر نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کے رویوں کو خود فن کار اپنی ذات کے حوالے سے پیش کرتا ہے۔ اپنی جھوٹی انا اور خواہش بیجا کے لیے انسان کا بے ضمیر ہو جانا:

اور چھوٹا کیا اس خواہش بے جانے مجھے   میرا قد سارے زمانے سے بڑا ہوجاتا

موجودہ عہد کی تمدنی زندگی کی حقیقت اور اس کا انکشاف کرتے ہوئے منظر نامے کی قلب ماہیت کر دی ہے:

جگمگاتے ہوئے اس شہر میں بچ کر چلئے   جانے کس موڑ پہ کب کوئی تماشا ہوجائے

کیسا اندھیر ہے اس عہدِترقی میں میاں جو یہاں زخم لگائے وہ مسیحا ہوجائے

کچھ اور اشعار ترقی یافتہ نئے معاشرے میں پیدا ہوئے حالات اور انسان کے ازلی دکھ کی غمازی کے حوالے سے قابل مطالعہ ہو جاتے ہیں:

اب جدھر جایئے، ہے ایک ہی صحرائے سکوت سننے والا ہی نہیں کس کو پکارا جائے

چلو ڈھونڈیں مہ عید رفاقت ہے گرچہ عہد .... رفاقت

کیسا اس شہر محبت پہ زوال آیا ہے اب ہمارا ہی کوئی ہے نہ تمہارا کوئی

جس اجنبیت، بیگانگی اور تنہائی کے دکھ کو موضوع بنایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ موجودہ عہد کے تقریباً اور جدید شعرا میں عموماً یہ رویہ اور اس کا اظہا روافر مقدار میں موجود ہے۔اس طرح کے خیالات اور احساسات کو جدیدیت کے لیبل زدہ شاعر نے بالکل فرسودہ بنا کر رکھ دیا تھا۔طارق متین کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ تجربات اوپر سے اوڑھے ہوئے نہیں ہیں اور مصنوعی اظہار کے برخلاف یہاں شاعر کے انفرادی رنگ وآہنگ کے ساتھ معرض اظہار میں آئے ہیں۔

ازل سے تا ابد اک سلسلہ معصومیت کا ہے وہاں سے بےخبر آؤں، یہاں سے بےخبر جاؤں

وجود کی بے معنویت یا عدم کی حقیقت کو ایک لفظ 'معصومیت' کے ذریعہ اثبات عطا کر دیا گیا ہے۔ازل تا ابد انسان کی بےخبری اور خود اس کی ذات کے حوالے سے 'لا' کا سفر عارضی زندگی اور موت کے بعد کی دائمی زندگی کے نظریوں کے زیر اثر لایعنی ہو گیا ہے۔انسان کو موجود ہونا بھی اس کے غیر موجود ہونے کی علامت ہے۔اپنی ذات اور وجود کے عرفان سے عدم واقفیت کی نمایاں مثال کے طور پر طارق متین کا درج بالا شعر قابل مطالعہ ہے۔

دھند باہر ہے، مگر روشنی اندر تو رہے کوئی قندیل ان آنکھوں میں منور تو رہے

گزشتہ صفحات میں میں نے کہیں ذکر کیا کہ طارق متین کے یہاں قنوطیت کا شائبہ بھی نہیں ہے اور ہر حال میں شاعر کے اندر جینے کی امنگ موجود رہتی ہے۔میری بات کی تصدیق کے لیے طارق صاحب کا یہ شعر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔لفظ 'باہر' شاعر کے جسمانی اور اعصابی حوالے سے حالات کی ستم ظریفی کے تحت پیدا ہوئے ضعف کی علامت بھی بن جاتا ہے اور اسی کیساتھ دنیا اور اہل دنیا کے شب و روز کا استعارہ بھی۔شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ ظاہر و باطن کو ایک نہیں ہونے دیتا۔مایوس کن فضا میں بھی اپنی ذات کو مضمحل ہونے سے بچا لیتا ہے۔اس کے علاوہ شعر میں دھند کی مناسبت سے روشنی اور روشنی کے لیے قندیل اور پھر منور، ان تمام لفظوں میں جو مناسبت ہے، وہ کمال کی چیزیں ہیں۔دوسرا کمال اس شعر میں یہ ہے کہ انسان

کی چمکتی ہوئی روشن آنکھیں اس کی ذہنی اورروحانی کیفیات کا اشارہ بھی ہوتی ہیں، لہٰذا آنکھوں کے منور ہونے کے خیال نے باہر کی دھندآمیز فضا کو شاعر کے نزدیک بالکل بھی لایعنی بنادیا ہے۔

جدیدغزل نے روایتی لفظیات کے استعمال کے معاملے میں خود کو روایتی معنی ومفہوم سے آزاد کرلیا ہے۔ جدید شاعر پرانی لفظیات کو نئے معنی عطا کرنے میں یقین رکھتا ہے۔ نئے شاعر کا یہ رویہ روایت سے آگہی کا ثبوت بھی ہے اور وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے احساسات و جذبات کی ترجمانی کا حوالہ بھی۔ طارق متین نے عشقیہ موضوعات و تجربات کے ذیل میں جو اشعار کہے ہیں، وہ روایتی انداز کے عشقیہ تجربات سے مختلف اور نئی شاعری کے حوالے سے اہم تصور کیے جاسکتے ہیں۔ لفظیات کے استعمال سے قطع نظر، شاعر کے احساس اور تجربے کی پیشکش کے مدنظر ان اشعار کی اثر پذیری اور جاذبیت کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

تیری شیریں سخنی کھینچ کے لائی ہے مجھے   یار میں اپنی ضرورت سے نہیں آیا ہوں
ملکۂ شہر وفا تیری گلی میں آکر   صدقۂ جاں بھی نہ دیں ہم تو محبت کیسی
اب وہ مسرتیں کہاں، پہلی سی فرصتیں کہاں   دشت میں محو گفتگو، چشم غزال اور ملیں
تو سرایت ہے مرے جسم میں جاناں پھر بھی   مثل آہو ہے بہت مجھ سے گریزاں پھر بھی
چند لمحے کی ملاقات کو عرصہ گزرا   خوشبوئے دوست ابھی تک مری پوشاک میں ہے
تم نے یہ وہم عجب پال رکھا ہے طارق   اس کی صورت نہیں دیکھوگے تو مرجاؤگے

نئی شاعری یا نئی غزل میں انسان کے وجودی مسائل کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ اس کے بیان میں لفظیات کو جن استعاروں اور علامتوں کے تحت برتا گیا ہے وہ روایتی ہوتے ہوئے نئی معنویت اور نئے تناظر میں سامنے آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے غزل یا شاعری کی زبان میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں طارق متین کے ایسے ہی شعروں کا مطالعہ ناگزیر ہے، جن کے زریعہ نہ صرف ان کے شعری اسلوب کے استحکام کا اندازہ ہو بلکہ جدید غزل کو روایت سے آزاد کرنے والے اسالیب میں ایک اہم اسلوب سے مزین اشعار کا مطالعہ بھی کیا جائے۔

معاصر انسان کے خواب درخواب زندہ رہنے اور جینے کے طریقہ پر اظہار:

خواب دکھلاتا ہے خواب سحر بھی کیا کیا   مجھ کو دیتی ہے خبر، بے خبری بھی کیا کیا

انسان کے شعوری عمل وقوت پر نئے انداز سے سوچنے کا رویہ:

برف کی سل ہے کوئی وقت کے تہہ خانے میں   اور کیا راز ہے اذہان کے شل ہونے کا

موجودہ عہد کے انتشار اور شخصیت کے دولخت ہو جانے کا المیہ:

گھر میں بیٹھوں تو شناسائی برا مانتی ہے باہر آجاؤں تو تنہائی برا مانتی ہے

اور کچھ اشعار دیکھیں:

لوگ اسباب کی دریوزہ گری میں گم ہیں ہم تو بس مشغلۂ جامہ دری میں گم ہیں
یہاں کے لوگ ہیں بس اپنے ہی خیال میں گم کوئی عروج میں گم ہے،کوئی زوال میں گم
یہ شہر خود نگراں ہے نکل چلو طارق ہر ایک شخص ہے اپنے ہی خدوخال میں گم
صاحبو! سن کے حکایاتِ جواں مرگیِ دل صبر کرنا بھی تو مشکل ہے،مگر کرلیا جائے
جانے کب سے ذہن میں سلگا ہوا ہے یہ سوال اتنی عریانی سر بازار رکھ جاتا ہے کون

ان شعروں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ اسلوب، آسانی سے دستیاب ہوجانے والا اسلوب نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پس پردہ وہ ریاضت اور خون جگر کی کارفرمائی نظر آتی ہے جس کی بدولت ایک فن کار اپنے فن کو جلا بخشتا ہے۔ طارق متین نے غزل کو اپنے فکری اظہار کا وسیلہ بنا کر جو تخلیقی نمونے پیش کیے ہیں وہ نئے شعری احساس اور لب ولہجہ کے ضامن ہیں۔ علاوہ بریں زبان و بیان پر مکمل گرفت کے ساتھ ہی جس شعری زبان کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا ہے اس کی جاذبیت اور اثر پذیری قاری کو مسحور کردینے کے فن اور سلیقے سے مزین ہے۔ تجربات کی پیشکش اور تہذیبی و ثقافتی اشارے جس سلیقے سے طارق متین کے یہاں بروئے کار آتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کے اشعار باطن میں اتر کر جمالیاتی احساس اور کیفیات پیدا کرنے کے وصف سے متصف ہیں۔ ان کے شعروں میں بیرون سے اندرون ذات کی طرف مراجعت کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے یعنی باطن کے انکشاف اور ذات کے عرفان اور جستجو کی کرید بھی طارق متین کے فکری جہات کا پتہ دیتی ہے۔ طارق متین کے شعری اسلوب، جاذب طریقۂ اظہار اور اثر پذیر انداز و بیان کے مدنظر ان کے دعوے کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی، جب وہ کہتے ہیں کہ:

ایک جادو سا سر بزم ہنر کرتے ہیں
دل میں بس جاتے ہیں ہم، ذہن میں گھر کرتے ہیں

◄◄ ● ►►

Department of Urdu
Jagjiwan college
New Police Line Chandwa
Ara Bhojpur Bihar 802312
Mob: 8770786313

● ڈاکٹر تسلیم عارف

طارق متین کی غزلیہ شاعری: ایک جائزہ

طارق متین لکھمنیا کے اُن نوجوان شعرا میں ہیں جنھوں نے اپنی شاعرانہ لیاقت سے اردو کے ادبی حلقے میں اپنی اچھی خاصی پہچان بنالی ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا اور اپنی ریاضت اور محنت سے دن بہ دن آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اُن کی غزلوں نے اردو کے ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل کی اور کئی بڑے ناقدین نے جن میں شمس الرحمان فاروقی بھی شامل ہیں، ان کے کلام کی تعریف کی۔ شاعری کے علاوہ انھوں نے اپنی ادارت میں چند عمدہ رسائل بھی نکالے۔ 'علم وادب'، 'گل وصنوبر' اور 'سخن وراں' ان کی مدیرانہ صلاحیت کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ سیاست کی طرف ان کا جھکاو سنہ ۲۰۰۰ء سے ہوا لیکن شاعری کا ذوق اور ادب دوستی ہنوز قائم و دائم ہے۔ طارق متین کے یہاں محض حسن و عشق کی باتیں نہیں ہوتی ہیں بلکہ سماجی وسیاسی مسائل، انسانی شخصیت کی تہہ دار باتیں جو اقوالِ زرّیں کے مانند ہوتی ہیں، بھی موجود ہیں۔ حبّ الوطنی اور حمد باری تعالیٰ کے اشعار بھی جا بجا اُن کے کلام کی زینت بنتے ہیں۔ حوالۂ آخرت اور اعلا انسانی قدریں بھی ان کے کلام میں کثرت سے دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اپنی تہذیب سے لگاو اور اس پر فخر کا اظہار بھی ان کے کلام کا امتیازی وصف ہے۔ وہ نہ صرف موضوعاتی سطح پر بلکہ فنی سطح پر بھی ہمیں محظوظ کرتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں وہ اپنی باتیں پیش کرنا پسند کرتے ہیں اور کلام میں مناظرِ فطرت کے ذریعے ترسیلی فضا ہموار کرتے ہیں۔ کہیں کہیں الفاظ کے ذریعے وہ اچھا شعری آہنگ بھی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

طارق متین کے یہاں جہاں جہاں حمد باری تعالیٰ کے اشعار آئے ہیں، وہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 'اِک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے' کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں کہیں خدا کی ذات کو پہچاننے کی کوشش ملتی ہے تو کہیں اُس کی خلاّقانہ صفت پر غور وخوض کی دعوت ہے۔ کہیں اُس کی مغفرت و عذاب کا موازنہ ہے تو کہیں اُس کی امان میں رہنے کو حفاظت کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ایسے اشعار طارق متین کے مذہبی رجحان کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کے تئیں اُن کے مضبوط یقین کا

بھی ثبوت دیتے ہیں۔حمد باری تعالیٰ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

قلم عاجز،زباں بے بس ہے اس کی حمد میں صاحب — خدائے لم یزل کی کیا ثنا خوانی کریں گے ہم
کوئی طاقت ہے جو ہر شے پہ اثر رکھتی ہے — سیپ کی ذات میں قطرے کو گہر رکھتی ہے
نہیں ہے خوف اگر آگ اُگل رہی ہے زمیں — کہ رحمتوں کی یہ چھائی ہوئی گھٹا بھی تو ہے
مرے یقیں کی حفاظت مرے خدا کرنا — وہ بے خطر ہے جو تیری اماں میں رہتا ہے
اُسی سے لطف وعنایت کا سلسلہ بھی تو ہے — یہ کائنات ہے جس کی وہی خدا بھی تو ہے

پہلے شعر میں جس طرح زوردار الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے،ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی شانِ قہاری وجباری کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔اگر پہلے مصرعے کے پہلے دو حصے بلند آواز میں ٹھہر ٹھہر کر ادا کیے جائیں تو زبردست آہنگ پیدا ہوتا ہے۔خالق کی عظیم ہستی کا حق ادا کرنے کے لیے الفاظ کا انتخاب مشکل ترین عمل ہے لیکن طارق متین نے جس سلیقے سے ان اشعار میں الفاظ کا استعمال کیا ہے،وہ قابلِ تحسین ہے۔طارق متین کے یہاں عموماً بھاری بھرکم الفاظ سے گریز کی کیفیت ملتی ہے،لہٰذا زیادہ تر موقعوں پر گنجلک خیال سے گریز اور سادہ زبان کا استعمال نظر آتا ہے۔آخری شعر کا خیال معروف شعر''کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے وہی خدا ہے'' سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔طارق متین کا انداز بھی سادہ ہے لیکن اِس شعر کی سادگی تک وہ نہیں پہنچ پائے ہیں۔طارق متین نے خدا کو کائنات کے مالک کی شکل میں پہچانا ہے لیکن جو وزن'وہی خدا ہے' کے استعمال سے پہلے شعر میں پیدا ہو رہا ہے اس کی شدت'وہی خدا بھی تو ہے' میں پیدا نہیں ہو پاتی۔اگر چہ دونوں باتوں میں مماثلت ہے لیکن طارق متین کا اندازِ بیان اس مضمون کی آنچ کو مدّھم کر دیتا ہے۔

دوسرا شعر اگر چہ سادہ معلوم ہوتا ہے اور مصرعِ اولیٰ میں خدا کی قدرت کے اعتراف کے بعد دوسرے مصرعے میں اسے بالکل سامنے کی مثال سے واضح کیا گیا ہے لیکن یہاں طارق متین کی شاعرانہ ہنر مندی کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔دوسرے مصرعے میں سیپ،قطرہ،گہر کا بیان بالترتیب کیا گیا ہے لیکن ذرا غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تخلیق کا پورا فلسفہ انھوں نے ایک مصرعے میں سیپ،قطرے اور گہر کے استعارے میں بیان کر دیا ہے۔یہاں طارق متین نے شعر میں جن الفاظ کو منتخب کیا ہے،اُس سے شعر کی تہہ داری میں اضافہ ہو گیا ہے۔

طارق متین کے کلام میں ترسیل کے لیے قدرتی مناظر کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔وہ لفظوں سے ایسی فضا تیار کرتے ہیں کہ قاری اُن کے تعمیر کردہ مناظر میں بہ ذاتِ خود موجود ہونے کا تصور کرنے کو مجبور ہو جاتا ہے۔اُن کے کلام میں مناظرِ فطرت کو پیش کرنے کا ایک سلیقہ ہے جس سے تمام باتوں کے

اظہار میں وہ کسی نہ کسی طرح ان مناظر کی پیش کش کی گنجائش نکال ہی لیتے ہیں۔ یہاں دہکتی آگ ، شبنم،گلشنِ دہر، جامۂ گل،صبر کا باندھ، کڑی دھوپ،طوفان، کہکشاں ،چاندنی ،نکہتِ گل،جنگل ، بادِ صبا،فلک پیمائیاں وغیرہ جیسے الفاظ وتراکیب اس ہنرمندی سے استعمال کیے گئے ہیں کہ وہ ہمارے ذہن میں اپنا دیر پا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ اشعار زندگی کے مختلف رنگ پیش کرتے ہیں لیکن کسی جگہ مناظرِ قدرت کی پیش کش کا موقع طارق متین ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مدّتوں خود کو جلایا ہے کڑی دھوپ میں جب ایک دیوار ملی، تھوڑا سا سایہ ہوا ہے
صبر کا باندھ کہیں ٹوٹ نہ جائے طارق درد اُٹھتا ہے مگر ضبط کیے لیتے ہیں
گلشنِ دہر کو ہم نے ہی دیا جامۂ گل ہم ہی پھرتے ہیں یہاں چاک گریباں پھر بھی
کرشمہ یہ بھی دیکھا ہے زمانے کی نگاہوں نے دہکتی آگ کو پل بھر میں شبنم کر دیا اُس نے
نہیں ہے خوف اگر آگ اُگل رہی ہے زمیں کہ رحمتوں کی یہ چھائی ہوئی گھٹا بھی تو ہے

طارق متین کے یہاں تہذیب کا حوالہ بار بار آتا ہے۔انھیں اپنی تہذیب اور اپنی جڑوں سے دوری بالکل منظور نہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس کے حمایتی وقدرداں ہیں بلکہ اس کے بغیر اپنا وجود بے معنی تسلیم کرتے ہیں۔ایسے میں وہ ہمیں اردو کے اُن عظیم شعرا و ادبا کی یاد دلاتے ہیں جو تہذیب وتمدن کے سلسلے سے ہمیشہ خود پر ناز کیا کرتے تھے اور اسے دل سے عزیز رکھتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نیا نیا ہے سبھی کچھ مگر سرشت مری پرانی رسم، پرانے رواج چاہتی ہے
اتنا آسان نہیں خود کو سنبھالے رکھنا اپنی بنیاد نہ چھوڑو کہ بکھر جاؤ گے
میرے اجداد کی عظمت کا جو آئینہ تھا کاش مل جائے مجھے پھر وہ نگینہ اپنا
طارق مرے پُرکھوں کی ہے میراث سلامت تہذیب و تمدّن کا یہ زیور نہیں اترا
انمول ہے تہذیب و تمدن کا یہ موتی اس گوہرِ نایاب کو کھویا نہیں کرتے

دنیا میں بہترین اور کامیاب قومیں وہی سمجھی جاتی ہیں جنھوں نے ترقی کے باوجود اپنی تہذیب کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ تہذیب سے محبت کا ایک جزو اپنے وطن سے محبت بھی ہے۔ حبّ الوطنی بھی طارق متین کی غزلوں کا اکثر حصہ بنتی ہے۔ وہ اپنے آبائی وطن لکھمنیا پر ناز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لکھمنیا سے متعلق ان کی ایک پوری غزل موجود ہے۔اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو لکھنؤ سے موسوم ہے شہرِ لکھمنیا اُسی دیارِ محبت نشاں کے ہم بھی ہیں
جو ابتدا ہی سے تہذیب کا ہے گہوارا بڑا غرور ہے ہم کو وہاں کے ہم بھی ہیں

هم اپنا نام و نَسب کیا بتائیں اے طارق   جولٹ گیا ہے، اُسی کارواں کے ہم بھی ہیں

آخری شعر سے میرتقی میر کے قطعہ 'کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!' کے آخری شعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میر اپنے ناگفتہ بہہ حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے وطن کی تباہی و بربادی کا حال بیان کرتے ہیں، وہیں طارق متین اپنے وطن پر ناز کرتے ہوئے اس بکھراو کا حال بیان کر رہے ہیں۔ میر اپنی بات پیش کرنے کے لیے پہلے ہی مصرعے سے ایسی فضابندی کرتے ہیں کہ آخر میں میر کے بیان سے اُن کے ساتھ ہماری ہم دردی قائم ہو جاتی ہے لیکن طارق متین نے اس غزل میں جو فضابندی کی ہے، اس سے آخری بیان قاری کو چونکانے کا کام کرتا ہے۔ میر سے مقابلہ مقصود نہیں لیکن طارق متین نے بھی تہذیبی زوال اور زیاں کا منظر نامہ اپنے شعر میں پیش کرنے میں کامیابی پائی ہے۔

طارق متین بنیادی طور پر تو شاعر ہی ہیں لیکن سنہ ۲۰۰۰ء سے اُن کا لگاو سیاست سے بھی ہو گیا، جس میں اپنی سرگرمی کا بھی وہ احساس دلاتے رہے ہیں۔ لہٰذا ایک حساس ادیب ہونے کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ ان تجربات سے متاثر ہوں۔ وہ اپنے سیاسی جذبات و تجربات کو کبھی انقلاب کا اور کبھی سرداری کا نام دے کر کلام کا حصہ بناتے ہیں اور ایسے اشعار میں اُن کا لہجہ ترقی پسند شعرا کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف سماجی مسائل تو اُن کے کلام کا جا بجا حصہ بنتے ہی رہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

انقلاب: ہم اہلِ جنوں، چاک جگر، چاک گریباں   زخموں کو ہرا رکھتے ہیں، دھویا نہیں کرتے
کوئی آوازِ جرس آئے تو ہم بھی طارق   اپنی سوئی ہوئی راہوں کو جگانے لگ جائیں
مجھ سے پوچھتا ہے مرا عزمِ سفر   دل میں طوفان لیے اب کے کدھر جاؤ گے
گلشنِ دہر کو ہم نے ہی دیا جامۂ گل   ہم ہی پھرتے ہیں یہاں چاک گریباں پھر بھی

سرداری: کوئی چارہ نہیں اس ذہن کی بیماری کا   سب کو سودا ہے یہاں اپنی ہی سرداری کا
یہ کیسا روگ سب کو لگ گیا ہے   کہ طارق شوقِ سرداری بہت ہے
بدل لیا ہے فقیری نے بھی لباس اپنا   یہ بوریا نہیں اب تخت و تاج چاہتی ہے

مختلف مسائل: یہ صرف وعدۂ فردا سے ٹل نہیں سکتی   امیرِ شہر! رعایا اناج چاہتی ہے
فقط یہی ہے ہمارے دل و نظر کی طلب   محبتوں سے مزین سماج چاہتی ہے
در پردہ روشنی کے ہیں دشمن بنے ہوئے   جو لوگ کہہ رہے ہیں، اندھیرا نہیں کرو
چلو کہ حاکمِ اعلا سے چل کے پوچھتے ہیں   یہ ابتری جو رہے گی وطن کا کیا ہوگا

عشقیہ موضوعات میں طارق متین محبوب کی سراپا نگاری میں اپنے ہاتھ آزماتے نظر آتے ہیں۔

اپنی معشوقہ کی سانولی رنگت سے وہ کافی متاثر نظر آتے ہیں ۔انھوں نے اپنے کلام میں اس کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔محبوبہ کی تعریف میں کہے گئے ان اشعار میں محمد قلی قطب شاہ کی اُن نظموں کی جھلک ملتی ہے جوانھوں نے اپنی بارہ پیاریوں کے لیے کہی تھیں۔طارق متین نے بھی اپنی محبوبہ کے لیےایک پوری غزل رقم کی ہے۔اس قبیل کے اشعار میں طارق متین نے جوانداز اختیار کیا ہے، وہ انھیں دکنی شعرا کے قریب کر دیتا ہے۔جہاں معشوق کا خیالی نہیں بلکہ حقیقی بیان بے حد ہنر مندی اور فن کاری کے ساتھ کیا جا تا تھا۔چنداشعار ملاحظہ ہوں:

وہ چھریرا سا بدن ،سانولی رنگت اُس کی — اک قیامت سےتو کچھ کم نہیں قامت اُس کی
مجھ کو دیوانہ بنانے کے لیے کافی ہے — وہ نزاکت ،وہ لطافت ،وہ صباحت اُس کی
وہ نہیں ہوتی تو میں کب کا فنا ہوجاتا — میرے جینے کا بہانہ ہے محبت اُس کی

طارق متین ماقبل شعرا کے خیالات کوبھی اپنے انداز واسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پران باتوں کو پرکھنے کے بعد بیان کرتے ہیں۔اس قبیل کے چنداشعار ملاحظہ ہوں:

نظر اپنے سوا کچھ بھی نہ آئے جس بلندی سے — یہی بہتر ہے یارب اُس بلندی سے اُتر جاؤں

اس شعر کا خیال مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ نظر آتا ہے:

جس جگہ جا کے انسان چھوٹا لگے — اس بلندی پہ جانا نہیں چاہیے

دونوں اشعار کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے شعر میں ایک شخص اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے دعا گو ہےاوراس بلندی کوترک کرنا چاہتا ہے۔دوسرے شعر میں اگر چہ محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے کو نصیحت دی جارہی ہے لیکن یہ قول ایک تجربہ کار جہاں دیدہ شخص کا معلوم ہوتا ہے۔پھر شاعری کا بڑا کمال یہ ہے کہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا جائے ۔لہٰذا طارق متین کا شعراس معاملے میں تھوڑا کمزور پڑ جاتا ہے۔اسی طرح اختر الایمان کی نظم 'ایک لڑکا' کے اختتام پر اختر الایمان لڑکے (یعنی اپنے ضمیر) کا قول نقل کرتے ہیں۔

یہ کذب وافترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو! میں زندہ ہوں

طارق متین اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

بڑی مشکل میں ہوں طارق کہ یہ میرا ضمیر اکثر — مجھے چپکے سے کہتا ہے اگر کہیے تو مر جاؤں

اختر الایمان نے نظم کی جوفضا ابتدا سے انجام تک تیار کی ہے، اس میں انھوں نے اپنے دل کی

امنگوں اورخواہشوں کا بیان کر کے زمانے اور وقت کے ہاتھوں تل تل مرنے کے بیان کو اصل موضوع بنایا ہے اور جب انھیں اپنے ضمیر کو دبا کر، حق کو چھپا کر کچھ کرنا پڑا تو اُس لڑکے (ضمیر) نے انھیں ٹوکا: 'یہ لڑکا پوچھتا ہے، اختر الایمان تم ہی ہو' یعنی اُن کے ضمیر نے ہر نا گفتہ بہہ کیفیت کے وقت یہ احساس دلایا کہ یہ کام غلط ہے۔ آخر میں بے حد پُر اثر کلائمکس پر یہ نظم ختم ہوئی ہے جس کا آخری مصرع اوپر درج کیا گیا ہے۔ طارق متین نے غزل کی ہیئت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس پورے واقعے کو بیان کیے بغیر محض پس منظر کے طور پر سامنے رکھا ہے اور بار بار اپنی موجودگی کا احساس کرانے والے ضمیر کی جگہ موت کی اجازت مانگنے والے ضمیر کو پیش کیا ہے۔ یہ ایک حقیقی امر ہے کہ جب ہم ایسے حالات سے دوچار ہوتے ہیں کہ کسی کام کو نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتا ہے تو ایسا کرتے ہوئے شرمندگی اور غلطی کا احساس دامن گیر ہوتا ہے۔ طارق متین نے بے حد ہنرمندی سے اس شعر میں 'چپکے سے کہنے' کا فقرہ استعمال کر کے دل کے اندر چل رہی کشمکش کو زبان عطا کر دی ہے۔ اس سے یہ شعر زیادہ معنی خیز اور پُر اثر ہو گیا ہے۔ حالاں کہ یہ شعر 'ایک لڑکا' کے کلائمکس کی برابری تو نہیں کر پاتا لیکن اپنے اندازِ بیان کی وجہ سے کافی عمدہ ہو گیا ہے۔

اسی طرح خلیل الرحمان اعظمی کا مشہور شعر ہے:

یاروں نے خوب جا کے زمانے سے صلح کی　　　میں ایسا بدماغ یہاں بھی بچھڑ گیا

طارق متین کہتے ہیں:

ہم عہدِ گذشتہ کی امانت ہیں سو طارق　　　اس دور میں جینے کا ہنر ہی نہیں آیا

خلیل الرحمان اعظمی نے ابن الوقت بننا منظور نہیں کیا اور دوسروں پر طنز کرتے ہوئے خود کو ''بد دماغ'' قرار دیتے ہیں۔ طارق متین اس خیال کو الگ زاویے سے پیش کرتے ہیں اور خود کو عہدِ گذشتہ کی امانت بتاتے ہوئے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھیں 'اس دور میں جینے کا ہنر ہی نہیں آیا'۔ دونوں باتوں کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے لیکن دونوں شعرا نے اپنے اپنے ٹریٹمنٹ سے ان کو بنایا اور سنوارا ہے۔ خلیل الرحمان اعظمی نے جس طرح طنز کا استعمال کر کے اس شعر کو اعلا پائے کا بنا دیا ہے اس کے مقابلے طارق متین کا شعر ایک سادہ ہے لیکن 'عہدِ گذشتہ کی امانت' سے معنویت کی سطح گہری ہو جاتی ہے۔

طارق متین کے کئی اشعار ایسے ہیں جن کو ہم اقوالِ زرّیں کے خانے میں جگہ دے سکتے ہیں۔ وہ ان اشعار میں کہیں محاوروں اور کہاوتوں سے استفادہ کرتے ہیں تو کہیں زندگی کے تجربے کو اقوال کی شکل دے دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

جب پیڑ نہیں تھا تو رہی پیڑ کی حسرت　　　جب پیڑ لگایا تو ثمر ہی نہیں آیا

یہ شعر ایک کہاوت ''دانت ہے تو چنا نہیں، چنا ہے تو دانت نہیں'' سے مماثل نظر آتا ہے۔

مال و اسباب پہ اِترا تو رہے ہو لیکن ایک ہی گھر میں ہمیشہ کہیں دَھن رہتا ہے
یہ آپ کے حسیں کردار کی ضمانت ہے زباں کا پاس بھی رکھیے زبان دیتے ہوئے
فلک کی سیر میاں حوصلوں سے ہوتی ہے یہ کہہ گیا ہے پرندہ اُڑان دیتے ہوئے
یہ دنیا ہے، یہاں دکھ درد کی بہتات ہے طارق خوشی کا لاپتا ہونا، ضروری تھا، ضروری ہے
سب کی قسمت میں نہیں ہوتی فلک پیمائیاں پھر بھی اُڑنے کے لیے شہپر بنانا چاہیے

آخری شعر میں طارق متین کا منشا مثبت نظر آتا ہے۔ وہ ناکامی یا ہار کے ڈر سے بڑے خواب دیکھنے سے رک جانے کے خلاف ہیں۔ انھیں یہ بھی پتا ہے کہ 'کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا' لیکن اس کے باوجود اُن کا پیغام ہے کہ کوشش کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ یہ شعر ہمت بڑھانے کے لیے confidence booster کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہر دور میں شعرا نے صنفِ سخن اور اپنی شاعری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس سے شاعری کے بارے میں شاعر کے ذہنی تصورات واضح ہوتے ہیں۔ ملا وجہی سے لے کر اقبال اور عہدِ حاضر کے شعرا تک سبھی نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ طارق متین نے بھی اپنے کلام اور صنفِ سخن کے متعلق مختلف اشعار رقم کیے ہیں۔ اُن کے یہاں بیش تر موقعوں پر ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن کا تعلق اسی قبیل سے ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

طارق مرے شعروں کا انداز نرالا ہے چڑھتا ہوا دریا ہے، موجوں کی روانی ہے
ہمیں ہیں رونقِ بزمِ سخن وراں طارق ہمارے نام سے روشن ہیں شاعری کے چراغ
یوں ہی نہیں ملا مجھے طارق یہ امتیاز یہ فنِ شعر گوئی ریاضت سے آیا ہے
اپنی پہچان بنایا ہوں تو آیا ہوں یہاں ''میں کسی بابِ رعایت سے نہیں آیا ہوں''
جب آسمانِ سماعت میں در نکلتا ہے مرے سخن کے پرندے کو پَر نکلتا ہے
شاعری کی یہی خوبی ہے کہ جادو بن کر دل میں بس جاتی ہے اور ذہن میں گھر کرتی ہے

تیسرے اور چوتھے شعر میں جو انداز ہے، وہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ طارق متین کو اس بات کا بجا طور پر فخر ہے کہ وہ اپنی محنت، لگن اور ریاضت سے شاعری کے اس راستے پر گامزن ہیں۔ وہ کسی کے احسان یا کسی بابِ رعایت سے اس شہرت کے پانے والے نہیں ہوئے ہیں۔ یہاں اُنھوں نے اُن نام نہاد شعرا (متشاعروں) پر گہری چوٹ کی ہے جو آج کل مشاعروں میں دوسروں کا کلام سُنا کر بے شرمی اور بے حیائی سے

شاعر ہونے کا دعوا کر کے داد وصول کرتے ہیں۔ پہلے اور پانچویں شعر میں اپنے کلام کی خصوصیات کی جانب وہ ہمیں متوجہ کرتے ہیں۔ پانچواں شعر کافی مشہور ہے۔اس میں جن الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے، انھیں بہ آوازِ بلند ادا کرنے پر ایک الگ ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے قصیدے کی بلند آہنگی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

طارق متین کے یہاں بہترین اشعار کی کمی نہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے قلم سے یہ اشعار نکل کر سیدھے قاری کے دل میں سرایت کرتے جاتے ہیں۔ یہاں کہیں دنیاوی دھوکہ بازی کو موضوع بنایا جاتا ہے تو کہیں بڑے خواب دیکھنے کا حوصلہ دیا جاتا ہے، کہیں رشتوں کی پامالی کا شکوہ ہے تو کہیں اپنی دربدری پر وہ فخر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔طارق متین کے چند بہترین شعر ملاحظہ فرمائیں :

طارق دکھائی دربدری نے وہ راہِ زیست ملنے لگا قرار ہمیں انتشار میں
وارفتگی شوق نے دیوانہ کر دیا ہم خود کو ڈھونڈنے لگے تصویرِ یار میں
ایک گرتی ہوئی دیوار ہوں طارق صاحب منتظر ہوں کہ کوئی آ کے سنبھالے مجھ کو
تصنع کی عمل داری بہت ہے جدھر دیکھو اداکاری بہت ہے
شبِ فراق ہو یا صبحِ آرزوے وصال ہم اپنے دل کی لگن کو بڑھائے جاتے ہیں
سب کی قسمت میں نہیں ہوتی فلک پیمائیاں پھر بھی اُڑنے کے لیے شہپر بنانا چاہیے

طارق متین کے یہاں کچھ ایسی بھی غزلیں ملتی ہیں جو اپنے آہنگ کی وجہ سے متاثر کرتی ہیں۔ ان اشعار کو ترنم کے ساتھ ادا کیجیے تو وجدانی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو سراج کی مشہورِ زمانہ زمین ''خبرِ تحیر عشق سُن'' پر کہی گئی ہے۔

کوئی ایسی شامِ وصال ہو جو مثالِ صبح ادا رہے وہی میں رہوں، وہی تو رہے، ترا حسنِ جلوہ نما رہے
کوئی جستجوے جمال ہو، کوئی آرزوے کمال ہو مری روح سے تری روح تک، یہ جو سلسلہ ہے بنا رہے
یہ محبتوں کا جو درد ہے، کبھی گرم ہے، کبھی سرد ہے یہ گلاب ہے تو کھلا رہے، یہ چراغ ہے تو جلا رہے

اسی طرح خوش آہنگی سے لبریز ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ترے خواب آنکھوں میں آ گئے، مرے بام و در کو سجا گئے کبھی رات بن کے سُلا گئے، کبھی صبح بن کے جگا گئے
وہ محبتیں بھی عجیب تھیں، وہ رفاقتیں بھی عجیب تھیں وہ عجب دیار تھا دوستو، جہاں جان اپنی کھپا گئے
مری زندگی تو عذاب تھی تری اک نظر سے پلٹ گئی کئی خوشبوئیں ہوئیں ہم سفر، کئی رنگ مجھ میں سما گئے

طارق متین کی غزلوں میں ہمیں زندگی کے مختلف شیڈس (Shades) نظر آتے ہیں۔وہ نہ صرف موضوعات کی سطح پر کافی حساس نظر آتے ہیں بلکہ اُسے برتنے میں بھی کافی محنت سے کام لیتے

ہیں۔ان کے پاس سادہ زبان ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ وہ الفاظ کے موزوں استعمال سے واقف ہیں۔وہ دھیمے لہجے میں اپنی باتیں پیش کرتے ہیں۔عشقیہ شاعری میں وہ کلاسیکی شعرا کے قریب ہیں اور محمد قلی قطب شاہ، ولی اور سراج سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔سیاسی اور سماجی مسائل سے وہ اپنے کلام میں احتجاج تو پیدا کرتے ہیں لیکن اُن کا سُر پنچم نہیں بنتا کہ اعلان نامے کا الزام عائد ہو۔اس کے باوجود اس امر سے انکار مشکل ہے کہ طارق متین عہدِ حاضر کے شعرا میں موضوعات کے تنوع اور سادہ اندازِ بیان کی وجہ سے ایک نمایاں مقام کے حامل ہیں۔

Assistant Professor, Department of Urdu,
SSV College, Kahalgaon, Bhagalpur, Bihar-813203
E.Mail: tasleem171@gmail.com,
Mobile & WhatsApp No: 7004846692

ثالث کی ڈاک

نام کتاب: گردسفر
صنف: ناول
مصنف: شعیب نظام

نام کتاب: آشانگر کی چال
صنف: ناولٹ
مصنف: نورالحسنین

نام کتاب: غم کی دھرتی
صنف: غزلیں
مصنف: سعید نظر

نام کتاب: تاثرات
صنف: اظہار خیال
مصنف: انوارالحسن وسطوی

نام کتاب: ارمغان رافق
صنف: انشائیہ
مصنف: ڈاکٹر سید محمد رافق زماں

نام رسالہ: ابجد (ارریہ، بہار)
جلد: ۱۶، شمارہ، ۱، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۵
مدیر: رفیع حیدر انجم قیمت: ۱۰۰ روپے

● ڈاکٹر محمد ذاکر حسین

طارق متین کی حریتِ فکر

غزال درد کے آئینے میں

حریتِ فکر سماجی اور معاشرتی زندگی میں پائے جانے والے تضادات، نا قابل برداشت ظالمانہ اقدامات، سماجی ناہمواریوں، عدم مساوات اور بے اعتدالیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا نام ہے۔ایک زیرک اور حساس تخلیق کار کے قلب وروح کو حریتِ فکر مسرت کے لازوال احساس سے ہم کنار کرتی ہے۔ اوراس کا یہی ادب سرمۂ بینا ثابت ہوتا ہے۔فسطائی طاقتوں کے سامنے مستقل مزاجی سے حق وصداقت پر ڈٹ جانا اور حریتِ فکر کے اظہار میں کسی 'مصلحت' کو نہ آنے دینا ہی ایک ادیب کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔اردو شاعری میں حریت فکر کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت ہے۔مطلق العنان شہنشاہیت کے زمانے میں بھی اردو شاعروں نے حریتِ فکر کی مثال قائم کی اور حق وصداقت کی آواز بلند کرنے میں کسی جھجھک کو اپنے راستے کا پتھر نہیں بننے دیا۔ بلکہ اپنی حریتِ فکر کے تیشے سے شہنشاہیت کے بلند و بالا ایوانوں پر ایسی کاری ضرب لگائی جس کی ٹیس سے اس کے مکیں لہولہان ہوگئے۔جعفر زٹلی نے تو اسی حریتِ فکر کے جذبے کے تحت اپنی جان گنوادی لیکن اس جذبہ کو سرد نہیں ہونے دیا:

گیا اخلاص عالم سے عجب کچھ دور آیا ہے ڈرے سب خلق ظالم سے عجب کچھ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری، نہ بھائیوں میں وفاداری محبت اٹھ گئی ساری عجب کچھ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی اتاری شرم کی لوئی عجب کچھ دور آیا ہے

جعفر زٹلی سے حریتِ فکر کی جو یہ روایت شروع ہوئی وہ ولی، حاتم، آبرو، ناجی، میر، سودا اور نظیر اکبرآبادی سے ہوتی ہوئی اس دور میں پہنچی جو ظلم اور سفا کی میں اپنی مثال آپ تھا۔اس دور کو ہندستان کی تاریخ میں برٹش عہد حکومت سے جانا جاتا ہے۔لیکن اردو شاعری نے یہاں بھی اپنی گردن خم نہیں ہونے دی اور حریتِ فکر و اظہارِ حق وصداقت کا ایک بیش بہا نمونہ پیش کیا۔غالب، مومن، ذوق، ظفر، درد، داغ، حالی، حسرت، اکبرالہ آبادی جیسے شاعروں نے حریتِ فکر کی باگ ڈور کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے ڈھیلی نہیں

ہونے دیا۔غالب کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج　　قمری کا طوق، حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ　　تارِ نفس کمند شکار اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل　　سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے　　کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب　　خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

اردو شاعری میں حریتِ فکر کی روایت کو پروان چڑھانے والے ادیبوں کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اگر فسطائی جبر کے سامنے سینہ سپر ہونے میں تامل کیا جائے تو تہذیب وتمدن کو ناقابل اندمال صدمات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ان کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر حرف صداقت لکھنے کی روایت ختم ہو گئی تو وہ تہذیب وتمدن کی میراث گنوا بیٹھیں گے۔یہی سبب ہے کہ اردو شعرا نے تہذیب وتمدن کے ارتقا اور حق و صداقت کی بالادستی کے لیے تمام آزمائشوں کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا۔اردو شاعری میں حریتِ فکر کی یہ روایت مرورِ ایام کے ساتھ مزید مضبوط ہوتی گئی اور اسی مضبوطی کے ساتھ یہ روایت موجودہ دور کے شاعروں میں بھی نظر آتی ہے۔حریتِ فکر کا اظہار اردو شاعری میں دو طریقوں سے ہوا ہے۔پہلا طریقہ یہ ہے کہ جابر حکمرانوں کے سامنے ان کی ناانصافی اور ان کے ظلم کے خلاف بغیر کسی خوف و اندیشہ کے حق بات کہہ دی جائے۔حریتِ فکر کا یہ سب سے اعلیٰ نمونہ ہے۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سماج اور معاشرہ میں پنپ رہی بے اعتدالیوں اور گندگیوں کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔اردو شاعروں نے ان دونوں طریقوں کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔اسی لئے اردو شاعری میں حریتِ فکر کی جڑیں کافی گہرائی میں پیوست ہیں۔

طارق متین موجودہ دور کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ان کی شاعری روز بہ روز ارتقا کی منزلیں طے کرتی جارہی ہے۔ان کی زندگی جتنی ناہموار ہے، ان کی شاعری اتنی ہی ہموار ہے۔اچھی شاعری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ زندگی کی حقیقتوں کو فلسفہ اور منطق کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا جائے اور قاری کو اس پر مجبور کر دیا جائے کہ اس حقیقت کی تلاش میں اس کا ذہن بھٹی بن جائے۔شاعری کا اصل وصف اس کی اثر انگیزی اور ترسیل ہے۔عام فہم اور ہلکے پھلکے انداز میں بھی بات اثر انداز ہوتی ہے۔طارق متین کے شعری مجموعہ ٔ'غزالِ درد' کی یہی خوبی ہے۔انھوں نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو بہت ہی سہل انداز میں بیان کیا ہے۔اس میں دماغ سوزی تو نہیں ہوتی ہے البتہ دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔'غزالِ درد' کے مطالعہ کے دوران طارق متین کے سلیس و رواں انداز نے مجھے خاصا متاثر کیا۔شعر پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف

شفاف ندی کا بہاو ہے جو پوری مستی میں رواں دواں ہے۔اس بہاو سے دل میں ترنگ کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ یہ بہت ہی اعلیٰ تخلیق ہے۔لیکن ایسی بھی نہیں ہے کہ توجہ کے لائق نہ ہوں۔ان کے اشعار دل و دماغ کو متوجہ کرتے ہیں اور روح کو سرور بخشتے ہیں۔'غزالِ درد' کی جملہ خوبیوں کا اظہار میرا منشا نہیں ہے۔میں نے تمہید میں حریتِ فکر پر جو اظہار خیال کیا ہے۔اسی حریتِ فکر کی روشنی میں 'غزالِ درد' میں شامل اشعار میں اس عنصر کی تلاش ہی میرا مقصد ہے۔

'غزالِ درد' میں اس موضوع پر اشعار زیادہ نہیں ہیں۔اشعار کی کمیت سے شاعر کی پہچان نہیں ہوتی بلکہ اس کی کیفیت سے ہوتی ہے۔اشعار گرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن اس کی 'کیفیت' کسی اعتبار سے کم نہیں۔حریتِ فکر کے رائج دونوں طریقوں میں طارق متین کے اشعار مل جاتے ہیں۔سیاسی حضرات اپنی رعایا کو فقط وعدۂ فردا کی سوغات دینا چاہتے ہیں۔عوام الناس کیا چاہتے ہیں، اس پر کبھی انھوں نے دھیان ہی نہیں دیا۔طارق متین اپنی حریتِ فکر کو آنچ دیتے ہوئے اس کو شعلوں میں تبدیل کر دیتے ہیں اور عوام کا ترجمان بن کر اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں:

یہ صرف وعدۂ فردا پہ ٹل نہیں سکتی امیرِ شہر! رعایا اناج چاہتی ہے

آج خانقاہوں کی جو حالت ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔آج خانقاہ بوریا سے شرماتی ہے۔اب اسے بھی 'ظاہری' بادشاہت چاہیئے۔کبھی وہ دلوں پر راج کرتی تھی۔آج وہ جسم و جاں پر حکومت کی خواہاں ہے۔اسی کا اظہار طارق متین کے اس شعر میں ہوا ہے:

بدل لیا ہے فقیری نے بھی لباس اپنا یہ بوریا نہیں اب تخت و تاج چاہتی ہے

حریتِ فکر جب پورے شباب پر ہوتی ہے، تو اس قسم کے شعر روزنِ تصور سے برآمد ہوتے ہیں:

یہ خاک و خوں کا عجب امتزاج چاہتی ہے مری زمیں مرے سر کا خراج چاہتی ہے

حریتِ فکر حوصلوں سے آتی ہے۔کیوں کہ یہاں اونچی اڑان بھرنی پڑتی ہے۔اونچی اڑان کے لئے دل و جگر کا مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے۔طارق متین نے اسی جانب اشارہ کیا ہے:

فلک کی سیر میاں حوصلوں سے ہوتی ہے یہ کہہ گیا ہے پرندہ اڑان دیتے ہوئے

طارق متین کی حریتِ فکر کی ایک مثال دیکھئے۔میکدہ میں شب و روز بسر کرنا اور اس کا اذان دینا، شاعر کو کس قدر متاثر کر گیا ہے۔وہی اثر انگیزی اس شعر میں نظر آتی ہے:

گذارتا ہے شب و روز میکدے میں جو شخص بہت بھلا سا لگا ہے اذان دیتے ہوئے

موجودہ دور کے حالات اتنے ناگفتہ بہ ہیں کہ حقیقتِ حال کے اظہار میں ہمارے پسینے چھوٹنے

لگتے ہیں۔حریتِ فکر کوجس قدر اس زمانے میں پامال کیا جارہا،اس تناسب میں اس کے خلاف آوازیں نہیں اٹھ رہی ہیں۔اسی کا نتیجہ ہے کہ بے گناہ اور بےقصور لوگوں کی زندگیاں تنگ کی جارہی ہیں اور مظلوم لوگوں کو قید و بند کی زندگی گزارنے پر مجبور و بےبس کردیا گیا ہے۔اسی پس منظر میں طارق متین کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

بے گناہی کی سزا خوب ملی ہے ہم کو اس عدالت میں ہر اک جرم ہمارا نکلا

جابر حکمرانوں کے ظلم و جبر کی حد قیاس سے باہر ہوچکی ہے۔قید و بند کی یہ زنجیریں کہاں ٹوٹے گی،معلوم نہیں۔اس جاں گسل ماحول سے شاعر کی حریتِ فکر پیچ وتاب کھارہی ہے:

نہ جانے ختم کب ہوگی یہ میعادِ قفس طارق کہاں جا کر کٹیں گے یہ سلاسل کہہ نہیں سکتے

لوگوں کی مصلحت اندیشی سے شاعر کی حریتِ فکر تڑپ رہی ہے۔اسی تڑپ نے اس شعر کو جنم دیا:

کہاں لے آئی ہے یہ مصلحت اندیشیاں ہم کو زباں پر مہر ہے قاتل کو قاتل کہہ نہیں سکتے

بے گناہی کی سزا سہتے سہتے لوگ بے دم ہو چکے ہیں۔اب وہ اپنی فریاد خالقِ کائنات کے حضور میں پیش کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔شاعر اس کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے:

میں تھک گیا ہوں بہت امتحان دیتے ہوئے ہر ایک سانس پہ یا رب لگان دیتے ہوئے

شاعر حریتِ فکر کے تحت شکوہ اور فریاد سے گذرتے ہوئے اس اٹل حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ ’ ہر عروجے راز والٗ:

ایک دن خاک میں مل جائے گا وہ بھی،جس نے ابھی دنیا کو ہتھیلی پہ اٹھایا ہوا ہے

ہمارا سماج اور معاشرہ ایسے لوگوں سے بھی معمور ہے جو اپنے دامن کی سیاہی کو نہیں دیکھتے اور دوسروں کے گریبان کی بہت فکر رکھتے ہیں۔ایک دور وہ تھا جب کہا جاتا تھا:

تن ہمہ داغ دار شد، پنبہ کجا کجا نہم

موجودہ دور کا شاعر اس مصلحت آمیز لبادہ سے باہر آچکا ہے۔اب وہ سماج و معاشرہ کی نبض پر بے دھڑک انگلی رکھ دیتا ہے:

ہے داغدار بہت جن کا اپنا ہی دامن وہ لوگ اوروں پہ تہمت لگائے جاتے ہیں

شاعر نہ صرف انگلی رکھتا ہے بلکہ وہ لوگوں کی نفسیات کی پرتیں بھی کھولتا چلا جاتا ہے:

تم اپنی خوبیاں گن گن کے خوش رہو صاحب مری تو ساری خرابی مری نگاہ میں ہے

اسی طرح جس شخص کا ہر نوالہ رشوت کے پیسوں کا محتاج ہے،وہی رزقِ حلال پر لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے۔طارق متین کی حریتِ فکر نے ایسے دوہرے کردار رکھنے والے شخص کی بھی خبر لی ہے:

انھیں بھی دعویِ رزقِ حلال ہے طارق　　جو رشوتوں کے نوالے چبائے جاتے ہیں

طارق متین نے سماج میں رائج نابرابری اور عدم مساوات کو بھی اپنی حریتِ فکر کے خراد پر رکھا ہے اور اس کا اظہار کیا ہے:

میں بھی اک خاک کا پتلا ہوں ترے ہی جیسا　　کسی دوزخ کسی جنت سے نہیں آیا ہوں

مذکورہ بالا معروضات سے ثابت ہوتا ہے کہ طارق متین کی شاعری میں حریتِ فکر کے جذبے اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس جذبے میں آگ ہے، تڑپ ہے، ولولہ ہے، جوش ہے، سرمستی ہے اور ترنگ میں لپٹی ہوئی موجیں ہیں۔ اس آگ کی حرارت سے فکر و آگہی کے روزن روشن ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ 'غزالِ درد' میں حریتِ فکر کے جذبے پر مشتمل اشعار کی تعداد کم ہے۔ لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ جتنے بھی ہیں۔ ان سے طارق متین کی حریتِ فکر سے بخوبی آگاہی ہو جاتی ہے۔ اگر انھوں نے اپنی شاعری کو اپنے ہی انداز میں سراہا ہے، تو میرے خیال میں یہ مبنی بر حقیقت ہے:

طارق مرے شعروں کا انداز نرالا ہے　　چڑھتا ہوا دریا ہے، موجوں کی روانی ہے
شاعری کی یہی خوبی ہے کہ جادو بن کر　　دل میں بس جاتی ہے اور ذہن میں گھر کرتی ہے

◀◀ ● ▶▶

Khuda Baksh Library
Ashok Rajpath Patna.800004
9199702756

تنقیدی کتابیں

نام کتاب: حرف نقد
مصنف: ڈاکٹر ارشد رضا
سن اشاعت: ۲۰۲۴
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۲۵۰/روپے
ملنے کا پتہ: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

نام کتاب: گدی برادری کے چار اہم قلمکار
مصنف: ڈاکٹر رونق شہری
سن اشاعت: ۲۰۲۱ء
صفحات: ۲۵۱
قیمت: ۳۰۰/روپے
ملنے کا پتہ: ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، نیو دہلی۔۲

● **ظفر کمالی**

اعتراف

(رباعیاں)

اک برق سی لفظوں میں چھپا رکھّی ہے
لاج اس نے معانی کی بچا رکھّی ہے
ہو جائیں نہ کیوں سب کی خیرہ آنکھیں
''قندیلِ ہنر'' اس نے جلا رکھّی ہے

خوش رنگ خیالوں کے چمن کا شاعر
وقت آئے تو وہ دار و رسن کا شاعر
کیوں پھیلے زمانے میں نہ اس کی خوشبو
کہتے ہیں اسے ''مشکِ سخن'' کا شاعر

اس عہد کی بے حسی سے محفوظ رہا
احساس کی تیرگی سے محفوظ رہا
ہونا تھا زمانے میں سرافراز اسے
آشوبِ آگہی سے محفوظ رہا

باتوں میں ذہانت ہے ، بہت ہے وہ ذہین
لہجے میں متانت ہے کہ وہ خود ہے متین
چہرے سے جھلکتا ہے فراست کا نور
ہم کیوں نہ کہیں اس کو اجالوں کا امین

اس راہ کی ہر شام و سحر ہے معلوم
بھٹکے گا نہ وہ فن کی ڈگر ہے معلوم

مدّت کی ریاضت کا ثمر ہے کہ اسے
لفظوں کو برتنے کا ہنر ہے معلوم

سر سبز خیالوں کا توانا احساس
ہوتا ہے ہر اک دل کو یگانا احساس
وہ اپنی ذہانت سے جگا دیتا ہے
غزلوں میں نئے پن کا سہانا احساس

الفاظ و معانی میں ہم آہنگی ہے
مسحور کرے دل کو وہ نیرنگی ہے
ہر شعر ہوا خونِ جگر سے سیراب
ایسے ہی نہیں اس کی غزل چنگی ہے

ہم اس کو کہاں کہتے ہیں استادِ غزل
لے لی ہے زمانے سے مگر دادِ غزل
تا عمر اسی فن میں جگر کاوی کی
فرہادِ غزل ہے وہ فرہادِ غزل

غزلیں ہیں یہ اس کی کہ ہے باغِ حیرت
ہر سمت چھلکتا ہے ایاغِ حیرت
افکارِ منوّر کی تابانی سے
ہر گام پہ روشن ہے چراغِ حیرت

آیا ہے کہاں سے یہ کمالی لہجہ
ڈھاتا ہے غضب دل پہ جمالی لہجہ
اب ایسی مثالیں بھی کہاں ملتی ہیں
مانا کہ نہیں اس کا مثالی لہجہ

بہتان لگانے سے نہیں مٹ سکتا
طوفان اٹھانے سے نہیں مٹ سکتا
جان اس نے کھپائی ہے غزل کہنے میں
نام اس کا زمانے سے نہیں مٹ سکتا

مغرور نہیں ہوا وہ فن کاری پر
اس مملکتِ سخن کی سرداری پر
دیتا ہے اسے زیب اگر ناز کرے
اشعار میں لفظوں کی گہرباری پر

مسرور ہے وہ اس کی صدا ہے محفوظ
لفظوں کی، خیالوں کی ضیا ہے محفوظ
دیں کیوں نہ بشارت یہ اسے اہلِ نظر
ایوانِ غزل میں اس کی جا ہے محفوظ

دیکھی ہے کہاں تم نے ابھی ہستیِ دل
دیکھو تو سہی اس کی کبھی مستیِ دل
آتی ہے نظر کتنی روشن روشن
یادوں کے چراغوں سے سجی بستیِ دل

کاندھے پہ گراں بار اٹھائے ہوئے ہے
ہے مرد تو کہسار اٹھائے ہوئے ہے
اس عہدِ بلاخیز میں مضبوطی سے
وہ مشعلِ اقدار اٹھائے ہوئے ہے

کرتے ہیں اسے چبھتے سوالات نڈھال
ہوتی ہی نہیں ختم کبھی فصلِ زوال

آنکھوں سے جھلک اٹھتی ہے گاہے گاہے
ہے دل میں رواں اس کے عجب موجِ ملال

لاریب اسے دیدہ وری حاصل ہے
ہے شکرِ خدا خوش نظری حاصل ہے
کیوں سختیِ حالات سے گھبرائے گا
آلام کی جب ہم سفری حاصل ہے

اس کو جو بکھیرو تو منظّم ہو جائے
جب زخم لگائے تو وہ مرہم ہو جائے
ہو اس کے تعاقب میں اگر رسوائی
وہ اور زمانے میں مکرّم ہو جائے

گلشن تو اجڑ چکا ہے طارق صاحب
ہر پیڑ اکھڑ چکا ہے طارق صاحب
اب بات کہاں کوئی پہلے والی
ماحول بگڑ چکا ہے طارق صاحب

Ismail Shaheed
(M.M.Colony)Mill Road
Siwan-841226
Mob:9431056963

● طارق متین کی منتخب غزلیں

غزلیں

عجب قدرت ہے اس کی، کیا فراہم کر دیا اس نے
کہ اک قطرے سے انساں کو مجسّم کر دیا اس نے

مجھے ملکِ سخن میں یوں مکرّم کر دیا اس نے
کہ ہر پرچم سے اونچا میرا پرچم کر دیا اس نے

میں جب بھی منتشر ہونے لگا دنیا کی ٹھوکر سے
مجھے پہلے سے بھی بڑھ کر منظّم کر دیا اس نے

بہت نازاں ہوا میں جب بھی اپنی سر بلندی پر
مجھے معتوب کر کے میرا سر خم کر دیا اس نے

کرشمہ یہ بھی دیکھا ہے زمانے کی نگاہوں نے
دہکتی آگ کو پل بھر میں شبنم کر دیا اس نے

یہ فکر و آگہی کے سارے سرچشمے اسی کے ہیں
عنایت ہے کہ مجھ کو اپنا محرم کر دیا اس نے

وہی تو قادرِ مطلق ہے، طارقؔ! ہے کرم اس کا
کہ میرے قلب کو شائستۂ غم کر دیا اس نے

◄◄ ● ►►

جب آسمانِ سماعت میں در نکلتا ہے
مرے سخن کے پرندے کو پَر نکلتا ہے

میں چاہتا ہوں کہ رفتار اس کی دھیمی ہو
یہ رخشِ عمرِ رواں تیز تر نکلتا ہے

کرشمہ دیکھیے اس کے بس اک اشارے پر
زمیں کے بطن سے گنجِ گہر نکلتا ہے

چلی ہے اب کے یہ کیسی منافقت کی ہوا
کہ جس سے ملیے، وہ نامعتبر نکلتا ہے

ہجومِ غم میں بھی اُمّیدِ سرخوشی رکھیے
سوادِ شب سے ہی نورِ سحر نکلتا ہے

عجیب بحرِ اذیت ہے یہ جہانِ خراب
قدم قدم پہ یہاں اک بھنور نکلتا ہے

ہے سخت جان بہت میرا نخلِ فن طارقؔ
زمانہ لاکھ دبائے مگر نکلتا ہے

◄◄ ● ►►

● طارق متین

غزلیں

رات آتی ہے تو وحشت کو جگا دیتی ہے
میری پرچھائیں سے بھی مجھ کو ڈرا دیتی ہے

ایک سر چشمۂ رحمت ہے جسے ماں کہیے
ظلم سہہ کر بھی جو بیٹے کو دعا دیتی ہے

تھوڑی پسپائی بھی لازم ہے کہ فتحِ پیہم
میرے پندار کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے

تختِ شاہی کی رعونت کو مری مسندِ خاک
یوں بھی ہوتا ہے کہ آئینہ دکھا دیتی ہے

چڑھتے سورج کی پرستش میں خدا کی مخلوق
خود کو معیارِ شرافت سے گرا دیتی ہے

پیش بینی مرے وجدان کی طارقؔ صاحب
کسی انجانی مصیبت کا پتا دیتی ہے

◄● ►

نخلِ خودرَو کے لیے باغ کی حاجت کیسی
دستِ فیّاض کو تلقینِ سخاوت کیسی

دلِ ناداں! ہے میّسر تجھے جب دولتِ غم
پھر کسی اور خزانے کی ضرورت کیسی

ملکۂ شہرِ وفا تیری گلی میں آکر
صدقۂ جاں بھی نہ دیں ہم تو محبت کیسی

دولتِ شعر و سخن اس کی عنایت ہی تو ہے
صاحبو! کاہے کا پندار، رعونت کیسی

تیری دنیا میں مَیں برباد تو ہوں ربِّ کریم
گر یہی تیری رضا ہے تو شکایت کیسی

اور پاتے بھی کیا اس شہرِ ریاکار میں ہم
شیشۂ دل پہ پڑی گردِ کدورت کیسی

قدرِ فن ہوگی، ذرا صبر سے تم کام تو لو
خود کو منوانے کی طارقؔ میاں عجلت کیسی

◄● ►

● طارق متین

غزلیں

سودا بلندیوں کا مرے سر میں رکھ دیا
اُڑنے کا فن بھی اس نے مرے پر میں رکھ دیا

مالک سے لَو لگانے کا انعام دیکھیے
دنیا کو مجھ فقیر کی ٹھوکر میں رکھ دیا

اک قطرہ خوں میں رکھ دیا طوفانِ غم کا شور
کیسا سکوت اُس نے سمندر میں رکھ دیا

انسان کے خمیر میں رکھّی جو سرکشی
اک تازیانہ موت کے بستر میں رکھ دیا

گُل کے، شفق کے، چاند ستاروں کے حسن کو
یکجا کیا تو اس پری پیکر میں رکھ دیا

اے رحمتِ تمام بہت شکریہ ترا
سب امتیاز میرے مقدّر میں رکھ دیا

طارق متینؔ تیری غزل کا نہیں جواب
اک رنگ الگ ہی شعر کے تیور میں رکھ دیا

◄● ►

غم کی دیوار کو میں زیر و زبر کر نہ سکا
اک یہی معرکہ ایسا تھا جو سر کر نہ سکا

دل وہ آزاد پرندہ ہے کہ جس کو میں نے
قید کرنا تو بہت چاہا مگر کر نہ سکا

دور اتنی بھی نہ تھی منزلِ مقصود مگر
یوں پڑے پاؤں میں چھالے کہ سفر کر نہ سکا

زندگی میری کٹی ایک سزا کے مانند
چین سے دنیا میں پل بھر بھی بسر کر نہ سکا

آسماں پر وہ گیا قلبِ زمیں میں اترا
کون سا کام ہے ایسا جو بشر کر نہ سکا

بات جیسی بھی ہو تاثیر ہے شرطِ لازم
شعر وہ کیا جو کسی دل میں بھی گھر کر نہ سکا

◄● ►

● طارق متین

غزلیں

ترے قدموں کی آہٹ سے، مرا گھر جاگ اٹھتا ہے
در و دیوار جاگ اٹھتے ہیں، بستر جاگ اُٹھتا ہے

بچھڑ کر تجھ سے کھو جاتا ہوں دشتِ کم نصیبی میں
تجھے پا کر مرا سویا مقدّر جاگ اُٹھتا ہے

دکھائی دیتی ہے جب بھی کوئی صورت ترے جیسی
تو میرے دل میں چاہت کا سمندر جاگ اُٹھتا ہے

خرد کی آنکھ حیراں ہے، جنوں کی سر بلندی پر
کہ اس کے واسطے جبریل کا پَر جاگ اُٹھتا ہے

مجھے بھی جان پیاری ہے مگر اک بات ہے صاحب
ہو جب دستار خطرے میں، مرا سر جاگ اُٹھتا ہے

مری فکرِ رسا پرواز کرتی ہے تو کاغذ پر
حسیں شعروں کا طارقؔ ایک لشکر جاگ اُٹھتا ہے

◀◀ ● ▶▶

چلیے اک اور سفر بعدِ سفر کر لیا جائے
آسمانوں کی بلندی کو بھی سر کر لیا جائے

پھول مہکیں گے جہاں بھی ہوا اُڑے گی خوشبو
نور آئے گا چراغوں کو جدھر کر لیا جائے

صاحبو سن کے حکایاتِ جواں مرگیِ دل
صبر کرنا بھی تو مشکل ہے مگر کر لیا جائے

شاید اس آہوئے رم خوردہ کی مل جائے خبر
اور کچھ روز بیاباں میں بسر کر لیا جائے

بس یہی شرط ہے پھر بابِ اثر کھلتا ہے
دل کو مصروفِ دعا چشم کو تر کر لیا جائے

کچھ بھی مشکل نہیں جب عزم جواں ہے طارقؔ
سر پھری تیز ہواؤں کو ادھر کر لیا جائے

◀◀ ● ▶▶

● طارق متین

غزلیں

جو بھی امکانِ نمو آج مری خاک میں ہے
یہ کرشمہ تو اسی کا ہے جو افلاک میں ہے

سارے عالم کو جلانے کا ہنر جانتی ہے
ایک چنگاری جو پنہاں خس و خاشاک میں ہے

مسکراتی ہوئی آنکھوں میں کہاں ڈھونڈتے ہو
موجِ غم کا تو گزر دیدۂ نمناک میں ہے

اک پری رُو ہمہ اوصاف تخیّل بن کر
میری پروازِ سخن میں، مرے ادراک میں ہے

چند لمحے کی ملاقات کو عرصہ گزرا
خوشبوئے دوست ابھی تک مری پوشاک میں ہے

چین سے کیسے بسر ہو کوئی لمحہ بھی یہاں
طارقؔ اک چرخِ ستم کیش مری تاک میں ہے

◀◀ ● ▶▶

لوگ اسباب کی دریوزہ گری میں گُم ہیں
ہم تو بس مشغلۂ جامہ دری میں گُم ہیں

ہم تو سلطان ہیں، اک سلطنتِ دل کے میاں
مسندِ خاک پہ بھی تاجوری میں گُم ہیں

کیا سنائیں تمھیں احوالِ شب و روز کہ ہم
اپنی دمسازیِ آشفتہ سَری میں گُم ہیں

ہم فقیروں کا کوئی کام نہیں اس کے سوا
فاقہ کش ہو کے بھی ہم دیدہ وری میں گُم ہیں

زخمِ دل، زخمِ جگر، زخمِ تمنّا طارقؔ
ہم انھی زخموں کی اب چارہ گری میں گُم ہیں

◀◀ ● ▶▶

● طارق متین

غزلیں

اپنی حرمت کے طلب گار ہوئے ہیں ہم لوگ
سر کٹا دینے کو تیّار ہوئے ہیں ہم لوگ

ہم کہ سورج ہیں، اُجالا ہے ہمیں سے قائم
ڈوب کے پھر سے نمودار ہوئے ہیں ہم لوگ

پھر ہمیں نیند کی آغوش میں مت لے جاؤ
بڑی مشکل سے تو بیدار ہوئے ہیں ہم لوگ

کیا کہیں، شرم سے لب ہی نہیں کھلتے اپنے
اپنی ہی راہ کی دیوار ہوئے ہیں ہم لوگ

آسماں والا کرے کیسے بھروسہ ہم پر
کیا زمیں کے بھی وفادار ہوئے ہیں ہم لوگ؟

بے سبب تو نہیں یہ شور شرابہ طارقؔ
باعثِ گرمیِ بازار ہوئے ہیں ہم لوگ

◀◀ ● ▶▶

قعرِ گمنامی سے نکلے تو خبر میں آئے
تیرگی کاٹ کے ہم چاند نگر میں آئے

دل میں اس طرح اُترتے ہیں تمنّا کے پرند
جیسے خوش حالی اچانک کسی گھر میں آئے

کاش ایسا ہو کہ آباد رہے سب کا مکاں
روشنی آئے تو ہر صحن میں، در میں آئے

دن کے ہنگامے تری یاد سے غافل رکھیں
شام ہوتے ہی ترا درد جگر میں آئے

ہم سلامت رہے، یہ اس کی نوازش ہی تو ہے
ٹوٹی پتوار لیے بیچ بھنور میں آئے

کتنے نادان تھے ہم سمجھے کہ جنّت ہے یہی
چار دن کے لیے دنیا کے کھنڈر میں آئے

یہ تقاضہ تو ضروری نہیں طارقؔ صاحب
آپ کا نام بھی اربابِ ہنر میں آئے

◀◀ ● ▶▶

● طارق متین

غزلیں

اور کچھ بھی تو نہیں اس کے سوا چاہتے ہیں
جان! ہم اپنی محبّت کا صلہ چاہتے ہیں

چاہتے ہیں کہ ستاروں پہ کمندیں ڈالیں
اپنی املاک میں ہم ارض و سما چاہتے ہیں

چاہتے ہیں کہ ہر اک گھر میں بہار آجائے
اپنے آنگن میں بھی اک پیڑ ہرا چاہتے ہیں

چاہتے ہیں کہ کسی پر بھی کوئی ظلم نہ ہو
سبھی آزاد رہیں، ایسی فضا چاہتے ہیں

چاہتے ہیں نیا جادہ، نئی منزل کوئی
زندگی کے لیے اک رنگ نیا چاہتے ہیں

چاہتے ہیں کہ اُجالوں کے پیمبر ہو جائیں
سب کو روشن کریں، ہم ایسی ضیا چاہتے ہیں

گو کہ منکر بھی نہیں ہم سفری کے طارقؔ
راستہ اپنا مگر سب سے جدا چاہتے ہیں

◄ ● ►

محفوظ کس طرح رہے دیوارِ جسم و جاں
ہر سمت اُٹھ رہی ہیں فسادوں کی آندھیاں

برپا ہے شور بم کے دھماکوں کا اس قدر
جھڑنے لگی ہیں شاخِ سماعت کی پتّیاں

جلتے ہوئے مکانوں کا منظر ہے چار سُو
بکھری ہوئی زمیں پہ ہیں لاشوں کی کرچیاں

آئی ہے شر پسندوں کے گُلشن میں پھر بہار
اُڑنے لگی ہیں امن کے دامن کی دھجّیاں

دہشت کے کالے ناگ اُٹھائے ہوئے ہیں سر
چھائی ہوئی ہیں چاروں طرف غم کی بدلیاں

طارقؔ ہے انتشار کی ہر سمت تیز دھوپ
ملتا نہیں کہیں کوئی راحت کا سائباں

◄ ● ►

● طارق متین

غزلیں

یہ خاک و خوں کا عجب امتزاج چاہتی ہے
مری زمیں مرے سر کا خراج چاہتی ہے

بدل لیا ہے فقیری نے بھی لباس اپنا
یہ بوریا نہیں، اب تخت و تاج چاہتی ہے

ہماری چارہ گری بھی ہے سادہ لوح بہت
جہان بھر کے غموں کا علاج چاہتی ہے

یہ صرف وعدۂ فردا پہ ٹل نہیں سکتی
امیرِ شہر! رعایا اناج چاہتی ہے

فقط یہی ہے ہمارے دل و نظر کی طلب
محبتوں سے مزّین سماج چاہتی ہے

نیا نیا ہے سبھی کچھ مگر سرشت مری
پُرانی رسم، پُرانے رواج چاہتی ہے

بڑھی ہوئی ہے ہر اک شخص کی ہوس طارقؔ
جو ہونے والا ہے کل، وہ بھی آج چاہتی ہے

◄● ►

نذرِ عرفان صدیقی

ہم نے خوابوں کا نیا شہر بسایا ہوا ہے
جس میں چاند اور ستاروں کو سجایا ہوا ہے

مدّتوں خود کو جلایا ہے کڑی دھوپ میں جب
ایک دیوار ملی، تھوڑا سا سایہ ہوا ہے

اب اسے اور نہ چھیڑو کہ یہ انساں یارو!
بہت آزردہ ہے، پہلے ہی ستایا ہوا ہے

جب ازل سے ہی اکیلے ہو تو کیوں سوچتے ہو
کون اپنا ہے یہاں، کون پرایا ہوا ہے

ایک دن خاک میں مل جائے گا وہ بھی جس نے
ابھی دنیا کو ہتھیلی پہ اٹھایا ہوا ہے

ہم تو زندہ ہیں اسے پھر سے بنانے کے لیے
ایک مینارۂ تہذیب جو ڈھایا ہوا ہے

اس کو ہی دیکھ کے جیتے ہیں، یہ سچ ہے طارقؔ
ہم نے یہ راز مگر دل میں چھپایا ہوا ہے

◄● ►

● طارق متین

غزلیں

وہاں کے تم بھی ہو شاید، وہاں کے ہم بھی ہیں
میاں قبیلۂ صاحب دلاں کے ہم بھی ہیں

یہ اور بات کہ رشتہ زمیں سے رکھتے ہیں
مگر تمھاری طرح آسماں کے ہم بھی ہیں

بہاریں آئیں گی پھر سے، کھلیں گے پھول یہاں
کہ دشت کے تو نہیں، گلستاں کے ہم بھی ہیں

ہمارا نور ابھی تو ذرا سا مدّھم ہے
چمک اٹھیں گے کہ اس کہکشاں کے ہم بھی ہیں

جو لکھنؤ سے ہے موسوم شہرِ لکھمنیا
اسی دیارِ محبّت نشاں کے ہم بھی ہیں

جو ابتدا سے ہی تہذیب کا ہے گہوارہ
بڑا غرور ہے ہم کو، وہاں کے ہم بھی ہیں

ہم اپنا نام و نسب کیا بتائیں اے طارقؔ
جو لُٹ گیا ہے، اسی کارواں کے ہم بھی ہیں

●

ہم نے مانا کہ بہت تم نے اجالی دنیا
روح کالی ہے مرے یار تو کالی دنیا

یہی بہتر ہے کہ ہم چھوڑ دیں پیچھا اس کا
دے بھی سکتی ہے ہمیں کیا یہ سوالی دنیا

ہم کہ اس کو ہی سمجھ بیٹھے ہیں فردوسِ بریں
ہائے وہ لوگ، تھی جن کے لیے گالی دنیا

جا کے بیٹھو تو کسی حلقۂ درویش میں تم
دل کی دنیا ہے جہاں اور مثالی دنیا

لوحِ محفوظ میں جب تک رہے، ہم سادہ رہے
کتنے پُر پیچ ہوئے جب سے سنبھالی دنیا

سارے ہنگامۂ امروز کا حاصل کیا ہے
دین کو بیچ دیا اور بنالی دنیا

کیا سنائیں تمھیں احوالِ جہاں اے طارقؔ
اچھّے لوگوں سے ہوئی جاتی ہے خالی دنیا

●

● طارق متین

غزلیں

ویران حویلی ہے، راجا ہے نہ رانی ہے
بس ایک فسانہ ہے، بس ایک کہانی ہے

جو بھی یہاں آتا ہے، وہ لُٹ کے ہی جاتا ہے
دنیا ترے کوچے کی یہ رسم پُرانی ہے

میں ہجر کا مارا ہوں، ٹوٹا ہوا تارا ہوں
یہ داغِ جگر میرا الفت کی نشانی ہے

ان آنکھوں کی خاموشی، اب مار ہی ڈالے گی
اک گہرا سمندر ہے، ٹھہرا ہوا پانی ہے

ہاں روح کو تم اپنی مَیلا نہ کرو ساتھی
اس جسم کا کیا حاصل، یہ جسم تو فانی ہے

طارؔق مرے شعروں کا انداز نرالا ہے
چڑھتا ہوا دریا ہے، موجوں کی روانی ہے

◄◄ ● ►►

ہم زندگی کے واسطے کیا کیا نہ کر گئے
جینے کی آرزو میں کئی بار مر گئے

جب تک فلک نشین تھے، کچھ سوجھتا نہ تھا
بینائی مل گئی جو زمیں پر اتر گئے

خود کو سمیٹنے کے جتن تو کیے بہت
پر یوں ہوا کہ اور بھی ٹوٹے بکھر گئے

اب کیا سنائیں تم کو حکایاتِ خونچکاں
وہ لوگ بھی نہ بچ سکے جو اپنے گھر گئے

طارؔق متین اپنی کہانی ہے مختصر
راہِ وفا پہ چلتے رہے اور مر گئے

◄◄ ● ►►

● مضمون

● رشیدہ منصوری

خیال کے جلال و جمال کی پیغمبری

(اقبال حسن آزاد کی غزلوں کے تناظر میں)

کس قدر دلکش حسین، جاذب نظر لگتی ہے یہ
مہ جبینوں میں ہو جیسے رُوپ کی رانی غزل

ہمارے بھارتی سماج میں غزل کے لیے ہمیشہ سے ایک خاص احترام پایا جاتا ہے۔ یہی جذبۂ احترام ہماری ادبی انفرادیت بھی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اردو غزل بے شمار اتار چڑھاؤ کے باجود اپنے معیار، اپنی نزاکت اور اپنی جمالیات سے کبھی کمتر نہیں ہوئی۔ ہندوستانی تہذیب میں آج بھی غزل کو ملکہ کا درجہ حاصل ہے۔ اقبال حسن آزاد کے ہاں بھی غزل اسی شاہانہ وقار کے ساتھ موجود ہے۔

خوشبو کسی کی قید میں رہتی نہیں کبھی
اس کو ہوا کے ساتھ مسافت تو دیجئے

پھیلا ہوا ہے حبس یہاں طول و عرض میں
اب کھل کے سانس لینے کی مہلت تو دیجیے

تم جو آئے تو قرار آ گیا دل کو ورنہ
رخ ہستی پہ کوئی زلف پریشاں ہوتے

شاعری انسانی جذبوں، تمدنی مشاہدے اور باطنی کیفیات کا آئینہ ہوتی ہے۔ یہ کہیں خبر بن کر، کہیں شگون کی صورت میں اور کہیں پیش گوئی کے رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کے شعری منظر نامے میں غزل ایک دل کش اور نمایاں روپ کے ساتھ موجود ہے۔ آج کے دور میں روایتی غزل، جدید غزل اور تجرباتی غزل...... تینوں طرزیں مختلف شاعروں کے ہاں دکھائی دیتی ہیں۔ غزل پر تنقید بھی اکثر بے رحمی سے کی جاتی ہے اور کبھی تعریف میں مبالغہ آرائیاں بھی در آتی ہیں، تاہم ایک سچا قاری ان تمام بحثوں سے الگ ہو کر صرف شاعری سے دل کا رشتہ قائم رکھتا ہے۔

نقاد کے طے کردہ معیار پر کوئی غزل پوری اتری یا نہیں، آخر کار فیصلہ وقت اور قاری ہی کرتے

ہیں۔ اگر قاری کسی شعر سے مسرّت محسوس کرے، اسے پڑھ کر رکے، سوچے، یا بے اختیار گنگنانے لگے تو یہی اس کی قبولیت کی دلیل ہے۔ اور اگر کوئی شعر دل کو نہ چھو سکے تو قاری کے نزدیک وہ بے معنی ٹھہرتا ہے۔ اس لیے شاعری پڑھنے والا ہو یا اس پر تبصرہ کرنے والا دونوں کا اصل پیمانہ دراصل اپنا ذوق، اپنی جمالیاتی حس اور اپنے دل کی کیفیت ہوتی ہے۔

البتہ شاعری اور شعری روایت محض ذاتی اظہار نہیں بلکہ ایک سماجی وظیفہ بھی ہے۔ اس میں لوگ اپنی ثقافت، اپنے ماحول اور اپنی دلچسپیوں کا مرکز ومحور تلاش کرتے ہیں۔ شاعری نہ صرف ہمارے جذبات کو بیدار کرنا سکھاتی ہے بلکہ بعض اوقات ہمیں ٹھہراؤ اور جمود کی کیفیت میں بھی مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کے اثرات کا فیصلہ وقت بھی کرتا ہے اور وہ سماج بھی جس میں شاعر جنم لیتا ہے اور جس کے تجربات اس کی تخلیق میں شامل ہوتے ہیں۔

اقبال حسن آزاد اور ہم جیسے مبتدی جوان کی شاعری کے قاری بھی ہیں، ایسے زمانے میں جی رہے ہیں جہاں قدیم اقدار دم توڑ رہی ہیں اور جدید مشینی زندگی پوری انسانی وجود پر مسلط ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود روایتی ادبی جرائد اور ماضی کے محاوروں اور استعاروں سے آراستہ ادبی متون ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہمارا ماضی آج بھی ہمارے حال کی رگوں میں رواں ہے اور ہم اس سے کٹے نہیں ہیں۔

اقبال حسن آزاد کی شاعری میں کلاسیکی رنگ اور عصری حسیت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ ان کا کلام سادگی، گہرائی اور فنی پختگی کی دل آویز مثال ہے جہاں روایت بھی سانس لیتی ہے اور جدید حس بھی پوری طرح جلوہ دکھاتی ہے۔

باہر سے آدمی تو سلیقے کا ہے مگر　　　مل کر پتہ چلا ہے کہ اندر عجیب ہے
اس کے خموش لب کا الگ ہی کمال ہے　　　چپ رہ کے بولتا ہے قلندر عجیب ہے
مانگا نہیں کسی سے مگر مل گیا بہت　　　اس شخص بے نوا کا مقدر عجیب ہے
مل جائیں گے جہاں میں عجوبے بہت مگر　　　اقبالؔ ان عجوبوں سے بڑھ کر عجیب ہے

خوشی، حیرت اور حسرت، یہ کیفیات انسان، معاشرے اور کسی بھی گروہ کی زندگی کو متحرک اور فعال رکھتی ہیں۔ شاعر ان جذبوں اور احساسات کو مرنے نہیں دیتا؛ وہ انہیں نام دیتا ہے، آواز دیتا ہے، شناخت عطا کرتا ہے۔ اگر شاعر اور فن کار یہ ذمہ داری ادا نہ کریں تو ہم اپنی علامتیں بھول جائیں، اپنے باطن کی سرشاری کھو بیٹھیں اور جذباتی زندگی بتدریج بے معنی ہو جائے۔ خدا نے انسانی سماج کو ایسا رنگا رنگ بنایا ہے کہ کہیں ایک طرف موت رقص کرتی ہے تو دوسری جانب زندگی اپنے پورے جلال کے ساتھ موجود رہتی ہے۔

نور کی بوند جو بخشی ہے خدایا تو نے ۔۔۔ اس سے روشن میں کروں گا تری کالی دنیا

اقبال حسن آزاد کا یہ شعر انسان کی اس جرات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی نور کی ایک بوند لے کر اندھیروں کو للکارنے نکلتا ہے، یوں جیسے کہہ رہا ہو کہ خدا کی دنیا اگر اندھیری ہے تو میں اسی نور سے اسے روشن کر دوں گا۔

انسان اپنی فطرت میں بیک وقت عجیب بھی ہے اور باکمال بھی؛ اسی تضاد میں اس کی تخلیقی قوت، اس کی جدوجہد اور اس کا جمال پوشیدہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

سوچتا ہوں کہ اس کو سوچوں گا ۔۔۔ پر کہاں میرے پاس فرصت ہے
خود کو تحلیل کرنا پڑتا ہے ۔۔۔ بندگی ہے کوئی مذاق نہیں
ہیں میرے شب و روز کہاں اختیار کے ۔۔۔ دو دن ہیں زندگی کے اور وہ بھی ادھار کے
شعلوں کی روشنی سے ہیں روشن یہاں مکاں ۔۔۔ کیسے تماشے ہو رہے رقص شرار کے
اس کی نگاہ ناز کا تیور عجیب ہے ۔۔۔ آگے جو آ رہا ہے وہ منظر عجیب ہے
بتاؤں کیا کہ کیسا رہ گیا ہے ۔۔۔ یہ دل محفل میں تنہا رہ گیا ہے
خبر نہیں کہ ہوئی دھوپ یا کہ سائے ہوئے ۔۔۔ پرندے شاخ پہ بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے
صدا کہیں سے بھی آتی نہیں ہے بلبل کی ۔۔۔ زمانہ گزرا ہے پھولوں کو مسکرائے ہوئے

محبت اور دل کے معاملات کہاں طے ہوتے ہیں یہ تو شاعری اوڑھ لیتے ہیں اور پھر ہزار رنگوں میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ اقبال حسن آزاد کی شاعری میں اس وارداتِ قلب کا خاص مقام بھی ہے اور خاص تاثر بھی۔ کہیں سکوت کی لہریں ہیں اور کہیں طوفان کا شور یہاں حسبِ دستور عقل و رد کی گنجائش نہیں، یہاں صرف عشق کی سلطانی ہے۔ ان کی غزل میں عشق و محبت اپنے تمام خوبصورت روپ، رنگ اور خوشبو کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

وفا کے پھول وہ آئے بچھا کے رستے میں ۔۔۔ تو دل بھی رکھ دیا ہم نے بچھا کے رستے میں
اس کے لیے جہاں میں خوشی کی نوید ہے ۔۔۔ اس زندگی کو جس نے بھی آسان کر دیا

شاعر سماج سے الگ رہ کر کیسے جی سکتا ہے؟ اس کے شب و روز تو لوگوں کے دکھ سہتے، دیکھتے اور ان پر کڑھتے گزرتے ہیں۔ اسے سارے زمانے کے غم اپنے سے محسوس ہوتے ہیں۔ ہر سمت کا انتشار اور زندگی کے بکھرے ہوئے دھاگے اسے چبھتے ہیں، اور یہی گہرا درد وہ اپنے شعروں میں سمو دیتا ہے۔ زندگی کی تلخیاں جب بے رحم ہو جاتی ہیں تو شاعر ان تلخ لمحوں کو اپنے کلام میں اور بھی شدید اور مؤثر بنا کر پیش کرتا ہے۔

دکھائی دیتا ہے ہر سمت انتشار مجھے
لباسِ زیست بھی ملتا ہے تار تار مجھے
غموں کے ابر ہمیشہ برستے رہتے ہیں
ہماری آنکھ میں لیکن کبھی نمی نہ ہوئی
بس ایک سانس ہی دیتی ہے زندگی کا ثبوت
یہ زندگی تو مگر کوئی زندگی نہ ہوئی
اشک آنکھوں میں چھپانے کا ہنر آتا ہے
وہ ٹپکتے جو اگر آنکھ سے طوفاں ہوتے
نشّۂ تخت رعونت کو جنم دیتا ہے
پھر تو رگ رگ میں کوئی زہر سا بھر جاتا ہے
اشک پی پی کے غمِ دہر کو کھانے والے
ان پہ ہنستے ہیں سرِ عام زمانے والے
تم جو آتے تھے تو رونق سی لگی رہتی تھی
یاد آتے ہو بہت چھوڑ کے جانے والے

اقبال حسن آزاد کی شاعری میں دکھ اور احساس کی تپش بھی ہے، زمانے سے شکوہ بھی، اور انسان کے باطن میں سلگتی ہوئی تکلیف کا بے ساختہ اظہار بھی۔

تیرا وعدہ تھا چراغاں تو کرے گا شب کو
پر تری شب تو اماوس سے بھی کالی نکلی

ان کی شاعری وقت کی سفا کیوں کا حوالہ بھی ہے اور سماج کے بدلتے ہوئے رویوں اور طبقاتی تقسیم سے جنم لینے والے انتشار کو بیان کرنے کا سلیقہ بھی۔ ہوائے تند اور گرد و غبار کی علامتیں ہمارے وقت کے دھارے سے بچھڑ جانے کے المیوں کی داستان سناتی ہیں جب ہم اپنے ہی گمانوں کی قید میں رہ جاتے ہیں اور آندھیاں ہمیں زمین سے اکھاڑنے لگتی ہیں۔

ہوائے تند اتارے گی پگڑیاں سر سے
لو پھر سے آ گیا گرد و غبار کا موسم

مزدور کے دکھ کتنے ہیں کوئی شمار نہیں کرتا۔ لیکن شاعر یہ احساس کرتے ان دکھوں کو زبان معانی اور جواز دیتا ہے۔ یہی اس کی ترقی پسندانہ اپروچ ہے۔

دھوپ میں جلتا پسینے میں نہاتا ہے بدن
چند سکے لیے تب شام کو گھر جاتا ہے

ہمارے اندر پلنے والے محبت اور چاہت کے جذبے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں اور اظہار کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ شاعری وہ آئینہ ہے جس میں ہم ان خوبصورت جذبوں کو کبھی مہکتا ہوا اور کبھی چیختا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ کہیں یہ جذبے دریا کی صورت بہتے ہیں، کہیں سمندر کی طرح بے کنار دکھائی دیتے ہیں اور کہیں بگولوں کی طرح اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اقبال حسن آزاد کے یہاں یہ جذبے کبھی شور بھی مچاتے ہیں، لیکن زیادہ تر دھیمے اور مدھر سروں میں گنگناتے ہیں۔ پُرسکون سمندر کی مانند اپنی لہروں کو اندر کی جانب پلٹاتے ہوئے، وہ ان ہی جذبوں کے اندر ہجر اور عشق کے اٹھتے طوفانوں کو کتنے رسان اور تہذیب سے سنبھال لیتے ہیں یہی ان کے فن کا کمال ہے۔

ہمارے دور میں اب جو نصاب آئے گا　　اسی میں پہلا محبت کا باب آئے گا

ایک پیارا چاند تھا آغوش میں سمٹا ہوا　　اور تھا ایک چاند گہری جھیل میں ڈوبا ہوا

تاریکیوں نے روح پہ پہرے بٹھا دیئے　　اے روشنی کبھی تو کسی موڑ سے گزر

دنیا تیری تلاش میں چلی، چل کے تھک گئی　　اے زندگی کبھی تو کسی موڑ سے گزر

مدت سے میری تجھ سے ملاقات ہی نہیں　　اے آدمی کبھی تو کسی موڑ سے گزر

خیمہ گل کو کہاں وقت ٹھہر جانے کا　　اب سماں دیکھئے پتوں کے بکھر جانے کا

ان کے بہت سے اشعار میں سہلِ ممتنع کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بظاہر آسان اور سادہ زبان، مگر معنی کی تہ داری اور خیال کی گہرائی ایسی کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ جیسے:

میں سوالی تھا تو دنیا بھی سوالی نکلی　　مجھ کو کیا دیتی وہ خود مانگنے والی نکلی

اقبال حسن آزاد کی شاعری محض ذاتی جذبات کا اظہار نہیں، بلکہ ایک مشاہدہ کار اور مفکر شاعر کی صدائے دل بھی ہے جو عشق، تصوف، انسانی فطرت اور زمانے کی ناانصافیوں کو نہایت دل کش اور فصیح انداز میں بیان کرتا ہے۔

آنکھیں تو سب کے پاس ہیں لیکن یہ بات ہے　　جس کو نظر ملی ہے نظارہ اسی کا ہے

کہا جاتا ہے کہ نظارہ اہم ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اصل اہمیت نظر کی ہے۔ آنکھیں تو سب کے پاس ہوتی ہیں، مناظر بھی سب کے سامنے ہوتے ہیں، لیکن دیکھنے، محسوس کرنے اور اظہار کرنے کا انداز ہر شخص میں مختلف ہوتا ہے۔ یہی فرق عام نگاہ اور تخلیقی نظر میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ اقبال حسن آزاد کی شاعری میں کمالِ ہنر ضرور ہے، مگر اصل جوہر کمالِ نظر ہے، وہ نظر جو چیزوں کو گہرائی سے اور بہ رنگِ دگر دیکھتی ہے۔ اقبال کی غزل روایتی شعور اور جدید تخیل کا خوبصورت سنگم ہے۔ اپنے زمانے کی حساسیت سے کوئی بھی فن خالی نہیں رہ سکتا، اور یہی حساسیت ان کے یہاں پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

ان کی غزل میں آہنگ جاندار ہے اور خیال میں ندرت پائی جاتی ہے۔ محاورے اور استعارے ہماری زبان اور ثقافت کی نمائندگی کرتے ہوئے قاری کو داخلی اور خارجی دونوں جہانوں کی سیر کراتے ہیں۔ شاعر کی دنیا اور اس کے خیال کی پرواز کے لیے آسمان میں وسعت ہے اور وہ سیاسی و معاشی جبر کے باوجود اپنی بات کہنے کا راستہ نکال لیتا ہے۔

جب لوگوں کی آزادی کو محدود کیا جاتا ہے اور ظلم و جبر معاشرتی روایت بن جائے تو عام آدمی کے دکھ شعر اور فن میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال حسن آزاد کے بہت سے اشعار ہمارے سیاسی

المیوں اور سماجی انتشار کا عکس محسوس ہوتے ہیں۔لوگ اطاعت صرف ایک حد تک کرتے ہیں؛ جو حکمران اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں، تاریخ بالآخران سے حکومت بھی چھین لیتی ہے اور عزت بھی۔

پیٹ میں آگ لگے گی تو بغاوت ہوگی پھر کوئی تاج ہی ہوگا نہ حکومت ہوگی
وقت کی مار لگے گی تو نشہ اترے گا پھر یہ تیور بھی نہ ہوں گے نہ رعونت ہوگی
سیم و زر سے تجھے تولے گا زمانہ لیکن خاک ہے خاک میں ملنا تری قسمت ہوگی

غزل،عشوہ،غمزہ اور ادا کا فن ہے؛ نگاہِ ناز کے ذکر کے بغیر غزل کو بے روح سمجھا جاتا ہے۔ مگر اقبال حسن آزاد کے ہاں یہ ذکر نہ بازاری رنگ لاتا ہے اور نہ سطحی جذباتیت کا شکار ہوتا ہے۔انہوں نے ان نازک اور حسین کیفیات کو سستے اظہار سے پاک رکھتے ہوئے نہایت باوقار اور خوبصورت پیکر عطا کیا ہے۔نگاہِ ناز کے تیوروں سے آگے کے مناظر کو یوں پیش نہیں کیا کہ راز کھل جائے، بلکہ مزید حجاب میں رکھ کر دکھایا ہے اور یہی حسنِ ہنر ہے۔کیفیات میں یہی توازن اور اعتدال غزل کے جمال و جلال کو ابھارتا ہے اور اسے لطافت کے ساتھ وقار بھی عطا کرتا ہے۔

اس کی نگاہ ناز کا تیور عجیب ہے آگے جو آ رہا ہے وہ منظر عجیب ہے
کبھی اقرار کرتا ہے کبھی انکار کرتا ہے محبت کا وہ ظالم اس طرح اظہار کرتا ہے
زندگی درد سے عبارت ہے یہ کسی شوخ کی عنایت ہے
میں جان و دل لٹا دوں محبت تو دیجئے رہنے کی اپنے دل میں اجازت تو دیجئے

شاعر سارے جہاں کا درد اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔ہر دور میں وہ درویش مزاج لوگ رہے ہیں جو عام آدمی کے دکھوں کا مرہم تلاش کرتے اور ان کے زخموں کی نمائش نہیں، بلکہ نشاندہی کرتے ہوئے جیتے چلے جاتے ہیں۔اسی تگ ودو میں ان کے اپنے غم کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔زمانہ بہت دیر بعد ان کی تکلیفوں تک رسائی پاتا ہے اور ان کے احساسات کے سراغ تک پہنچتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

MUSALMAN PARA LANE (ENT KHOLA)
PO ; NIBRA , PS, DOMJUR ,
DIST. HOWRAH
PIN CODE.711409
WEST BENGAL
Contact no 8240794896

● مضمون

● ڈاکٹر زین رامش

معاصر اردو ادب کا تخلیقی منظر نامہ اور عین تابش

معاصر ادب کے تخلیقی منظر نامے کی تفہیم اور تعبیر کے لیے پہلا اہم کام یہ ہے کہ عصر مخصوص کے عوامل وعناصر کی تشخیص کرتے ہوئے پس منظر اور پیش منظر پر ایک اچٹتی نگاہ تو ضرور ڈالی جائے۔

یہ ایک ایسا عہد ہے جس میں گلوبلایزیشن کے اثرات نے دنیا کے مختلف براعظموں کو اور ان پر رونما ہونے والے واقعات ومعاملات اور ان میں پیش آنے والے زندگی کے مختلف محرکات ومتعقدات کو نہ صرف ایک دوسرے سے آشنا اور متعارف کیا ہے بلکہ ان حوالوں سے متاثر اور متحرک بھی کیا ہے۔ اردو کا معاصر تخلیقی منظر نامہ جس میں نظم ونثر دونوں شامل ہیں اور دونوں اس شدت کے ساتھ شامل ہیں کہ اکثر وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ یہاں کچھ ضروری نہیں کہ ادبی تحریکات ورجحانات کے حوالے سے گفتگو کی جائے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات پر غور کرنے کی ہے کہ عالمی سیاسی و تہذیبی رجحانات اور یقیناً اس کے ساتھ برصغیر ایشیا اور خصوصاً ہندوستان و پاکستان کے نقشے میں ہونے والی سماجی و سیاسی تبدیلیوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انسانی اور وجودی اضطراب وانتشار کے اثرات کس طرح معاصر تخلیقی منظر نامے پر مرتسم ہوتے ہیں۔

چند سطور پر مشتمل یہ انتہائی مختصر سی تمہیدی گفتگو دراصل اس حوالے سے پیش کی گئی کہ اس گفتگو میں اردو کے نمایندہ اور منفرد شاعر عین تابش اور ان کے فکر وفن کے تعلق سے معاصر ادب کے تخلیقی بلکہ خصوصی طور پر شعری منظر نامے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس سے قبل کے روئے سخن مکمل طور پر عین تابش اور ان کی شاعرانہ انفرادیت کی طرف کیا جائے میں ایک انتہائی اہم معاملے کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ اور وہ یہ کہ شعور تقدیس ادب کے حوالے سے گفتگو کا سلسلہ اردو کی ادبی روایت کا حصہ رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن اس کی اہمیت وافادیت اور معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایہام گوئی سے لے کر رومانیت، نرگسیت اور حقیقت پسندی تک اور پھر اصلاح پسندی سے ترقی پسندی جدیدیت اور

مابعد جدیدیت تک کو اردو کی ادبی روایت میں فکر، رجحان اور تحریک کی حیثیت سے تو دیکھا بھی جاتا رہا اور اس پر گفتگو بھی ہوتی رہی لیکن تصوف پسندی یا متصوفانہ فکر کو ادبی سطح پر باضابطہ رجحان کے طور پر متعارف کرنے یا کرانے کی کوئی مخلصانہ کوشش نہ کبھی کی گئی اور نہ ہی اس طرح کی دانشورانہ فکر کو کبھی قابل اعتنا سمجھا گیا۔ شاید اردو والوں کے اسی تجاہل عارفانہ کا نتیجہ رہا کہ نہ کبھی علی گڑھ تحریک کو اپنی اصل روح کے ساتھ بلا امتیاز قبول کرانے اور اپنی معنویت کو سمجھانے کا موقع میسر آیا اور نہ ترقی پسندی کو اپنی نا قابل فراموش شہرت و مقبولیت کے باوجود طویل عمری نصیب ہوئی اور نہ ہی جدیدیت کو رجحان سے آگے بڑھ کر تحریک کی حدود میں داخلے کی اجازت ملی۔ یہاں تک کہ اردو میں مابعد جدیدیت کا کوئی واضح تصور پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شہپر رسول، دیویندر اسر اور ان جیسے بہت سارے دوسرے لوگوں کے ہزار سر مارنے کے باوجود قایم نہ ہو سکا۔ جس کے نتیجے میں تقریباً تین دہائی سے زیادہ کی طویل مدت گزر جانے کے باوجود اردو ادب و تدریس کے اعلیٰ مطالعے میں سرگرداں طلبا و طالبات اور ریسرچ اسکالرز سے لے کر اساتذہ تک کے ذہن میں اس کا کوئی واضح تصور اپنی جگہ نہ بنا سکا۔ اس صورت حال کے پیش نظر بھی ادب کا قاری اب اسے اگر بڑا ادبی المیہ نہ قرار دے تو اس مصلحت پسندی یا مصلحت پرستی پر کیا کہا جا سکتا ہے؟ اردو کی کلاسیکی شعری روایت کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ عہد قلی قطب شاہ میں فایز اور ولی کے ایک انتہائی قابل قدر ہم عصر شاعر حضرت سراج اورنگ آبادی نے بڑی ہی توانائی اور استحکام کے ساتھ متصوفانہ فکر کو شاعری کے ذریعہ پیش کرنے کی سعی مستحسن کی اور یہ سلسلہ بعد میں بھی وقتاً فوقتاً جاری رہا، لیکن کبھی بھی یہ فکر ادب و شعر کے غالب موضوع کے طور پر اپنا مقام متعین نہ کر سکی، باوجود اس کے کہ اسے شہرت بھی حاصل رہی اور مقبولیت بھی۔ بیسویں صدی کے اواخر میں اردو کے بالخصوص دو اہم اور معتبر اہل قلم نے ادبی نظریے کے طور پر متصوفانہ فکر کو رائج کرنے کی سعی بلیغ کی بلکہ تصوف پسندی کے رجحان کے قیام کے لئے انجمن تصوف پسند مصنفین کا قیام بھی کیا اور اپنی جہد مسلسل کے ذریعہ بڑی سے بڑی کامیابی بھی حاصل کی اور اس میں ایک بڑے حلقے کی شمولیت بھی ہوئی۔ اس بڑے حلقے میں شامل ناموں کے درمیان جو دو انتہائی اہم نام شامل تھے وہ پروفیسر عنوان چشتی اور پروفیسر حسین الحق کے تھے، لیکن بہ وجوہ یہ سلسلہ قایم نہ رہ سکا۔ میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ شعور تقدیس ادب کے حوالے سے اس فکر کو مشتہر ہونا ہی چاہئے کہ عہد حاضر کے تناظر میں اس کی ضرورت بھی ہے اور معنویت بھی۔ میں یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ اس حوالے سے گزشتہ چند سالوں میں، میں نے متواتر اور مسلسل گفتگو کی ہے، اس سلسلے کی تفصیلی گفتگو ڈاکٹر افروز عالم کی کتاب ''نازش لوح و قلم'' کے دیباچے میں بھی موجود ہے، جسے میں نے نئے سرے سے یہاں پیش کرنا اس لئے

ضروری سمجھا کہ میرا بنیادی موضوع دراصل عین تابش کی شاعرانہ فکر اور ان کے شعری کمالات و امتیازات کا اظہار ہے اور عین تابش کی شاعرانہ فکر کا بنیادی حوالہ محبت، اخلاق، اخلاص، جذبۂ خود سپردگی، معاملاتِ صدق و صفا، فقر وللہی، بیزاریٔ حرص و ہوس، فکرِ فلاحِ انسانی، تہذیبی اقدار کی پاسداری، طلسمات عہد رفتہ کی بازیافت، حب اہل بیت اطہار، واقعاتِ کربلا، احسان وسلوک، عقیدت و احترام صوفیا اور اس طرح کے بہت سارے دوسرے موضوعات ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عین تابش کی شاعری میں صرف اور صرف یہی موضوعات ہیں یا یہی وہ موضوعات ہیں جو غالب موضوعات کے طور پر ان کی شاعری کی شناخت بنتے ہیں۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہی وہ موضوعات ہیں جنہیں عین تابش کے یہاں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری کے ذریعہ ان تمام موضوعات کی پیش کش سامنے آتی ہے جو اردو شاعری کی طول طویل روایت کو وقار عطا کرتے رہے ہیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار جہاں ایک طرف ان تمام موضوعات سے متصف نظر آتے ہیں جو غزلیہ اشعار کی لخت لخت کیفیت کو بھی وقار اور لطافت عطا کرتے ہیں اور ان کی نظمیں ان موضوعات کا بھی احاطہ کرتی ہیں جو عموماً اردو شاعری میں کم کم اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ عین تابش نے جہاں غزلوں کے لئے موضوعات کے انتخاب کے وقت اپنے آپ کو روایت کی پاسداری کے لئے بھی پابند عہد رکھا ہے وہیں نظموں کے لیے ان موضوعات کو بھی دائرۂ تحریر میں لانے کی کامیاب کوشش کی ہے جو انگریزی اور دوسری عالمی زبانوں کا خاصہ رہے ہیں لیکن ان تمام معاملاتِ نقد و نظر سے الگ جیسا کہ میں نے سطور بالا میں عرض کیا کہ عین تابش کی شاعرانہ فکر کا بنیادی حوالہ ان کی متصوفانہ فکر ہے اور اس فکر کے نتیجے میں جو موضوعات کشید ہوتے ہیں وہی ان کی بنیادی شناخت بنتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ چیز ان کا انفراد بھی ہے اور اختصاص بھی۔ اور یہی وہ نشانِ امتیاز بھی ہے جو انہیں اپنے معاصرین سے نہ صرف الگ تھلگ رکھتا ہے بلکہ ان کے انفرادی وصف خاص کا اشاریہ بھی ہے ۔

اسی حویلی میں رہتا ہے شاہزادۂ صبر ستونِ خیمۂ شبیر سے بندھے ہوئے ہیں
العطش کہتے ہوئے جلتا رہا خیمۂ صبر ایک قطرہ نہ کسی نے بھی گوارہ کیا ہے
کہ اس بار شاید قیامت اسی موجِ خوں سے ہو برپا عجب قطرۂ اشک اس دیدۂ سرمگیں پر رکا ہے
دیکھیں بچ جاتی ہے اب وقعت بیعت کیسے کربلا راہ میں ہے اور نہیں شبیر کوئی

موضوع کے سلسلے میں ارفع و اعلیٰ فکر اور اسلوب کی اسی انفرادیت کی بنیاد پر شاید شمس الرحمٰن فاروقی نے عین تابش کے مجموعہ کلام ''دشت عجب حیرانی کا'' پر اپنے رسالے شب خون میں تبصرہ

کرتے ہوئے لکھا:

''یہ ممکن نہیں کہ نئی غزل کا ذکر ہو اور عین تابش کا ذکر نہ آئے......
نظموں میں احساس زیاں، گزران وقت اور اس کے ساتھ دنیا کے بدلنے کا تاثر نمایاں ہے۔ میں بطور خاص ''ایک خواب اس سے ملاقات کا'' کے عنوان کی نظم اور ''بہت سے سوالات اکثر ڈراتے ہوئے سے'' نام کے سات نظموں کے سلسلے کو ان کے اسلوب کا عمدہ نمونہ سمجھتا ہوں۔''(۱)

حلقۂ ادب اردو کو یہ باور کرانا ضروری نہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصروں کو بھی ان کی دوسری تحریروں کی طرح ہی کس قدر اہمیت و وقار حاصل ہے اور وہ تبصروں کے معاملے میں بھی ہمیشہ کس قدر سنجیدہ اور محتاط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادبی تبصروں کو آج بھی بڑی وقعت اور ہر دل عزیزی حاصل ہے۔ فاروقی صاحب کی زندگی میں شایع ہونے والی کتاب ''فاروقی کے تبصرے'' ہو یا حالیہ دنوں میں محمد صہیب کی ترتیب و تدوین کے ساتھ شایع ہونے والی کتاب ''فیض معنی'' (شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصرے) ہو، ان دونوں کتابوں کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ فاروقی صاحب کے تبصروں پر مشتمل حالیہ کتاب ''فیض معنی'' میں عین تابش کی کتاب ''دشت عجب حیرانی کا'' پر تبصرہ شامل اشاعت ہے اور اہل نظر یہ بھی جانتے ہیں کہ ''شب خون'' میں تبصرے کے لیے کتنی کتابیں منتخب ہو پاتی تھیں اور فاروقی صاحب کی نظرِ انتخاب کتنی کتابوں پر ٹھہر پاتی تھی۔

عین تابش کے اسی مجموعہ کلام ''دشت عجب حیرانی کا'' پر ان کے اک ذرا سینئر اہم معاصر شاعر ڈاکٹر رونق شہری نے اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے کئی اہم نکات کی وضاحت کی ہے۔ ان کی یہ تحریر ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''بانی شناسی میں فاروقی اور نارنگ کے امتیازات'' میں بطور مضمون شامل ہے وہ لکھتے ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں شایع ہونے والے شہرۂ آفاق ماہنامہ شب خون اور دیگر اہم معاصر جراید میں ان کی غزلیں نظمیں جب تواتر سے شایع ہو رہی تھیں اس وقت بھی انہوں نے اپنی تخلیقات میں دانشوری کے Vision کو برقرار رکھا تھا اور آج بھی طوفان بدتمیزی کی دھول بھری آندھی میں صاحب دامن و دستار کہلانے کے مستحق ہیں۔''(۲)

ڈاکٹر رونق شہری نے اپنے مضمون ''دشت عجب حیرانی کا جدید شاعری کی اہم تمثیل'' میں نہ

صرف عین تابشؔ کی دانشوری کے Vision کے حوالے سے گفتگو کی ہے بلکہ اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ ان کی نظموں اور غزلوں میں کئی ناشنیدہ اور نادیدہ استعارے خلق ہوئے ہیں اور اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ نظموں کے باب میں عین تابشؔ کا کمال یہ بھی ہے کہ ان استعاروں میں کہیں گم نہ ہو کر مخاطب سے مکالمہ قایم کرنے میں کہیں Roud نہیں ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر شہری اپنی اس تحریر کے ذریعہ جو نتائج اخذ کرتے ہیں اس کا اظہار کرتے ہوئے وہ بہت واضح لفظوں میں اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ عین تابشؔ کے یہاں نظم ہو یا غزل تخلیق کی فضا بندی یا پھر لفظیاتی دروبست کا ایک خاص اہتمام رنگ و آہنگ کی بالکل نامعلوم سمت کا تعین کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ان نظموں ''سبز گنبد کے مکیں''، ''راہ گزر سے آ گئے'' اور ''میں کیسے آؤں گا آقا ترے مدینے میں'' اور غزلوں کے درج ذیل اشعار کو معتبر اور استعارۂ موسم شگفتہ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

میں اپنے کار و بارِ محبت میں محو ہوں
تھوڑی سی راہ و رسم ہے دنیا کے ساتھ میں

زوال عمر پہ یہ انتظامِ دیدہ و دل
عروج معنی و مطلب علی کا صدقہ ہے

اک اجالے میں چمک جائے وہ اجڑی ہوئی رات
اک اندھیرے میں مرا چاند نظر آ جائے

بندگی میں آتا ہے ایسا مقام
کہتا ہے میرا خدا سنتا ہوں میں

ذرا سنبھل کے یہ منظر بدلنے والا ہے
شجر کو دیر سے شاداب دیکھنے والے

فاروقیؔ صاحب کے ایک بیان کے مطابق گو کہ ان کی کم گوئی انہیں عام قاری کی نظر سے دور رکھتی ہے اس کے باوجود اب تک ان کے نو صرف شعری مجموعے منظر عام پر آ کر ادب کے خالص دانشور طبقے سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں اور علمِ وقار و اعتبار و امتیاز بلند کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہ شعری مجموعے درج ذیل ہیں:

۱۔	''اس خوشبو کا یہ قصہ ہے''	(نظمیں)
۲۔	''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے''	(نظمیں)
۳۔	''اشک عصا نے نہر نکالی''	(غزلیں)
۴۔	''رات کے آخر ہوتے ہوتے''	(غزلیں)
۵۔	''آدمی اداس ہے''	(طویل نظم)
۶۔	''مرے خواب زندہ ہیں''	(طویل نظم)
۷۔	''دشت عجب حیرانی کا''	(نظمیں/غزلیں)

۸۔ ''جس دن البم میں آگ لگی'' (نظمیں)

۹۔ ''رقص کرنا ہی جو ٹھہرا'' (غزلیں)

مذکورہ بالا ان ۹ شعری مجموعوں کے علاوہ نصف درجن سے زیادہ عین تابش کی انگریزی اور اردو میں نثری کتابیں بھی شایع ہو چکی ہیں، جن کا تذکرہ یہاں موضوع سے مطابقت نہیں رکھتا۔ عین تابش کے مذکورہ بالا شعری مجموعوں کی اہمیت اس طرح مسلم الثبوت ہو جاتی ہے کہ معاصر اردو ادب کے تخلیقی منظر نامے پر ان شعری مجموعوں نے اپنے مستحکم اور ناقابلِ فراموش عکس اور نقش ثبت کئے ہیں۔ معتبر معاصر افسانہ نگار اور شاعر خورشید اکرم اس سلسلے میں بڑی بے باک اور بے لاگ گفتگو کرتے ہیں۔ عین تابش کے تعلق سے ان کا یہ اعتراف دیکھئے:

> ''مجھے اپنے سینئر ہم عصروں میں ان سے زیادہ بہتر کوئی اور شاعر نہیں ملا۔ جس کی غزل اور نظم دونوں ایک ہی معیار بلند پر قایم ہوتی ہو۔ اور یہ بات صرف ان کے تازہ مجموعوں کے حوالے سے نہیں ہے، ان کے پچھلے مجموعوں ''رات کے آخر ہوتے ہوتے'' اور ''اس خوشبو کا یہ قصہ ہے'' سے ''آدمی اداس ہے'' تک یہ ایک طویل اور مسلسل سفر ہے۔ سچ کہوں تو بطور قاری میں نے بار بار ان کی طرف چونک کر دیکھا ہے''۔ (۳)

عین تابش کی طرف کوئی فرد اگر بطور قاری جو خود ایک لایق اعتبار قلم کار بھی ہو چونک چونک کر اور بار بار دیکھتا ہے تو یہ بس یوں ہی نہیں ہے۔ عین تابش نے متنوع موضوعات پر گرفت حاصل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اسلوبیاتی سطح پر ایک ایسے انفراد اور انفرادی کیفیت کو خلق کیا ہے جس کی نظیر تلاش کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ آج سے تقریباً ۳۴ سال قبل ۱۹۹۱ء میں مرحوم والی آسی نے جب بہ اصرار عین تابش کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''اس خوشبو کا یہ قصہ ہے'' شایع کیا تو اس کتاب کو صرف لہجے کی انفرادیت اور شعری آہنگ کی غنایت کی بنیاد پر زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے کسی معتبر ناقد کی کوئی رائے یا تاثر شامل نہیں کیا اور نہ ہی خود سے کسی طول طویل گفتگو کے ذریعہ بلند بانگ دعوے کئے، مختصر سے ذاتی تاثر کو انہوں نے ذاتی اظہار کے طور پر منظوم نظم پابند کی ہیئت میں ''میں کیا لکھوں؟'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اس منظوم عرضِ حال کے ابتدائی دو شعر دیکھئے ؎

میں کون ہوں اس دشت میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں — اے صاحبِ کن صوت و صدا ڈھونڈ رہا ہوں
یا بھولی ہوئی اپنی ادا ڈھونڈ رہا ہوں — کھویا ہوا نقشِ کفِ پا ڈھونڈ رہا ہوں

اور اس منظوم عرضِ حال کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے ؎

شبدوں کی وہ رسوائی ہے بازارِ سخن میں ناچیز ہوں تکریم نوا ڈھونڈ رہا ہوں
خاموش کھڑا اسفل و اجہل کے برابر الفاظ و معنی کا پتہ ڈھونڈ رہا ہوں
ہر سر پہ چمکتی ہوئی دستارِ فضیلت دستارِ فضیلت کا سرا ڈھونڈ رہا ہوں

اس مجموعے میں شامل نظمیں ''مسافر خواب لکھتا ہے''، ''لاریب کے جزیرے میں''، ''نمی دانم چہ منزل بود''، ''خس وخاشاک کے ملبے پہ الحمراء''، ''کہاں ہیں مصر کے بیٹے''، ''فوج واپس ہو رہی ہے''، ''رقص ابلیس''، ''بانو جب پانی مانگے گی''''اگر میں لوٹ آیا''، ''قصہ لکھا اے ہجر کے مارے''اور اس قبیل کی بہت ساری دوسری نظموں میں جو ایک طلسماتی فضا قایم ہوتی ہے وہ قاری کو مسحور بھی کرتی ہے اور دردو داغ وجستجو وآرزو کی سبیل بھی پیدا کرتی ہے۔

☆ مسافر نیند کے کاغذ پہ اب تک خواب لکھتا ہے
برس بیتے مگر کوہِ سخاوت پر کوئی منظر نہیں بدلا
وہی بھیڑوں کے گلے دوڑ کر آتے ہیں پورب سے
وہی منقار میں روٹی لئے
کوے اتر جاتے ہیں پچھّم میں
ابھی تک اسمِ اعظم لوح اقراء پر چمکتا ہے
شبیہیں فرصتِ اول میں چشمِ پرفسوں کے نام
کسب نور کا پیغام لکھتی ہیں

(''مسافر خواب لکھتا ہے'')

☆ نئے قریے کا نظارہ
چمکتا ہے خس وخاشاک کے ملبے پہ الحمراء
اٹھاؤ ٹھیکرا فانوس پر مارو
حریر واطلس وکمخواب پر کیچڑ کا چھڑکاؤ کرو
نقشیں صراحی میں بھرو گندی شرابیں

(خس وخاشاک کے ملبے پہ الحمراء)

☆ خروج عہد نو کی ساعت اول نے پوچھا ہے
کہاں ہیں مصر کے بیٹے؟

نیا آئین موجِ نیل پر لکھنا ضروری ہے
کتاب قاہرہ کے چند صفحے صاف کرنے ہیں

(کہاں ہیں مصر کے بیٹے)

تین مختلف نظموں سے یہ چند مصرعے یہاں صرف اس لئے پیش کئے گئے ہیں کہ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے کہ ان مصرعوں کے باطن سے اظہار کی جو غیر مرئی کیفیت آشکارہ ہورہی ہے وہ کس طرح لمحوں میں قاری کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے اور قریۂ ذہن میں طوفان بھی برپا کر دیتی ہے۔ عین تابشؔ کے حضور الفاظ ایک جاں نثار خادم بن کر اپنے مخدوم کے تئیں جذبۂ خود سپردگی کے ساتھ حکم بجالانے کے منتظر نظر آتے ہیں اور سجدۂ تعظیمی کو اپنا فریضۂ لازمی تصور کرتے ہیں۔ عین تابشؔ کے یہاں موجود الفاظ کے جداگانہ استعمال کی ہنر مندی کو معروف فکشن نگار عشرت ظہیر بڑے ہی مخلصانہ انداز میں خراج محبت پیش کرتے ہیں:

''عین تابش نے زندگی کی سخت جانی اور درد کے اظہار کے لئے اپنی شاعری میں لفظوں کے استعمال کا ہنرمند اور اشاراتی انداز بروئے کار لایا ہے۔ مثلاً نیزے، کربلا، بیعت، خیمہ، دجلہ، معرکہ وغیرہ جیسے الفاظ کو انہوں نے لغوی معنی سے پرے مفہوم و معنی کا طلسماتی التزام عطا کیا ہے۔(۴)

عشرت ظہیر کے اظہار رائے کی ابتداء جہاں لفظوں کے استعمال، اشاراتی انداز اور لفظوں کے مفہوم و معنی کے طلسماتی التزام سے ہوتی ہے۔ وہیں اردو فکشن کی قد آور شخصیت غضنفر اس منظر نامے کے جہانِ دیگر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ غضنفر ''اس خوشبو کا یہ قصہ ہے'' کی نظموں کے موضوعاتی نظام اور اسلوبیاتی سحر کے اس طرح اسیر نظر آتے ہیں کہ انہوں نے اپنی اس تاثراتی تحریر کا عنوان بھی ''اس خوشبو کا یہ قصہ ہے'' ہی قایم کیا ہے۔ غضنفر کی اس بے ساختہ تحریر کی کیفیت دیکھئے:

''ان میں عرفان اور گیان والی فضا کا عرفانی رنگ بھی نظر آتا ہے اور خانقاہی فلسفیانہ آہنگ بھی سنائی دیتا ہے۔ ایک عجیب طرح کی سادگی ہے جو ضبطِ نفس سے پیدا ہوتی ہے، ایک عجیب انداز کی وارفتگی ہے جو ریاضت سے حاصل ہوتی ہے''۔(۵)

یہ بات یقینی طور پر بہت ہی قابل قدر ہے کہ عین تابش کے یہاں داخل میں ہونے والی ہلچل، بے چینی، اضطراب، اداسی کے ساتھ ہی ساتھ خارجی سطح پر برپا یا رونما ہونے والے معاملات و مسائل چاہے وہ ذاتی نوعیت کے ہوں یا سماجی نوعیت کے، مذہبی نوعیت کے ہوں یا سیاسی نوعیت کے، تہذیبی نوعیت

کے ہوں یا معاشرتی نوعیت کے اور تاریخی نوعیت کے ہوں یا حادثاتی نوعیت کے ان تمام کو یکساں اہمیت دیئے جانے کا عمل بہت واضح طور پر دکھائی دیتا ہے، یا بہ الفاظ دیگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عین تابش کے یہاں داخلی محسوسات خارجی معاملات سے ہم آہنگ ہوتی نظر آتی ہے۔ بحیثیت مجموعی جن شاعرانہ خصوصیات کو عین تابش کے انفراد واختصاص کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے یا جنہیں نظر انداز کرنا کسی بھی طرح ممکن نہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی دانشورانہ فکر کو ہمیشہ اور ہر جگہ برقرار رکھا ہے، اسلوب اور لہجے کی انفرادیت کے ساتھ کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، درون ذات کی کیفیات کو بہت واضح پیکر عطا کیا۔ متصوفانہ فکر اور اس کے تمام تر علایم کو برتنے کا مخلصانہ ہی نہیں بلکہ عقیدت مندانہ رویہ اختیار کیا، معاملات وواقعات کربلا کو بطور استعارہ پیش کرنے کا بے نظیر ہنر پیش کیا، اہل بیت اطہار سے محبت وعقیدت کے ارفع ترین اظہار کو توشئہ سرخروئی بنایا، شعری نگارشات کی اشاعت کے لئے رسایل کے انتخاب میں ہمیشہ سخت گیر رہے، فارسی الفاظ وتراکیب کے استعمال کے لیے اس کی مہتم بالشان روایت کو ملحوظ نظر رکھا، تہذیبی وراثت کی امانت پر نازاں رہے، ہجرت کے المیے کو نشاط وسرمستی کے حصول کا ذریعہ بنایا، اور کرب ذات کا اظہار بھی کیفیت نشاط کے ساتھ کرنے کا ہنر اختیار کیا۔ یہاں تک کہ جن شعراء کے یہاں بھی موضوعاتی یا اسلوبیاتی تنوع موجود ہے ان کے تئیں ہمیشہ انہوں نے عقیدت مندی کا اظہار کیا۔

مذکورہ بالا گفتگو کے دوران بار بار اس احساس نے سر اٹھایا کہ اس بات کا بھی جائزہ لیا جانا چاہئے کہ فکر کی سطح سے لے کر معاملات فن تک عین تابش کے یہاں موجودہ تناظرات کس کارگہہ شیشہ گری کے انتظام وانصرام میں مصروف عمل ہیں؟

لہذا اس حوالے سے عرض ہے کہ ان کے نو شعری مجموعوں میں وہ دو شعری مجموعے بھی شامل ہیں جو ابھی بس گزشتہ چند ماہ قبل مرحلۂ اشاعت سے گزر کر منظر عام پر آئے ہیں اور یہ وہ دو شعری مجموعے ہیں جنہوں نے قریۂ ادب وشعر میں ''انگارے'' کے منظر عام پر آنے کی سی کیفیت پیدا کی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ کسی شعری مجموعے کی اشاعت کو ایسا رسپانس بہت کم ہی ملتا ہے۔ اردو کے عصری شعری ادب میں تعین قدر کے تعلق سے ان دونوں شعری مجموعوں کے ورود کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے اور حقیقتاً ان دونوں شعری مجموعوں کے سنجیدہ مطالعے کے بعد قاری کے ذہن میں ایک ایسا نادیدہ اور نا آشنا منظر نامہ تشکیل پاتا ہے جسے اپنی مثال آپ کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں شعری مجموعوں میں ایک نظموں کا مجموعہ ''جس دن البم میں آگ لگی'' ہے اور دوسرا غزلوں کا مجموعہ ''رقص کرنا ہی جو ٹھہرا''...... یہ دنوں شعری مجموعے ایم آر پبلیکیشنز دہلی نے چھاپے ہیں۔ غزلوں کا مجموعہ ۱۴۴ صفحات اور ۱۰۳ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب

شاعر نے اپنے محترم معاصر شعراء عرفان صدیقی، اسعد بدایونی اور منظور ہاشمی کے نام کیا ہے، جبکہ نظموں کا مجموعہ ۱۶۰ صفحات اور ۶۳ نظموں پر مشتمل ہے اور اس کتاب کے صفحۂ انتساب پر یہ تحریر درج ہے:

''بھیا صاحب پروفیسر حسین الحق

اس شہر سے کیا دل کو لگانے کا سبب ہو

اس شہر میں اب موسمِ رفتہ ہے نہ تم ہو

حلقۂ اردو ادب اس بات سے واقف ہے حسین الحق کی رخصت خانوادے کے لئے کس قدر اذیت ناک بے سروپا کر دینے والی ہے یہ رخصت ایک ایسے شجر سایہ دار کی رخصت ہے کہ جس نے دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ سب کے سروں پر مسلط کر دی ہے۔ عین تابشؔ کی نظموں کا مجموعہ ''اس خوشبو کا یہ قصہ ہے''، جس کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے، اس مجموعے کا انتساب بھی بھیا صاحب کے ہی نام تھا اور تب شاعر نے یہ شعر درج کیا تھا۔

اے دردِ تو اَم درماں در بسترِ بیماری اے یادِ تو اَم مونس در گوشۂ تنہائی

اس صورت حال میں کیفیت قلب کو کوئی بھی صاحب دل اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے۔

رخصت اور درد کی اس کیفیت نے عین تابشؔ کو صرف بے چین اور مضطرب ہی نہیں کیا بلکہ ادب و شعر کے ایک نئے آفاق سے بھی آشنا کرایا جس کے بہت واضح اثرات عین تابشؔ کے شعری منظر نامے پر مثل قوس قزح ابھرتے اور ڈوبتے نظر آئے اور جس کا بہت واضح عکس ان کے ان دونوں مجموعوں میں ہے۔

تو کیا نشانِ زیاں تک پہنچ گئے ہم لوگ کہاں سے چل کے کہاں تک پہنچ گئے ہم لوگ

ہوا ہے موسمِ گل راستے میں خاک تمام یہ کیسے عہدِ خزاں تک پہنچ گئے ہم لوگ

ہم ایسی رات کے قیدی ہیں جو کاٹے نہیں کٹتی ہم ایسے خواب کا دریا ہیں جو پیاسا نکلتا ہے

چلو کہ پھر وہی بزم جنوں پکارتی ہے اٹھو کہ خواب کی رت وحشتوں میں ختم ہوئی

گردش رنگ چمن اتنی زیادہ تھی کہ ہم تلخیاں گھونٹ گئے دردِ تہہ جام کے ساتھ

ان دونوں شعری مجموعوں کے تعلق سے بہت ہی مختصر سی مدت میں اب تک تقریباً ایک درجن تحریریں مضامین، تبصروں اور تاثرات کی شکل میں سامنے آ چکی ہیں۔ جن اہل قلم کی تحریروں کا میں ذکر کر رہا ہوں، ان میں غضنفر، خالد جاوید، عشرت ظہیر، ارشد عبدالحمید، خورشید اکرم، جاوید ہمایون، شجاعت علی راہی، جمیل الرحمٰن اور ناہید اختر کے علاوہ بھی کئی نام شامل ہیں۔ ان تمام تحریروں میں نہ صرف عین تابشؔ کی شاعری اور فنکارانہ لطافت و صباحت کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے بلکہ داد و تحسین کا ایک نا قابلِ دید منظر نامہ

بھی مرتب کیا گیا ہے۔

عصری ادب کے موجودہ تخلیقی منظر نامے میں عین تابشؔ کی لایق اعتبار موجودگی کے تعلق سے عصر حاضر کے ادبی تناظرات پر گفتگو کرتے ہوئے محترم جاوید ہمایون لکھتے ہیں:

''موجودہ منظر نامے میں عین تابشؔ کی شخصیت ایسی جن کے شعری کمال حسن اور حسن کمال میں ایک خوشگوار اور فکر انگیز وسعتیں اور رفعتیں نظر آتی ہیں۔ الفاظ وتراکیب میں نغمگی اور آہنگ کا اہتمام وہ اس طرح کرتے ہیں کہ حزن والم کے بیان میں بھی نرمی، شگفتگی اور موسیقی پائی جاتی ہے۔ عین تابش اپنے طویل تر شعری سفر میں غزل گوئی اور نظم نگاری میں ایک انوکھی شان وامتیاز رکھتے ہیں۔ اس کی مثال فی زمانہ مشکل سے نظر آتی ہے''۔(۶)

جناب جاوید ہمایوں کا یہ اعتراف کہ اس کی مثال فی زمانہ مشکل سے نظر آتی ہے۔ عین تابشؔ کے منصب شاعرانہ کی انفرادیت کو بھی نمایاں کرتا ہے اور آفاقیت کو بھی اور ان کے اس اعتراف کی تصدیق پوری طرح ''جس دن البم میں آگ لگی'' اور ''رقص کرنا ہی جو ٹھہرا'' سے ہوتی نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی ان کی غزلوں کے مجموعے میں ایسے اشعار مطالعۂ شعر کے دوران پل پل بصارت کا حصہ بنتے ہیں جن میں شعری کمال حسن اور حسن کمال کی مختلف جہتیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں، ساتھ ہی یہ ایک نازک اور حیرت انگیز پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ اشعار غزل داستانِ حیات وکائنات بیان کرتے ہیں۔ بہت سارے اشعار ایسے مل جاتے ہیں جن کے اندرون میں کوئی افسانہ نہیں بلکہ پوری داستان موجود ہوتی ہے۔ مثلاً

بس اک مٹی ہوئی تحریر سے بندھے ہوئے ہیں وگر نہ رقعہ وحشت کبھی جلا دیتے

اس سے نکلو اور خطِ جادوگری پر خاک ڈالو ساحروں نے جو حصارِ ہاؤ ہو کھینچا ہوا ہے

اشعار کے ذریعہ عین تابشؔ کی یہی وہ داستان گوئی ہے جو خالد جاوید جیسے بڑے اور مشہور زمانہ قصہ گو کو بھی سر دھننے پر مجبور کر دیتی ہے اور وہ عین تابشؔ کو ہم عصر اردو شاعری کا صرف ایک اہم اور منفرد شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس بات کے بھی معترف ہیں کہ ''میں ہمیشہ سے ان کی شاعری پڑھتا آیا ہوں اور اس پر سر دھنتا آیا ہوں۔ عین تابشؔ کی نظموں کے مجموعے ''جس دن البم میں آگ لگی'' کی متاثر کن اور اہم نظموں میں کم از کم درج ذیل نظموں کا انتخاب تو کیا ہی جائے گا۔ مثلاً ۱۔ ''جس دن البم میں آگ لگی'' (سیریز کی چوتھی نظم) ۲۔ ''ہم اپنی تاریخ کا لہو پی کے جی رہے ہیں'' ۳۔ ''مورخ دم بخود ہے'' (پہلی اور دوسری نظم) ۴۔ ''محلّہ رات کی آغوش میں سویا ہوا تھا'' ۵۔ ''رات میں نے حویلی کو دیکھا'' ۶۔ ''میں

اورمحمود درویش دونوں'' (محمود درویش فلسطینی شاعر) ۷۔ ''کہیں خواب اداس نہ ہو جائیں'' ۸۔ ''کاغذ پہ سیاہی پھیل گئی'' ۹۔ ''جلوہ گاہِ مشرق کے خوشنما اجالے'' ۱۰۔ ''خدا نہیں تھا وہ آدمی تھا'' ۱۱۔ ''میری شب بیدار آنکھیں'' وغیرہ۔ ان نظموں میں رفتگاں کی یاد، ماضی کی بازیافت کا عمل، عہدِ زوال کی نوحہ خوانی، عہد گزشتہ کے طلسم کا تحرک، افراد کی بے حسی اور ناگفتہ بہہ حالات سے چشم پوشی، بقا سے فنا تک کے تاریخی حقایق کا منظر نامہ، گم ہوتے ہوئے اور مٹتے ہوئے احوال و آثار کی تڑپ، فلسطین اور دیگر خطہ جبر و تشدد کی داستانیں، ظلم و جبر کا عالمی منظر نامہ، موسموں کی وحشتوں کے قصے، گزارے ہوئے موسموں سے کئے گئے عہد و پیمان، دھند میں ڈوبتی محفلوں اور بزم آرائیوں کا درد، خوابوں کے فنا ہو جانے کے احساس کی جاں گسل کیفیت، جلوہ گاہِ مشرق کے خوشنما اجالے کو یاد کر کے خون کے آنسو رونے کا عمل، اور کیا کہا جا رہا ہے سے زیادہ کیسے کہا جا رہا ہے پر توجہہ کے معاملات ایک حسن لازوال کا استعارہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

اختتام کلام سے قبل منفرد اسلوب کے معتبر شاعر جناب ارشد عبدالحمید کے ان تاثرات کو شامل کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ:

> ''عین تابش ہمارے ایسے شعراء میں نمایاں اور ممتاز ہیں جنہوں نے گزشتہ نصف صدی کے ادبی رجحانات کو نہ صرف قریب سے دیکھا ہے بلکہ ان میں شامل رہے ہیں۔ آج انہیں اردو شاعری میں جو مقام حاصل ہے وہ ایک جانب ان کی طویل مشق کی دلیل ہے تو ساتھ ہی بدلتے ہوئے شعری منظر نامے کے ساتھ دینے کی شہادت بھی ہے''۔(۷)

باتیں ابھی بہت باقی ہیں۔ لیکن فی الوقت بس اتنا ہی۔ عین تابش کے ہی ایک شعر پر آپ کی زحمت تمام کرتا ہوں۔

اس خوشبو کا یہ قصہ ہے کبھی ختم نہ ہو وہ دریا ہے
اور میں زندہ ہوں جب تک اس گدڑی میں خوشبو باقی ہے

◄● ►

کتابیات/حوالہ جات

کتابیات

ا۔ ''دشت عجب حیرانی کا'' (نظمیں/غزلیں) عین تابش۔ قاضی علی حق اکیڈمی سہسرام

۲۔''اس خوشبو کا یہ قصہ ہے''(نظمیں) عین تابش۔مکتبہ دین وادب لکھنؤ
۳۔''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے''(نظمیں) عین تابش۔قاضی علی حق اکیڈمی سہسرام
۴۔''اشک عصا نے نہر نکالی''(غزلیں) عین تابش۔قاضی علی حق اکیڈمی سہسرام
۵۔''رات کے آخر ہوتے ہوتے'' (غزلیں) عین تابش۔قاضی علی حق اکیڈمی سہسرام
۶۔''آدمی اداس ہے'' (طویل نظم) عین تابش۔قاضی علی حق اکیڈمی سہسرام
۷۔''مرے خواب زندہ ہیں''(طویل نظم) عین تابش۔قاضی علی حق اکیڈمی سہسرام
۸۔''جس دن البم میں آگ لگی''(نظمیں) عین تابش۔ایم آر پبلیکیشن،نئی دہلی
۹۔''رقص کرنا ہی جو ٹھہرا''(غزلیں) عین تابش۔ایم آر پبلیکیشن،نئی دہلی

حوالہ جات

۱۔ فیض معنی (شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصرے) ترتیب وتدوین،محمد صہیب
۲۔ بانی شناسی میں فاروقی اور نارنگ کے امتیازات (رونق شہری)
۳۔ تاثراتی مضمون (خورشید اکرم) فیس بک
۴۔ تاثراتی مضمون (عشرت ظہیر) فیس بک
۵۔ اس خوشبو کا یہ قصہ ہے (غضنفر) فیس بک
۶۔ تجزیاتی مضمون (جاوید ہمایون) فیس بک
۷۔ حیرتوں کا حساب (ارشد عبدالحمید) فیس بک

Head,dept.of urdu
Vinoba Bhave University
Hazari bagh.825319 (Jharkhand)

ثالث کی ڈاک

نام کتاب : جلتا پہاڑی سیارہ صنف : ناول

مصنف : ڈاکٹر اختر آزاد

صفحات : ۱۶۰ قیمت : ۴۰۰روپے

ملنے کا پتہ : ڈاکٹر اختر آزاد اسسٹنٹ پروفیسر،شعبۂ اردو ٹی۔این۔بی۔کالج،بھاگلپور(بہار)

● مضمون

● ڈاکٹر گلاب سنگھ

شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید: ایک مفصل جائزہ

اردو ادب کی دنیا میں تنقید ایک ایسی شمع کی مانند ہے جو ادب کے گہرے سمندروں کو روشن کرتی ہے، اور جب بات جمالیاتی تنقید کی ہو تو اس شمع کی روشنی اور بھی گہری اور پرفضا ہو جاتی ہے۔ اس میدان میں پروفیسر شکیل الرحمٰن ایک ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے نہ صرف جمالیات کے تصور کو اردو تنقید میں متعارف کرایا بلکہ اسے ایک نئی جہت اور وسعت عطا کی۔ شکیل الرحمٰن کو ''بابائے جمالیات'' کہا جاتا ہے، اور یہ خطاب ان کی تنقیدی بصیرت، تخلیقی شعور، اور ادب کے حسن کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت کا آئینہ دار ہے۔ ان کی تنقید محض تجزیہ نہیں، بلکہ ایک تخلیقی عمل ہے جو ادب کے جوہر کو دریافت کرتا ہے اور قاری کو جمالیاتی انبساط کی نئی دنیا سے روشناس کراتا ہے۔

شکیل الرحمٰن ۱۸ فروری ۱۹۳۱ کو بہار کے شہر موتیہاری میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور بعد میں اڈیشہ، سرینگر، اور بہار کی یونیورسٹیوں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ وہ تین یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر رہے، جو ان کی انتظامی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لیکن ان کی اصل شہرت ان کے تنقیدی کارناموں سے وابستہ ہے۔ شکیل الرحمٰن نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ادب کے مطالعے، تجزیے، اور جمالیاتی شعور کو فروغ دینے میں صرف کیا۔ ان کی تصانیف میں ''ہندوستانی جمالیات''، ''ہندوستانی نظام جمالیات''، ''مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات''، ''محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات''، ''رومی کی جمالیات''، ''منٹو شناسی''، اور ''فکشن کے فنکار پریم چند'' جیسی کتابیں شامل ہیں، جو ان کے جمالیاتی نقطہ نظر کی گہرائی اور تنوع کو ظاہر کرتی ہیں۔

شکیل الرحمٰن کا تنقیدی سفر اس وقت شروع ہوا جب اردو تنقید ابھی تک روایتی اصولوں اور ترقی پسند نظریات کے درمیان جھول رہی تھی۔ انہوں نے نہ تو روایت کی مکمل تقلید کی اور نہ ہی ترقی پسندوں کے نظریاتی جال میں الجھے، بلکہ ایک نیا راستہ اختیار کیا جو جمالیات پر مبنی تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ ادب کا اصل جوہر

اس کے حسن، احساس، اور تخلیقی وژن میں پوشیدہ ہے، اور تنقید کا کام اس جوہر کو دریافت کرنا ہے۔

جمالیات فلسفے کا وہ شعبہ ہے جو حسن، خوبصورتی، اور تخلیقی تجربے کے مطالعے سے متعلق ہے۔ مغربی تنقید میں اس کی ابتدا بام گارٹن سے ہوئی، اور بعد میں کانٹ، ہیگل، اور کروچے جیسے مفکرین نے اسے ترقی دی۔ شکیل الرحمٰن نے اس مغربی تصور کو نہ صرف اردو تنقید میں متعارف کیا بلکہ اسے مشرقی روایات، خصوصاً ہندوستانی اور اسلامی جمالیات کے تناظر میں ڈھالا۔ ان کے نزدیک جمالیات محض ظاہری خوبصورتی کا مطالعہ نہیں، بلکہ ایک گہرا حسی اور روحانی تجربہ ہے جو فنکار کے تخلیقی وژن اور قاری کے شعور کو جوڑتا ہے۔ شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں: ''فنون لطیفہ یا مناظر کائنات کے کسی بھی ذرے کے اصل جوہر کی دریافت جمالیات کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ جمالیات ایک ایسا آلہ ہے جس سے خدا اور اس کی صفات کو بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔'' یہ بیان ان کے جمالیاتی نظریے کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ جمالیات کو ایک عالمگیر حقیقت سمجھتے ہیں جو نہ صرف ادب بلکہ مصوری، موسیقی، اور حتیٰ کہ سائنس میں بھی موجود ہے۔ ان کے نزدیک، ادب کا حسن اس کے موضوع سے زیادہ اس کے فن، اسلوب، اور تخلیقی کیفیت میں ہے۔

شکیل الرحمٰن نے ''ہندوستانی جمالیاتی نظام'' کو بھی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا اور اس عنوان سے انھوں نے تین جلدوں میں ایک کتاب بھی ترتیب دی اور مختلف ادوار کی خوبصورتی کو انھوں نے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے جلد اول میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''ہندوستان کا نظام جہاں بہت وسیع، گہرا اور تہہ دار ہے، مختلف علاقوں میں تقسیم قبائلی فن نے اپنے اپنے طور پر ترقی کی ہے۔ قبائلی فن اس ملک کے نظام جمال میں پہلے عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہڑپا کے قدیم تمدنی آثار سے اس سچائی کا علم ہوتا ہے کہ ملک کی جمالیات کی تاریخ اور بھی پرانی ہے۔ حسن کی طلب اور تخلیق کی تمنا ابتدا سے رہی ہے، ذہنی اور جذباتی ارتقا کے ساتھ حسن کا احساس اور بڑھتا گیا، جمالیاتی شعور میں اور وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی گئی۔ ہر علاقے کے قبائلی فن پر ماحول کے حسن و جمال کا کافی گہرا اثر پڑا، پتھروں پر آڑی ترچھی لکیروں سے تصویریں بنائی گئیں، پتھروں پر انسان، پھول، جانور، پرندے بچے تھے درخت، شکار کے مناظر دکھائی دینے لگے۔ منڈا اور ''مون خمیر'' زبان بولنے والے پرانے قبیلوں کے بارے میں ہمیں زیادہ خبر نہیں ہے البتہ دراوڑی زبانیں بولنے والوں نے رقص اور تصویر کاری سے جو دلچسپی لی ہے اس کی پہچان ان

فنون کی ان صورتوں میں ہوتی ہے جو بہت بعد نظر آتی ہیں۔'' ہندوستان کا نظام جمال (جلد اول)، شکیل الرحمٰن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص: 5

شکیل الرحمٰن کا ماننا ہے کہ فنکار کا وژن ہی اس کے فن کو معنی خیز بناتا ہے۔ وہ اس وژن کو جمالیاتی تجربے کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، انھوں نے غالب کی شاعری میں ''رقص'' کو جمالیات کا مرکز قرار دیا اور اسے ذات کے عرفان اور کائنات کے جلال و جمال سے جوڑا۔ ان کی تنقید میں نفسیات اور حسیات کا گہرا عمل دخل ہے۔ وہ فن پاروں کو محض لفظوں یا واقعات کے طور پر نہیں دیکھتے، بلکہ ان کے پیچھے چھپے جذباتی اور نفسیاتی اثرات کو اجاگر کرتے ہیں۔ ''منٹو شناسی'' میں انھوں نے منٹو کے افسانوں کی جنسی جبلت کو جمالیاتی فینومینن سے تعبیر کیا۔

شکیل الرحمٰن نے سنسکرت جمالیات کے رسوں (جیسے شرنگار رس) اور مغربی نظریات (جیسے کروچے کا نظریہ اظہاریت) کو یکجا کیا۔ انہوں نے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کو سنسکرت جمالیات کی روشنی میں پرکھا اور اس میں عورت کو راگ راگنیوں اور رنگوں کا سرچشمہ قرار دیا۔ وہ المیے کو بھی جمالیاتی تجربے کا حصہ سمجھتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں انہوں نے کرداروں کے المیے میں حسن تلاش کیا اور اسے ''تخلیقی انبساط'' سے تعبیر کیا۔ شکیل الرحمٰن اساطیر اور علامتوں کو جمالیاتی تنقید کا اہم حصہ مانتے ہیں۔ ان کی کتاب ''اساطیر کی جمالیات'' میں انھوں نے اساطیری کرداروں کے نفسیاتی اور جمالیاتی اثرات کو بیان کیا۔ انھوں نے لکھا کہ:

> ''اساطیر میں تخیلی اور جذباتی فکر میں زندگی اور سماج سے فنکارانہ گریز کی عمدہ تصویریں ملتی ہیں۔ حقیقت کی مختلف جہتیں ملتی ہیں۔ ایک ہی خیال یا تصور پر کئی سمتوں سے روشنی پڑتی ہے۔ انسان کے تخیل کی شادابی کی جانے کئی مثالیں ملتی ہیں، اساطیر کا کلاسیکی مزاج فنون لطیفہ کو مختلف انداز سے متاثر کرتا رہا ہے۔
>
> وحشی اور نیم وحشی اساطیر میں چاند، سورج، تارے، قوس قزح، پہاڑ، بادل، بارش، سمندر، جانور، پرندے، درخت آبشار وغیرہ اپنے عمل اور ردعمل سے متاثر کرتے ہیں، اسطوری پیکروں میں انسانی صورتیں بھی ہیں اور بنیادی نفسیاتی محرکات بھی، چاند ستاروں کی گھریلو زندگی توجہ طلب ہے۔ تخلیقی آرٹ نے ان سے تشبیہیں، استعارے، اشارے اور علامتیں حاصل کیے ہیں۔'' (اساطیر کی جمالیات، شکیل الرحمٰن، عرفی پبلیکیشنز، ہریانہ، سنہ 2009، ص: 13)

شکیل الرحمٰن کی کتاب ''اساطیر کی جمالیات'' اردو ادب میں جمالیات کے موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔اس کتاب میں شکیل الرحمٰن نے اساطیر اور جمالیات کے درمیان تعلق کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔انہوں نے اساطیر کو انسانی تخیل کی ایک اہم جہت قرار دیا ہے جو ادب اور فنون لطیفہ میں جمالیاتی اقدار کو جنم دیتی ہے۔شکیل الرحمٰن کے مطابق، اساطیر انسانی ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ یہ قدیم داستانوں، دیوتاؤں، اور مافوق الفطرت واقعات پر مشتمل ہوتی ہیں جو انسانی تجربات اور جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔انہوں نے یونانی، رومی، اور ہندوستانی اساطیر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور ان میں موجود جمالیاتی عناصر کو اجاگر کیا ہے۔کتاب میں شکیل الرحمٰن نے اساطیر کے کرداروں اور واقعات کو انسانی نفسیات اور اقدار کی تشکیل کے عمل سے جوڑا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اساطیری کرداروں میں انسانی جذبات اور احساسات کی جھلک ملتی ہے، جو انہیں فنون لطیفہ کے لیے ایک اہم موضوع بناتی ہے۔شکیل الرحمٰن نے اساطیر کو ادب میں رومانیت کے سرچشمے کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ان کے مطابق، اساطیر میں موجود تخلیقی وژن نے ادب میں جمالیاتی کیفیات کو سمجھنے میں مدد فراہم کی ہے۔انہوں نے اساطیر کو انسانی لاشعور کی گہرائیوں سے جوڑا ہے اور بتایا ہے کہ بڑے تخلیقی فنکار اپنے فن میں اساطیر کی روشنی حاصل کرتے ہیں۔

کتاب میں شکیل الرحمٰن نے اساطیر کی جمالیات کو مختلف سطحوں پر بیان کیا ہے۔انہوں نے اساطیر میں موجود علامات، عقائد، اور نفسیاتی کشمکش کو جمالیاتی تجربے کا حصہ قرار دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اساطیر کے مطالعے سے انسان کے ابتدائی تخلیقی ذہن اور جمالیاتی کیفیات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔شکیل الرحمٰن نے اساطیر کی جمالیات کو فنون لطیفہ کی روح تک رسائی کا ذریعہ بھی بتایا ہے۔ان کے مطابق، اساطیر کے ذریعے فنون لطیفہ میں موجود جمالیاتی انکشافات کو سمجھا جا سکتا ہے۔انہوں نے اساطیر کو ادب میں ایک اہم موضوع کے طور پر پیش کیا ہے جو قاری کو جمالیاتی انبساط فراہم کرتا ہے۔کتاب میں شکیل الرحمٰن نے اساطیر کی جمالیات کو ایک نئے تناظر میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اساطیر کو صرف قدیم داستانوں کے طور پر نہیں بلکہ انسانی تخیل اور جمالیاتی شعور کی ایک اہم جہت کے طور پر دیکھا ہے۔ان کی یہ کتاب اردو ادب میں جمالیات کے موضوع پر ایک اہم اضافہ ہے اور اساطیر اور جمالیات کے درمیان تعلق کو سمجھنے کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے۔مجموعی طور پر، شکیل الرحمٰن کی کتاب ''اساطیر کی جمالیات'' اردو ادب میں جمالیات کے موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے جو اساطیر اور جمالیات کے درمیان تعلق کو تفصیل سے بیان کرتی ہے۔اس کتاب میں شکیل الرحمٰن نے اساطیر کو انسانی تخیل کی ایک اہم جہت قرار دیا ہے جو ادب اور فنون لطیفہ میں جمالیاتی اقدار کو جنم دیتی ہے۔

شکیل الرحمٰن کی کتاب ''اساطیر کی جمالیات'' اردو ادب میں جمالیات کے موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب میں شکیل الرحمٰن نے اساطیر اور جمالیات کے درمیان تعلق کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اساطیر کو انسانی تخیل کی ایک اہم جہت قرار دیا ہے جو ادب اور فنون لطیفہ میں جمالیاتی اقدار کو جنم دیتی ہے۔ شکیل الرحمٰن کے مطابق، اساطیر انسانی ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ یہ قدیم داستانوں، دیوتاؤں، اور مافوق الفطرت واقعات پر مشتمل ہوتی ہیں جو انسانی تجربات اور جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ انہوں نے یونانی، رومی، اور ہندوستانی اساطیر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور ان میں موجود جمالیاتی عناصر کو اجاگر کیا ہے۔

کتاب میں شکیل الرحمٰن نے اساطیر کے کرداروں اور واقعات کو انسانی نفسیات اور اقدار کی تشکیل کے عمل سے جوڑا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اساطیری کرداروں میں انسانی جذبات اور احساسات کی جھلک ملتی ہے، جو انہیں فنون لطیفہ کے لیے ایک اہم موضوع بناتی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے اساطیر کو ادب میں رومانیت کے سرچشمے کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق، اساطیر میں موجود تخلیقی وژن نے ادب میں جمالیاتی کیفیات کو سمجھنے میں مدد فراہم کی ہے۔

انھوں نے اساطیر کو انسانی لاشعور کی گہرائیوں سے جوڑا ہے اور بتایا ہے کہ بڑے تخلیقی فنکار اپنے فن میں اساطیر کی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ کتاب میں شکیل الرحمٰن نے اساطیر کی جمالیات کو مختلف سطحوں پر بیان کیا ہے۔ انہوں نے اساطیر میں موجود علامات، عقائد، اور نفسیاتی کشمکش کو جمالیاتی تجربے کا حصہ قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اساطیر کے مطالعے سے انسان کے ابتدائی تخلیقی ذہن اور جمالیاتی کیفیات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے اساطیر کی جمالیات کو فنون لطیفہ کی روح تک رسائی کا ذریعہ بھی بتایا ہے۔ ان کے مطابق، اساطیر کے ذریعے فنون لطیفہ میں موجود جمالیاتی انکشافات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اساطیر کو ادب میں ایک اہم موضوع کے طور پر پیش کیا ہے جو قاری کو جمالیاتی انبساط فراہم کرتا ہے۔ کتاب میں شکیل الرحمٰن نے اساطیر کی جمالیات کو ایک نئے تناظر میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اساطیر کو صرف قدیم داستانوں کے طور پر نہیں بلکہ انسانی تخیل اور جمالیاتی شعور کی ایک اہم جہت کے طور پر دیکھا ہے۔ ان کی یہ کتاب اردو ادب میں جمالیات کے موضوع پر ایک اہم اضافہ ہے اور اساطیر اور جمالیات کے درمیان تعلق کو سمجھنے کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے۔

شکیل الرحمٰن نے ہندوستانی اساطیر میں مختلف جہتوں سے جمالیات کو آشکار کر کے عقل و شعور کو روشنی اور فرحت شادمانی بخشنے کا کام کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں نت نئے طریقوں سے عمدہ مثالیں

بھی پیش کی ہیں اور پڑھنے والوں کو غور وفکر کی دعوت بھی دی ہے۔ جہاں انھوں نے جمالیاتی قدروں کی نشاندہی کی ہے وہیں انھوں نے اس سے روز مرہ کی زندگی پر پڑنے والے اثرات کو بھی پیش کیا ہے۔ ''ہندوستانی جمالیات'' جلداول میں وہ رقم طراز ہیں:

''پھولوں، پودوں، درختوں اور رنگوں کی جمالیاتی قدروں کا بھی، سماجی، تاریخی، کردار ہے، معاشی زندگی سے بھی ان کا گہرا باطنی رشتہ ہے، جمالیاتی قدروں میں انسانی یا سماجی رشتوں کی پہچان ہوتی ہے، حسن یا جمال، انسانی تجربوں سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس کا تعلق انسان، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں اور اس کے سماجی رشتوں سے ہے، رد و قبول اور لین دین کے عمل میں جمالیاتی قدروں کے سماجی کردار کی پہچان ہوتی ہے، انسان نے جانوروں، پھولوں، پودوں اور درختوں کی تصویریں بنا کر اپنے وجود کا احساس پیدا کیا۔ ابتدائی تخلیقی فکر اور عمل نے اپنے ماحول کی جمالیاتی عکاسی کی۔'' ہندوستانی جمالیات، جلد اول، شکیل الرحمٰن، سنہ 1994، ص:116

شکیل الرحمٰن نے اپنے جمالیاتی نظریات کو مختلف ادیبوں اور شاعروں کے فن پر آزمایا۔ شکیل الرحمٰن نے غالب کی شاعری کو مغل دور کے فنون لطیفہ اور ہندوستانی جمالیات کے تناظر میں دیکھا۔ انہوں نے غالب کے اشعار میں رقص، رنگ، اور نگارخانہ مانی جیسے عناصر کو جمالیاتی وحدت سے جوڑا۔ وہ لکھتے ہیں: ''غالب کی شاعری میں جلال و جمال کی کرنیں ضو پاشی کر رہی ہیں، اور یہ جمالیاتی وحدت ذات کے عرفان سے ابھرتی ہے۔''

انھوں نے قلی قطب شاہ کی شاعری میں شرنگار رس اور رتی بھو (جنسی محبت کا جذبہ) کو دریافت کیا۔ ان کے مطابق، عورت اس شاعری کا مرکزی جمالیاتی پیکر ہے جو رنگوں، خوشبوؤں، اور راگوں کی صورت میں ابھرتی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے پریم چند کو بڑا ناول نگار ماننے کے بجائے ان کی افسانہ نگاری کو سراہا۔ انہوں نے پریم چند کے کرداروں کے المیے میں جمالیاتی حسن تلاش کیا اور ''تیسرے آدمی'' کو فکشن کا اصل ہیرو قرار دیا۔ منٹو کے افسانوں میں جنسی جبلت کو شکیل الرحمٰن نے ایک جمالیاتی تجربہ قرار دیا۔ ان کے نزدیک، منٹو کا فن محض سماجی تنقید نہیں، بلکہ ایک حسی اور تخلیقی عمل ہے جو قاری کو انبساط بخشتا ہے۔ مولانا رومی کی شاعری میں شکیل الرحمٰن نے تصوف اور روشنی کے فلسفے کو جمالیاتی تناظر میں دیکھا۔ انہوں نے رومی کے تخلیقی وژن کو کائناتی وسعت سے جوڑا۔

شکیل الرحمٰن کی کتاب ''کلاسیکی مثنویوں کی جمالیات'' اردو ادب میں جمالیاتی تنقید کے میدان میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اردو کی کلاسیکی مثنویوں کے جمالیاتی پہلوؤں کا گہرا تجزیہ پیش کیا ہے، جس میں تخلیقی عمل، فینٹاسی، رومانیت اور فنکارانہ بصیرت جیسے عناصر پر توجہ دی گئی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے مثنویوں کو محض داستانی یا روایتی شاعری کے طور پر نہیں دیکھا، بلکہ انہیں جمالیاتی شعور اور تخیل کی بلند پروازی کے آئینے کے طور پر پیش کیا ہے۔

کتاب میں قدیم مثنویوں جیسے ''قطب مشتری''، ''پھول بن'' اور دیگر کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی منظر نگاری، تشبیہات، استعارات اور رومانی فضا کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری'' کے حوالے سے وہ اس کی سادگی اور حسن پسندی کو سراہتے ہیں، جبکہ ابن نشاطی کی ''پھول بن'' کو داستانی رومانیت کے جمالیاتی معیار کے طور پر نمایاں کرتے ہیں۔ شکیل الرحمٰن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مثنوی نگاروں نے تخیل کے ذریعے ایسی دنیا خلق کی جو نہ صرف قاری کو مسحور کرتی ہے بلکہ اسے جمالیاتی آسودگی بھی فراہم کرتی ہے۔

انھوں نے فینٹاسی کے کردار کو بھی اہمیت دی اور اسے تخلیقی فکر کا ایک لازمی جز و قرار دیا، جو روایتی ناقدوں کے خیالات سے مختلف ہے۔ وہ غالب کے تخلیقی وژن کا حوالہ دیتے ہوئے مثنویوں میں فینٹاسی کے نفسیاتی اور جمالیاتی اثرات کو واضح کرتے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف ادبی تنقید کے طالب علموں کے لیے مفید ہے بلکہ کلاسیکی اردو شاعری کے جمالیاتی حسن سے لطف اندوز ہونے والوں کے لیے بھی ایک قابل قدر تحفہ ہے۔ شکیل الرحمٰن کا یہ کام ان کی جمالیاتی بصیرت اور گہرے مطالعے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

شکیل الرحمٰن کا اسلوب نہایت شگفتہ، بہاؤ دار، اور شعری ہے۔ ان کی تنقید میں ایک تخلیقی مٹھاس اور گہرائی ہے جو اسے محض تجزیے سے بلند کر کے ایک فن پارے کی حیثیت عطا کرتی ہے۔ وہ پیچیدہ نظریات کو سادہ لیکن پراثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں نفسیاتی بصیرت، تاریخی شعور، اور جمالیاتی حس کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ نہ تو مغربی تنقید کی اندھی تقلید کرتے ہیں اور نہ ہی مشرقی روایات میں محصور رہتے ہیں، بلکہ دونوں کو ملا کر ایک نیا تنقیدی محاورہ تخلیق کرتے ہیں۔

شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید کو جہاں سراہا گیا، وہیں کچھ ناقدین نے ان پر اعتراضات بھی اٹھائے۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ ہر فن پارے میں جمالیات تلاش کرنے کی کوشش میں مبالغہ آرائی کر جاتے ہیں۔ ترقی پسند ناقدین نے ان پر الزام لگایا کہ وہ سماجی حقیقتوں سے زیادہ حسن کی بات کرتے ہیں، جس سے تنقید کا اصل مقصد متاثر ہوتا ہے۔ لیکن شکیل الرحمٰن کے حامیوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے تنقید کو محدود

دائروں سے نکال کر اسے کائناتی وسعت دی۔ شیخ عقیل احمد شکیل الرحمٰن کی تنقیدی جمالیات پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بابائے جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن ہندوستانی جمالیات کا تنقیدی استعارہ بن چکے ہیں۔ انھوں نے ادب اور فنون لطیفہ کی جمالیاتی جہتوں سے اردو کے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ ''ہندوستانی جمالیات'' میں ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی تہذیبی جمالیات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہندوستان جمالیاتی سطح پر دیگر ممالک سے زیادہ زندہ و تابندہ نظر آتا ہے۔ ''غالب اور ہند مغل جمالیات'' میں غالب کی شاعری ہی نہیں بلکہ مغل دور کے فنون لطیفہ کی لطافت اور نزاکت پر عالمانہ جمالیاتی ڈسکورس ہے۔ ''رومی کی جمالیات'' اور ''حافظ کی جمالیات'' تصوف اور روشنی کے فلسفے کی جمالیات پر محیط ہے۔'' مقدمہ، شیخ عقیل احمد، ادب کی جمالیات، شکیل الرحمٰن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، سنہ 2011، ص:6

شکیل الرحمٰن نے اردو تنقید کو ایک نیا وژن دیا۔ انھوں نے جمالیات کو تنقید کا بنیادی اصول بنا کر اسے تخلیقی عمل سے جوڑا۔ ان کی تنقید نہ صرف ادب کو سمجھنے کا ذریعہ ہے بلکہ ایک جمالیاتی تجربہ بھی فراہم کرتی ہے۔ شکیل الرحمن کی جمالیاتی تنقید اردو ادب کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔ انھوں نے ادب کے حسن کو نہ صرف دریافت کیا بلکہ اسے قاری کے شعور تک پہنچایا۔ ان کی تنقید ایک پل کی مانند ہے جو روایت اور جدیدیت، مشرق اور مغرب، اور فن اور فلسفے کو جوڑتی ہے۔ وہ ایک ایسے نقاد ہیں جنھوں نے تنقید کو محض اصولوں کا اطلاق نہیں بننے دیا، بلکہ اسے ایک تخلیقی سفر بنایا۔ شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید آج بھی اردو ادب کے طالب علموں اور قاریوں کے لیے ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتی ہے، جو انہیں حسن، احساس، اور تخلیق کی گہرائیوں تک لے جاتی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Department of Urdu,
University of Jammu-180006Mob: 7889762542Mob:7006847561

ثالث کی ڈاک

نام کتاب : جمہوری اداروں کا زوال　　صنف : کالم

مصنفہ : صفدر امام قادری　　مرتب : قمر الزماں چمپارنی

● شہر نامہ

● مولانا عبداللہ بخاری

مونگیر کا تاریخی وثقافتی منظر نامہ

مونگیر ایک تاریخی شہر ہے جو کہ مغرب میں دریائے گنگا اور مشرق میں پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ شہر اپنے محلے وقوع کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ شہر اس لیے بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ یہاں علماء، دانشور، صوفیا، سنت اور باکمال اصحاب علم وفضل کا دور دورہ رہا ہے۔ کسی زمانے میں یہ شہر سیاسی بصیرت رکھنے والی نامور شخصیتوں کی آماج گاہ بھی رہا ہے۔

اس شہر کو محبّ وطن جاں باز سپہ سالار میر قاسم کا پایہ تخت ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ جس کی درجنوں یادگار آج بھی قائم ہیں۔ جو میر قاسم کی شجاعت و بہادری کی کہانی بیان کرتی ہیں اور ان یادگاروں کی موجودگی مونگیر کی آن بان وشان کو دوبالا کر رہی ہے۔ یہ شہر اپنے تاریخی، تعلیمی، تجارتی اور جغرافیائی حدود کی بنا پر قابلِ دید ہے۔

مونگیر کے مشہور علماء:

یہاں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا فضل رحماں گنج مرادآبادی کی حکم پر ردِ قادیانیت واصلاح وتربیت کا وہ عظیم کارنامہ انجام دیا ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ آپ نے مونگیر اور اس کے اطراف میں قادیانیت وعیسائیت کے بڑھتے زور کا اپنے علم وفضل اور کمال سے ایسا قلع قمع کیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اسی طرح یہ شہر بانیٔ اہل حدیث ومشہور محدث حضرت مولانا سید نظیر حسین دہلوی مونگیری کی سرزمین ہے۔ جو مولانگر سورج گڑھا مونگیر کے رہنے والے تھے۔ امیر المومنین سید احمد شہید بریلوی کی تحریک اصلاح وتربیت سے متاثر ہو کر دہلی میں مقیم ہو گئے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مدرسہ رحیمیہ میں تازندگی مسندِ درس کو زینت بخشتے رہے۔ اسی طرح حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے خانقاہ رحمانی و جامعہ رحمانی کے پلیٹ فارم سے جہاں رشد و ہدایت کی تبلیغ کا کام کر رہے تھے وہیں ایوان سیاست میں اپنے ہنر کی جولانی دکھا رہے تھے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ جیسی فعال تنظیم ان

کے مشورے اور موجودگی سے وجود میں آئی تھی۔ خانوادۂ رحمانیؒ کی شخصیات کی وجہ سے بھی مونگیر کو بڑا افتخار حاصل رہا۔ اسی طرح خانوادۂ بخاری کی اولین شخصیت حضرت مولانا قاری محمد سعداللہ بخاریؒ ایک ہمہ جہت عالم دین تھے۔ ان کا شمار بافیض و باتوفیق علماء میں ہوتا تھا۔ ملک کی آزادی سے قبل ۱۹۴۲ء میں مونگیر کی سرزمین کو جامع مسجد کے پیش امام کے طور پر رونق بخشی لیکن محض امامت پر قناعت نہ کی بلکہ ۱۹۴۹ء مطابق ۱۳۷۰ھ میں مدرسہ تجوید القرآن کی بنیاد ڈالی جو اپنے وقت کا فن تجوید کا ایک مثالی ادارہ بن کر ابھرا اور جس نے فن تجوید کو پورے بہار میں متعارف و عام کرایا۔ آج بھی الحمدللہ یہ ادارہ اپنے فنی وجود اور ممتاز کارکردگی کے اعتبار سے معروف اور مصروفِ عمل ہے۔ مولانا بخاریؒ کا روحانی فیض بشکل مدرسہ تجوید القرآن پوری تابناکی کے ساتھ بہار بھر کے طلبہ اور علم کے پیاسوں کو سیراب کر رہا ہے۔ حضرت مولانا سعداللہ بخاریؒ نے کم و بیش چالیس سال امامت و تدریس کی خدمت انجام دی۔ وہ اپنے زمانے میں شہر مونگیر کے ایک اہم ستون سمجھے جاتے تھے اور بڑے اہم مسائل میں عوام الناس و علماء آپؒ سے ہی رجوع فرمایا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی تعلیمی خدمات کے حوالے سے حضرت بخاریؒ نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے احسان سے باشندگان مونگیر سبک دوش نہیں ہو سکتے۔ وہ صحیح معنوں میں فارس بالنہار اور راہب باللیل تھے۔ وہ علم و عمل دونوں کے شہ سوار تھے۔ اس لیے ان کی گود میں پلا بڑھا ہر فرد علم و عمل کا جامع ہوتا تھا۔

دینی علوم کی درسگاہیں:

انجمن حمایت اسلام، مونگیر:

انجمن حمایت اسلام، مونگیر اس شہر کی قدیم ترین رفاہی و تعلیمی اداروں میں سے ایک ہے۔ جسے زمانے کے نشیب و فراز نے کوئی زک نہیں پہنچائی۔ اس انجمن کی داغ بیل ایک ایسے نازک وقت میں ڈالی گئی تھی۔ جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شکست نے انہیں انگریزوں کے رحم و کرم کا محتاج بنا دیا تھا۔ اس وقت حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے لیے سہارا دینے والی اس تنظیم کا قیام لاہور اور مونگیر میں عمل میں آیا تھا۔

اس انجمن کے قیام کا محرک بھی وہی جذبہ تھا جس نے سرسید احمد خان کو علی گڑھ کالج قائم کرنے پر اکسایا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک سیدہ بیوہ نے غربت اور فاقوں سے تنگ آ کر اپنے بچوں سمیت عیسائی مذہب اختیار کر لیا جس کے بعد انگریزوں کے زیر سایہ چلنے والی عیسائی مشنری نے ان کا بھرپور مالی تعاون کیا اور سہارا دیا۔ اس ترک مذہب کے واقعے نے دین اسلام کے ماننے والوں خاص کر علما اور مشائخین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور مسلم قوم کو احساس دلایا کہ اس وقت مسلم امہ اس حد تک انتشار کا شکار ہے کہ

اپنے معاشرے میں رہنے والوں کے حال کی خبر گیری نہیں کرسکتی۔مسلمانوں کی اس بے حسی اور سنگدلی کے مداوا کرنے کی سخت ضرورت تھی۔جس کے لیے اکابرین امت نے ایک ایسے فلاحی ادارے کے قیام پر زور دیا جس کے ذریعے سب سے پہلے عوام کی حالت زار پر توجہ دی جائے تا کہ وہ گم راہ ہونے سے بچ سکیں۔

اس کے ساتھ ساتھ انجمن حمایت اسلام کی جانب سے مسلمانوں کے لیے تعلیمی ادارے کا قیام ایک بڑا کارنامہ ہے۔لہذا انجمن نے ابتداء سے ہی مسلمانوں کے بے سہارا بچوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی اور اس کے لیے یتیم خانے کا قیام عمل میں آیا۔یہ یتیم آج بھی قائم ہے اور یہاں سو سے زائد بچے رہائش پذیر ہوکر دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔علاوہ ازیں یتیم خانے سے ملحق ایک اسکول بھی قائم کیا جس میں عصری تعلیم کا نظم ہے۔

خانقاہ رحمانی و جامعہ رحمانی:

ہندوستان میں اسلام خانقاہوں میں رہنے والے بزرگوں کے ذریعے پھیلا ہے، ان ہی خانقاہوں میں سے ایک ''خانقاہ رحمانی مونگیر'' بھی ہے،جس کی بنیاد ایک باکمال عالم دین،اہل دل صوفی، مصلح امت، انیسویں صدی کے نامور بزرگوں میں سے ایک، بانیِ ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری (ولادت 26 جولائی 1846ء) نے 1901ء میں رکھی۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیری علیہ الرحمہ کے بارے میں ان کے شیخ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ یہ الفاظ ارشاد فرماتے تھے: ''کہ ان کی روح متقدمین کی روح کی یادگار ہے،ان کا مثل ہر زمانے میں نادر الوجود رہا ہے۔''

آپ کا شمار ان علماء ربانیین میں ہوتا تھا جن کو ہندوستان میں مجددین اور مصلحین کی صف میں شمار کیا جاتا ہے۔

مولانا مونگیری علیہ الرحمہ نے اس پر آشوب دور میں شریعت اور دینی علوم کی حفاظت اور اسلام کی خدمت کی جس میں عام علماء باہمی کشمکش اور اختلاف میں مبتلا تھے اور اسلام دشمن عناصر کے فتنوں کو بھول کر ایک دوسرے پر تنقید میں الجھے ہوئے تھے۔

انھوں نے ایسے پر آشوب ماحول میں اسلام کی مدافعت،تبلیغ واشاعت اور مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔جب بہار میں قادیانیوں نے اپنا ناپاک پنجہ بالکل گاڑ دیا تھا اور اپنے اثرات نہایت تیزی سے پھیلانے شروع کردیے تھے اور ایسا لگنے لگا تھا کہ مونگیر اور بھاگلپور کا پورا ضلع قادیانیت قبول کرلے گا۔ایسے نازک وقت میں مولانا مونگیریؒ کانپور سے سفر کی صعوبتوں کو جھیل کر قادیانیت کی بیخ کنی میں لگ گئے اور اس وقت تک اس کا پیچھا کرتے رہے جب تک کہ اس علاقے سے

قادیانیوں کا بالکل صفایانہ کردیا۔مولانا کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ'' قادیانیت کے خلاف اتنا لکھواور اتنا طبع کراؤ اوراس طرح تقسیم کروکہ ہرمسلمان جب صبح سوکراٹھے تو اپنے سرہانے ردقادیانیت کی کتاب پائے۔''

مولانا مسلسل قادیانیت شکن کام کرتے رہے، بالآخرانہوں نے کانپور سے ہجرت فرما کر مستقل مونگیر میں ہی 1903ء سکونت اختیار کرلی۔

مولانا مونگیری کی کوششوں سے ہزاروں لاکھوں لوگوں نے فسق وفجور سے توبہ کر کے دینداری اختیار کی۔آپ نے دنیا سے ظلمت کا اندھیرا مٹانے فسق وفجور ختم کرنے اوراسلام کا پرچم بلندرکھنے کے لئے زندگی بھرکوشاں رہے بالآخر 13 ستمبر 1927ء کو مالک حقیقی سے جا ملے۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا دورخانقاہ رحمانی کے لیے سنہری دور کہلاتا ہے۔آپ کی ذات بالاستودہ صفات کثیر جہتی صلاحیتوں سے مالا مال تھی۔آپ نے اپنی زندگی اسلام، مذہب اور ثقافت کے فروغ میں صرف کی۔ان کے دور میں خانقاہ رحمانی کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ خانقاہ رحمانی تحریک آزادی کے دوران ایک بڑا مرکز بن کرا بھرا۔

جامعہ رحمانی اور خانقاہ رحمانی دومنفرد ادارے ہیں۔جامعہ رحمانی دینی وشرعی تعلیم کا قلعہ ہے۔ اس کا شمار صوبہ بہار کے بڑے مدرسوں میں ہوتا ہے۔اس ادارے نے تربیتی واصلاحی میدان میں ملت اسلامیہ کی بڑی خدمت انجام دی ہیں۔

مدرسہ تجوید القرآن:

مدرسہ تجوید القرآن کا قیام حضرت مولانا سعد اللہ بخاریؒ کے ہاتھوں سنہ ۱۹۴۹ء میں عمل میں آیا تھا۔ یہ صوبہ بہار کے ان ممتاز مدرسوں میں سے ایک مدرسہ ہے جہاں قرآن، تجوید وقرأت کی تعلیم منفرد انداز میں دی جاتی ہے۔ یہاں قرآن کریم کوصحت سے پڑھنے پر زور دیا جاتا ہےاور قرآن سے اپنے رشتے کواستوار کرنے کی محنت ہوتی ہے۔ کیوں کہ قرآن کی تلاوت اس کا دیکھنا،سننا،لکھنا، پڑھنا اور سمجھنا سب عبادت میں شمار ہیں۔اس ادارے کی خدمات سات دھائیوں سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔

عصری علوم کے ادارے:

نوٹرو ڈیم :

یوں تو مونگیر میں انگریزوں کی آمد نے انگریزی تعلیم کو متعارف کرایا۔البتہ پیرس میں واقع نوٹرو ڈیم کیتھیڈرل چرچ کے زیراثر چلنے والے ادارے نوٹرو ڈیم اکیڈمی کا قیام پورے ہندوستان میں سب سے پہلے مونگیر میں ۱۹۵۰ء عمل میں آیا۔ یہ انگریزی تعلیم کا ایک ممتاز ادارہ ہے۔یہ روشنی کا علم بردار ادارہ ہے۔ جہاں اپنے

بچوں کوتعلیم دلانے کے لیے مونگیر کی عوام ہرصورت کوشاں رہتی ہے۔ یہاں کی تعلیم وتربیت کے معترف ہر کوئی ہیں۔انگریزی زبان میں دسترس کے لیے اس ادارے نے اپنی بہترین خدمات پیش کیں ہیں۔

آر۔ڈی۔ اینڈ ڈی۔ جے کالج:

۱۸۹۸ء میں ڈائمنڈ جوبلی کالج کے نام سے اس ادارے کا قیام آرٹس، کامرس اور سائنس کی تعلیم کے لیے ملکۂ برطانیہ کے حکم سے عمل میں آیا تھا۔۱۹۴۸ء میں رانی پرمیشوری دیوی کے عطیہ کے بعد راجہ دیوکی نندن کا نام اس کالج کے ساتھ جوڑا گیا۔ یہ کالج اپنی تعلیم وتدریس کی وجہ سے مشہور ہے۔اس کالج نے عصری علوم کے میدان میں طلبہ کے لیے نئی راہیں کھولی ہیں۔اس کالج کے اساتذہ کی کوششوں کی بدولت یہاں کا تعلیمی نظام ایک بلند سطح پر پہنچ گیا ہے۔ یہ کالج پہلے کلکتہ یونی ورسٹی سے ملحق تھا بعد میں پٹنہ یونیورسٹی سے ملحق ہوا بعدازاں بھاگلپور یونی ورسٹی سے ملحق ہوکر چند سال قبل مونگیر یونی ورسٹی کے قیام کا سبب بنا۔

اس کے علاوہ شہر میں مونگیر میں وشوناتھ سنگھ لا کالج قانون کی تعلیم کے لیے وقف ہے۔لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بالمیکی راجنیتی مہیلا کالج کا نام آتا ہے اور چھوٹے بڑے مختلف سرکاری وغیر سرکاری اداروں کی بھی تعلیم خدمات کا اہم کردار ہے۔جس سے مونگیر کا علمی وقار قائم ہے۔

بہار اسکول آف یوگا:

جس طرح زمانہ قدیم میں بدھسٹ اور راہب ورزش اور لڑائی کے داؤ پیچ میں مہارت رکھتے تھے۔تھائی لینڈ، کوریا، چین اور جاپان جیسے ممالک میں کراٹے، کنگ فو اور جوڈو وغیرہ بہت مقبول ہیں۔اسی طرح ہندوستان کے قدیم اکھاڑوں میں ورزش کے ساتھ ساتھ کشتی لڑنے کی ماہرانہ تربیت دے کر پہلوانوں کو تیار کیا جاتا ہے، اسی طرح یوگا کے ذریعہ صحت کو بحال رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔غرض انواع واقسام کے کھیل اور ورزشیں الگ الگ ملکوں کے اعتبار سے رائج اور مقبول ہیں۔

یوگ لفظ سنسکرت (یوج) سے ماخوذ ہے جس کے معنی شامل اور متحد ہونا ہے۔جس کا مقصد جسم اور روح کے مابین ہم آہنگی کا قیام ہے۔یعنی یوگا جسمانی اور نفسیاتی ورزش اور مراقبے کا مرکب ہے۔ یوگا کی تقریبا ۱۵۰ ورزشیں ہیں، یوگا کرنے والے شخص کو یوگی کہا جاتا ہے۔

یوگا کی تعریف، اس کے ارکان اور اس میں کیے جانے والے اعمال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یوگا ایک خالص ہندو مذہب کا حصہ ہے اور اس کی جڑیں ہندو تعلیمات سے جڑی ہوئی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہندومت کی دھارمک شخصیتیں و مذہبی پیشوا اور ہندو احیا پسند تحریکات دراصل یوگا کے توسط سے ہندومت کو قومی وعالمی سطح پر ایک عظیم کامیاب نظام زندگی کے طور پر غالب کرنے کی کوشش میں ہیں۔بہار اسکول آف یوگا کے

بانی کا یہ جملہ اس کی عکاسی بہترین کرتا ہے، وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ یوگا آنے والے زمانہ کی تہذیب ہے۔

ہندوؤں کے لیے مقدس سمجھے جانے والے اس یوگا کو چہار دانگ عالم میں متعارف کرانے کے لیے مونگیر کی سرزمین پر ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارہ یوگا آشرم (بہار اسکول آف یوگا) کا قیام ۱۹۶۴ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس ادارے نے پوری دنیا میں یوگا کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ جس کے لیے یوگا کے اسباق، اس کا نصاب، اور اس کی تدریس کا پورا نظام کھڑا کیا گیا۔ سوامی وویکا نند کے بعد اس ادارے کے بانی سوامی ستیا نند سرسوتی پہلے استاد ہیں جنہوں نے یوگا کی ترقی و ترویج کے لیے عرب ممالک کا دورہ کیا ،ان کے دورے کا آغاز اردن، مراکش، ایران، عراق ہوتا ہوا دسیوں عرب ممالک کو شامل رہا۔ اور انہوں نے یورپ اور امریکہ کا بھی دورہ کیا۔ ان کے اس سفر نے یوگا کو سائنسی انداز میں دنیا کے سامنے لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ جس کے اثرات کو سبھوں نے قبول کیا۔ ان کے ذہنوں میں یوگا کی افادیت کو اجاگر کیا۔ بہار اسکول آف یوگا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس ادارے نے یوگا کو سائنسی اور تحقیقی بنیاد پر عام کرنے کی پہل کی۔ ان کی پیہم کوششوں نے ان کے اس سنٹر کو پوری دنیا کے لیے یوگ کی سائنسی اور تحقیقی تعلیم کا مرکز بنا دیا۔ یہاں تک کہ ان کے سنٹر کے تربیت یافتہ افراد نے دنیا کے ۶۰ سے زائد ملکوں میں بہار اسکول آف یوگا کی ذیلی شاخیں قائم کیں۔ جس سے عالمی سطح پر یوگا کو تہذیب و تدریس کے لیے یک گونہ مقبولیت حاصل ہوگئی۔ بہار اسکول آف یوگا ملک بھر کے لوگوں کے لیے مرکز توجہ بن گیا ہے۔ یہاں آ کر عوام و خواص کو صحت یابی ملتی ہے۔ یوگا کے نظریہ سے واقفیت ہوتی ہے۔

''یوگا'' موجودہ صورت حال میں ایک اہم موضوع بن کر ابھرا ہے۔ حکومت ہند کی طرف سے پیش قدمی کی بنا پر اس عمل کو ہر سال کے ۲۱/ جون کو باضابطہ ''عالمی یوگا دیوس'' کے طور پر منایا جاتا ہے، اور دنیا کے ایک سو نوے ممالک میں ہر سال یوگا ڈے منایا جانے لگا ہے۔

تجارتی میدان:

تجارتی میدان میں مونگیر کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ جمالپور ریلوے کارخانہ، آرمس فیکٹری، آئی۔ ٹی۔ سی فیکٹری کی مرہون منت ہے۔ ان کمرشیل اداروں نے مونگیر کی معاشی و اقتصادی ترقی اور خدمات میں بہت اضافہ کیا ہے۔ جس سے لوگوں کے معیار زندگی میں بہتری آئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مذکورہ بالا کارخانوں نے یہاں کے باشندوں کے لیے نوکری کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ ترقی کے ثمرات سے عوام روشناس ہوئی ہے اور لوگوں کے لیے روزگار کا حصول آسان ہوا ہے۔ ریلوے فیکٹری جمالپور جو کہ ایشاء کا ایک نہایت معروف کارخانہ ہے جس کی دھوم صرف ملک میں نہیں بلکہ بیرون ملک بھی ہے جہاں نہ صرف ملکی

سطح پر بلکہ غیر ملکی طلبہ بھی آ کر فنی مہارت حاصل کرتے ہیں اور پوری دنیا کو فیض یاب کرتے ہیں۔
حالیہ زمانے میں آئی۔ ٹی۔ سی۔ دودھ فیکٹری و دیگر کمرشیل کمپنیوں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ جس نے شہر کی رونق کو برقرار رکھا ہے۔ یہ اقتصادی ترقی کا نسخہ بھی کہلاتا ہے۔

ثقافتی انجمنیں:

اقتصادی ترقی کے لیے ثقافتی کوششوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک محقق اور علمی کاوشوں میں مصرف حضرات اپنے قلم سے فرض شناسی کا حق ادا نہ کریں گے تو صحت مند ثقافت کا وجود عنقا رہے گا۔ جذبۂ عمل اور سماجی نظم و ضبط میں بھی بکھراؤ رہے گا۔ جس کو رخ پر لانے کے لیے ملی سماجی تنظیموں، ادبی حلقوں و رفاحی تنظیموں کا وجود یہاں دیکھنے کو ملتا ہے مونگیر میں قدیم ادبی تنظیم ''اردو فورم''، ادارہ رہبر اردو لائبریری اسی طرح ''ساہتیہ پر ہری''، ''اردو سرکل'' یہ وہ تنظیمیں ہیں جن کے جلوے اردو، ہندی کے فروغ میں کام کر رہے ہیں۔ انصاف واخوت کے جذبہ کو فروغ دے رہے ہیں۔ فرض سناشی کا جذبہ پیدا کر رہے ہیں۔ یہ تنظیمیں دراصل شہر کی سرسبزی و شادابی کا عنوان ہے۔ ''اردو فورم'' کا قیام ۲۵ رجولائی ۱۹۷۲ء کو عمل میں آیا۔ پروفیسر مہدی علی اس کے بانی کنو یز تھے۔ ان کے بعد ڈاکٹر سہیل اس کے کنو یز بنائے گئے۔ آجکل ڈاکٹر ایم۔ اے۔ او جوہر اس کے کنو یز ہیں۔

مونگیر اپنی علمی ادبی ثقافتی اور تاریخی حیثیت سے ایک اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کے شعراء اُدبا اور مورخین اپنی تحقیق اور کلام کی وجہ سے پورے ملک میں معروف ہیں۔ شاعر ادیب یا دانشور جو کچھ تخلیق کرتا ہے اس کی نگارشات میں ماحول اور علاقے کا اثر دکھائی دیتا ہے، اہل قلم معاشرے کا حساس ترین طبقہ ہوتا ہے اس لیے وہ معمولی سی بات کو بھی زیادہ اہمیت کا حامل سمجھتا ہے، ان کی یہی حساسیت تخلیقات کا بحث بنتی ہے، علمی و ادبی لحاظ سے مونگیر بہت زرخیز سرزمین ہے اور اسے شہر دانش بھی کہا جاتا ہے، جہاں ایسی ایسی نابغہِ روزگار شخصیات نے ادب کی آبیاری فرمائی جن کے اسمائے گرامی آج بھی آسمان شعر و سخن پر نیّرِ تاباں کی طرح روشن اور درخشاں دکھائی دیتے ہیں، یہاں کی علمی و ادبی محافل اور معاشرے پر دبستانِ عظیم آباد کا گمان ہوتا دکھائی دیتا ہے، جغرافیائی لحاظ سے بہار کا پسماندہ علاقہ ہے لیکن مضافات کے تمام شہروں سے علمی و ادبی لحاظ سے کسی سے کم نہیں ہے۔

اس شہر کے بلند پایہ شعراء و ادباء میں درج ذیل اسماء قابل ذکر ہیں۔ جناب سید مہدی علی صاحب بانی اردو فورم، جناب عبدالقیوم راہی بانی اردو سرکل، جناب ڈاکٹر سہیل، جناب پروفیسر شمشاد سحر، جناب چھند راج، جناب مرزا مشکور بیگ، جناب فیاض رشک، جناب طارق متین، جناب پروفیسر شبیر حسن، جناب پروفیسر راشد طراز، یاسین احمد، شاہ محمد صدیقی، پروفیسر اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر ایم۔ اے۔ او۔ جوہر، ماسٹر ابو

محمد ،احمد عرفان ،انیرودھ سنہا، جیوتی کمار سنہا،شیونندن سلیل ، وکاس کمار سہنا ، جاوید اختر آزاد ، یسوی بسواس اور نشاط پروین وغیرہ نے فروغ علم وادب کے سلسلے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

ان ادیبوں اور شاعروں نے جو ادب تخلیق کیا ہے اس کا بنیادی مقصد مذہبی رواداری اور بھائی چارے کا فروغ، عشق حقیقی وعشق مجازی کی داستان اور ہجر ووصال کے حالات کی عکاسی ہے۔ان کی تخلیقات میں ہندوستانی تہذیب، یہاں کے تیوہار، مجلسی اور تمدنی زندگی کے ان گنت نقوش جا بجا نظر آتے ہیں۔

مونگیر کی سڑکیں و گلیاں:

مونگیر کی تہذیب وثقافت ، اس کے قدرتی مناظر وذخائر (پہاڑ، گندھک ، لال مٹی کی خوبی و خصلت گنگا کی بہتی دھارائیں) اس بات کی غماز ہے کہ یہ شہر ایک عظیم خدائی نعمت سے کم نہیں ۔مونگیر شہر ایک بڑے حادثہ (زلزلہ عظیم ۱۹۳۲ء) کے بعد ایک عظیم اور منفرد شہر کے طور پر بسایا گیا۔ جہاں شہری حلقہ میں چوک چوراہوں کی بھر مار کشادہ اور وسیع سڑکیں، پہاڑوں کا انجماد، پیڑ پودوں کے خوشنما باغات ،صوفی سنتوں اور اچھے حکمرانوں کا مسکن رہا ہے۔ نیز علمائے ربانیین کی ریاضت کا محور بھی ہوا کرتا تھا۔

حالیہ برسوں میں تعمیر شدہ سڑک ریلوے پل مونگیر گنگا ندی پر واقع ہے یہ پل گنگا ندی پر ایک شاندار نظارہ پیش کرتا ہے بلکہ ایک پکنک اسپاٹ کے طور پر ابھرا ہے۔ جہاں سے تجارتی ،معاشی اور ثقافتی نقل و حرکت ہمہ وقت جاری وساری ہے۔ یہ حسین وجمیل پل جہاں تجارتی انقلاب برپا کر رہا ہے وہیں نقل وحمل کے شعبے میں مونگیر کو نئی رفتار عطا کی ہے اور آس پاس کے درجنوں اضلاع کی مسافت کو گھنٹوں میں سمیٹ دیا ہے۔

یہ شہر مغرب سے دریائے گنگا مشرق سے پہاڑ اور ہریالیوں سے گھرا ہوا ہے۔ جو ایک بہت ہی دل کش منظر پیش کرتے ہیں۔ یہاں کی فصلیں بھی مشہور ہیں۔ جن میں دال، گیہوں، مکئی، چاول، آم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہاں گندھک کا پہاڑ پر (سیتا کنڈ) مرزاپور بردہ میں واقع ہے جہاں گرم پانی کا چشمہ صدیوں سے بہتا چلا آرہا ہے جو کہ علاقہ بھر کے لوگوں کے لیے صحت بخش اور شفایاب پانی کا بہترین ذریعہ ہے اور اس طرح کے چشمے مونگیر میں کئی جگہوں سے بہتے ہیں جن میں رشی کنڈ، بھیم باندھ وغیرہ کے نام بھی معروف ہیں۔

مونگیر اور اس کے باشندوں کی اصل خوبی:

افراد واقوام کی طرح دنیا میں کچھ شہر ایسے بھی ہیں جن کے قصے کہانیاں، گزرے ہوئے واقعات کو بڑے شوق سے سنا اور پڑھا جاتا ہے۔ انہیں میں ہمارا یہ شہر مونگیر بھی ہے۔اس شہر کی ہر ادا دلبرانہ، اور ہر انداز شاہانہ ہے۔ یہ شہر ہمیشہ سے علماء، صوفیا، ادباء، مفکرین ،شعراء، فن کار، ہنر مند اور اہل فکر ودانش کا رہا ہے۔ مونگیر کو ۸ سال میر قاسم کے دارالحکومت رہنے کا شرف واعزاز بھی حاصل ہے۔مونگیر کے لوگوں کی نرم مجازی و

خوش خلقی کا اعتراف یہاں آنے والے ہر فرد کو ہوتا ہے۔ یہ مسافروں کا بھی شہر ہے۔ جہاں بڑے بڑے علماء، صوفیا خود چل کر آئے، بود و باش اختیار کی اور یہیں دفن ہو گئے۔ جو لوگ تقسیم وطن کے وقت یہاں سے چلے گئے وہ اپنے روح کو بھی یہیں چھوڑ گئے۔ میری ان میں سے کسی سے جب بھی ملاقات ہوئی اس شہر کا تذکرہ وہ کسی بچھڑے ہوئے محبوب کی طرح رقت آمیز لہجے میں کیا کرتے تھے۔ یہاں سے آنے والوں سے اپنے محبوب شہر کی گلی کوچوں، بازاروں، عمارتوں اور باغوں کا حال تفصیل سے معلوم کیا کرتے تھے۔ مونگیر ایک شہر ہی نہیں ایک کیفیت کا نام ہے۔ گویا یہ شہر اپنے عاشقوں کے اعصاب پر ایسا سوار ہو جاتا ہے کہ وہ کبھی کسی دوسری جگہ پر سکون نہیں پا سکتے۔ یہ ایک نشہ ہے جو طاری ہو جائے تو اترنے کا نام نہیں لیتا ہے۔ یہ کیفیت در اصل اس شہر کی گلیوں، باغیچوں اور تاریخی جگہوں میں چلنے پھرنے کے بعد دل کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتی ہے۔ جس سے انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس شہر سے اس کی روح کا رشتہ بہت اور کبھی نہ ٹوٹنے والا ہے۔

مونگیر کی مٹی میں محبت و الفت، رواداری، قومی یکجہتی کا جذبہ پایا جاتا ہے اور یہاں تمام مذاہب کے لوگ آپسی برادرانہ ماحول میں رہتے اور ایک دوسرے کا از حد احترام و لحاظ کرتے ہیں۔ اردو ہندی تنظیموں کا سنگم ہے، مونگیر کی سرزمین پر اردو کے شعراء ہندی محفلوں میں بلائے جاتے ہیں اور ہندی کے کوی حضرات اردو مجلسوں میں مدعو ہوتے ہیں جو کہ اپنے آپ میں ایک خوشنما منظر کی عکاسی کرتا ہے۔ گویا یہ شہر مونگیر اپنے اندر کئی خصوصیتوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جس یاد بھلائی نہیں جاتی۔

مونگیر کے نامور سیاست داں:

مونگیر کی معروف شخصیتوں میں ایک بڑا نام شری کرشن بابو کا ہے جو کہ بہار کے وزیر اعلیٰ بھی رہے اور ایک قد آور سیاسی رہنما، بے مثال حکمراں کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اسی طرح جناب مدھو لیمے، ڈی۔ پی۔ یادو، برھمانند منڈل، سید شاہ زبیر صاحب، جناب شاہ مشتاق صاحب، جناب سید طارق انور، جناب مناظر حسن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ملک کی آزادی کی جدوجہد میں بہار و بنگال کے علاقے میں بڑے بڑے رہنماؤں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر جناب شاہ زبیر صاحب کی دعوت پر مہاتما گاندھی جی، خان عبدالغفار خان اور نہ جانے کتنے آفتاب و ماہتاب کی آمد رہا کرتی تھی جن کی جدوجہد نے ملک کی آزادی کو شرمندۂ تعبیر کیا۔

مونگیر کے معروف اور نامور وکلا حضرات:

جناب مولوی خان بہادر سعید الدین کونندی صاحب ایک قابل اور ذہین شخصیت کے مالک تھے۔ جناب مولوی سید عبدالغنی وکیل کرمنل کے مشہور وکیل اور بڑے پر وقار انداز کے حامل تھے۔ جامع

مسجد کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ جناب سید مولوی روح القدس وکیل انتہائی سنجیدہ وکیل تھے جن کا مونگیر اور بیرون مونگیر بہت اعتراف کیا جاتا تھا۔موصوف کے اندر دینی حمیت اور قرآن سے بہت گہرا لگاؤ تھا یہی وہ صفت تھی جس کی بنا پر انہوں نے اپنے حیات میں ترجمہ قرآن پاک (انگریزی) اپنے ہاتھوں سے کیا اور ترجمہ پورا ہونے سے قبل ہی وفات پا گئے۔ جناب مرزا ظہور بیگ وکیل جو ایک اچھے وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ جامع مسجد مونگیر کمیٹی کے تاحیات سکریٹری رہے۔ جناب مولوی سید اظہار الحق وکیل یہ سول کے بڑے قانون داں شمار کیے جاتے تھے اور مونگیر میں ایک مضبوط قائدانہ قردار نبھا کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ جناب ہاشم وکیل اچھی وکالت کے ساتھ ساتھ ایک بڑے سیاست داں اور مختصر وقت کے لیے سوسلسٹ پارٹی سے ایم۔ایل۔اے۔اور وزیر بھی رہے۔

حرف آخر:

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مونگیر کے نئے اور ابھرتے ہوئے نوجوانوں کی شاعری کو پروان چڑھایا جائے اوراس کے علاوہ سرکاری اسکیم کے ذریعہ بھی شعر و ادب کی حوصلہ افزائی کی جائے۔تاریخ پر کتابیں لکھی جائیں۔اپنے اپنے فن کی سرکردہ شخصیتوں کی سوانح عمریاں سامنے لائی جائیں ، بہار سرکار کی جانب سے اسکول میں اردو پڑھنے والے طلبہ و طالبات کے درمیان مختلف عنوان سے مقابلہ جاتی و حوصلہ افزائی پروگرام، سیمینار، مشاعرہ کا انعقاد سال میں دو بار منعقد کیا جا رہا ہے جس سے طلبہ و طالبات کو اپنے شعر، مقالے اور افسانوں کو منظر عام پر لانے کا ایک بہترین موقع فراہم ہو رہا ہے۔ اسے اور بھی بڑے پیمانے پر منعقد کیا جانا چاہیئے اور اس کے پروگراموں کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے تا کہ شعری صلاحیتوں، تخلیقی و تحقیقی مضامین کو زیادہ سے زیادہ منظر عام پر لایا جا سکے۔

◀◀ ● ▶▶

Nazim Madarsa Tajweedul Quran
Jama Masjid Topkhana Bazar, Munger Bihar 811201
Mob:9431447052

ثالث کی ڈاک

نام کتاب : ابجد (سہ ماہی)

مدیران : رفیع حیدر انجم، شاہد جمیل، پرویز عالم، شاہد عادل قاسمی، رہبان علی راکیش

صفحات : ۱۳۶ قیمت : ۱۰۰ روپے

● افسانہ مع تجزیہ

● اقبال حسن آزاد

مردم گزیدہ

گلی تھی کہ شیطان کی آنت...... ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بتائی گئی تمام نشانیوں کو وہ عبور کرتا جا رہا تھا۔ بڑی سڑک جہاں پر سے بازار کے لیے مُڑتی ہے، وہاں سے بائیں ہاتھ پر ایک گلی پھوٹتی ہے۔ گلی کے سرے پر ایک سیلون ہے۔ کچھ آگے جا کر گلی کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا مندر ہے...... مندر کیا ہے بس ایک چھوٹا سا شِو لِنگ گڑا ہے۔ کچھ آگے جا کر دھوبیوں کے چند مکانات ہیں اور اسی کے پاس ایک کھلا سا میدان ہے جس میں کپڑے سوکھتے رہتے ہیں۔ بس ذرا سا اور آگے جانے پر ایک جھونپڑی کے آگے ایک بوتو بندھا ہوگا جس کے پاس ایک سوکھا سڑا سا بوڑھا اونگھتا ہوا دکھائی دے گا۔ پھر دونوں اطراف کھپریل کے کچے مکانات کا سلسلہ ہے۔ جہاں پر سے گلی کشادہ ہونے لگتی ہے، سمجھ لیجیے کہ کالونی آ گئی۔ وہاں سے پختہ مکانات ملیں گے۔ بس دو مکان کو چھوڑ کر تیسرا مکان...... کسی سے بھی پوچھ لیجیے گا مگر کسی سے پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں...... گیٹ کے باہر میرے نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔ دو منزلہ مکان ہے۔ نیچے چھوٹا سا لان ہے۔ لان کے ایک سرے پر ہینڈ پمپ لگا ہوا ہے...... اور ہاں مکان کے پاس ہی ایک پان کی دکان ہے اور ایک چائے خانہ بھی۔ یہ شارٹ کٹ ہے۔ اگر سڑک سڑک آیئے گا تو بہت لمبا پڑے گا۔''

اس کے ہونے والے مکان مالک نے راستہ بتاتے ہوئے کہا تھا اور پھر تاکید کی تھی۔

''اور ہاں! سویرے چھ بجے تک ضرور پہنچ جایئے گا۔ ساڑھے چھ بجے میں یوگا کلب چلا جاتا ہوں۔''

اب ہوا یوں کہ سیلون والی گلی میں داخل ہونے کے بعد وہ شِو لِنگ کو کراس کرتے ہوئے دھوبیوں کے مکانات، کھونٹے سے بندھے ہوئے بوتو اور اونگھتے ہوئے بوڑھے کو پیچھے چھوڑ آیا تھا مگر اب جو کچے مکانات کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایسے ہی کچے مکان اس کے گاؤں کی گلیوں میں بھی تھے مگر وہاں کی گلیاں شیطان کی آنت کی طرح لمبی نہیں ہوتی تھیں البتہ پُر پیچ ضرور تھیں اور گلیاں بھی ایسی کہ بیک وقت صرف ایک آدمی ان میں سے گزر سکتا تھا۔ ایسی ہی ایک گلی سے گزرتے وقت ایک کتے نے اس کی پنڈلی

میں دانت گڑا دیے تھے۔حالانکہ ایسے موقعوں کے لیے اسے اپنے باپ کی نصیحت اچھی طرح یاد تھی کہ اگر راہ میں کتے نظر آئیں تو خاموشی سے چلتے رہو۔ان کے قریب سے گزرتے ہوئے کوئی حرکت نہ کرو......نہ ان کی طرف دیکھو......خاموشی سے گزر جاؤ۔مگر وہاں گلی اتنی تنگ تھی کہ باپ کی نصیحت اس کے کام نہ آئی۔کتا اسے دیکھ کر بھونکا تو وہ اضطراری طور پر پلٹ کر بھاگا اور کتے نے اس کی پنڈلی میں دانت گڑا دیے تھے۔اس وقت وہ صاف دھلا ہوا نیا کرتا پائیجامہ پہنے ہوئے تھا۔اس کا پائیجامہ پائنچے کے پاس سے تھوڑا سا پھٹ گیا۔ اس نے کسی طرح کتے سے پیچھا چھڑایا تھا اور بھاگتا ہوا گھر آ گیا تھا۔اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر گھر میں کسی کو پائجامے کے پھٹنے کی بات معلوم ہوگئی تو اس کی گوشمالی ہوگی۔اس نے پانی سے زخم دھوکر وہاں پر رومال باندھ دیا تھا۔چند ہی دنوں میں وہ زخم سوکھ گیا تھا اور وہاں کھرنڈ جم گئی تھی۔اب اتنے برسوں بعد کتے کے دانت کے نشان معدوم ہو چکے تھے۔وقت کا مرہم ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔

اس نے وقت دیکھنے کے لیے گھڑی پر نظر ڈالی۔چھ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔اگر اس کے موجودہ مالک مکان نے اسے عاجز نہ کر دیا ہوتا تو شاید اس وقت وہ اپنے بستر پر پڑا سو رہا ہوتا۔اب یہ نیا مالک مکان کیسا نکلے گا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ویسے دیکھنے سننے میں تو شریف لگتا ہے۔البتہ اس کی چند شرائط بھی تھیں۔

''دیکھئے! وہ شریفوں کی کالونی ہے اس لیے میں بہت چھان پھٹک کر کسی کو مکان کرایے پر دیتا ہوں۔میرے پاس چار فلیٹ ہیں......دو نیچے اور دو اوپر۔ایک فلیٹ میں میں خود رہتا ہوں۔دو کرایے پر اُٹھے ہوئے ہیں۔تیسرا ابھی ابھی خالی ہوا ہے۔ہم لوگ سکون سے رہنے والے لوگ ہیں،اس لیے میں چاہوں گا کہ آپ سے ملنے جلنے والے زیادہ لوگ وہاں نہ آئیں۔باتھ روم کی صفائی آپ کو خود کرنی ہوگی۔کسی صفائی کرنے والے یا والی کو ہم لوگ گھر کے اندر داخل ہونے نہیں دیتے۔نیچے لان میں جو ہینڈ پمپ لگا ہے (اگر وہ کبھی خراب ہو گیا تو) اس کی مرمت سارے کرایہ داروں کو مل کر کرنی ہوتی ہے......اور ہاں، گیٹ رات نو بجے بند ہو جاتا ہے۔''

وہ سر جھکائے ساری بات سنتا رہا تھا۔اسے یہ سوچ کر اطمینان ہوا تھا کہ بلڈنگ آباد ہے۔ابھی پچھلے سال ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔بیوی امید سے تھی۔وہ دن بھر گھر میں اکیلی رہتی،ادھر وہ آفس میں فکرمند رہتا۔اگر اس کے غائبانے میں درد زہ اُٹھ گیا تو......؟ یہاں اوپر تلے کئی لوگ ہیں۔وقت ضرورت آدمیوں کی کمی نہ ہوگی۔

چلتے چلتے اس نے پھر تاکید کی تھی۔

''سویرے چھ بجے تک ضرور آ جائیے گا۔''

اور اب جبکہ چھ بجنے میں محض چند منٹ رہ گئے تھے تو اسے دور سے چائے خانہ دکھائی دے گیا۔ پاس ہی پان کی دکان تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے آٹھ دس کتے گلی کے بیچوں بیچ اس طرح آڑے ترچھے پڑے دکھائی دیے کہ آگے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ برسات کا موسم تھا اور انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ سب کے سب تھک ہار کر سوئے پڑے ہوں۔ چائے خانہ کھل چکا تھا اور چائے خانے کا مالک چولہے میں کوئلے دہکا رہا تھا۔ چند گاہک بنچ پر بیٹھے غالباً چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ پان کی دکان کا مالک ایک بانکا سجیلا نوجوان تھا۔ ایک شخص پان کی دکان سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ سامنے ہی اس کا مطلوبہ مکان تھا۔ جالی دار گیٹ اندر سے بند تھا مگر لان کا سارا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص لنگی باندھے ہینڈ پمپ سے پانی بھر رہا تھا۔ لوہے کے تار پر تولیہ لٹک رہا تھا۔ بالٹی کے پاس ایک صابن دانی رکھی تھی۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک عورت برتن صاف کر رہی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا ہاتھ میں بلّا پکڑے طرح طرح کے پوز بناتے ہوئے شاٹ کھیلنے کی نقل کر رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ یہ لڑکا اگر کرکٹر بن گیا تو کروڑوں میں کھیلے گا۔ وہ اپنی دھن میں آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ اس کی آہٹ پا کر کتوں نے آنکھیں کھول دیں اور پھر وہ سب کے سب اس کی جانب تشویش، تعجب اور غصے کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اسے اپنے مرحوم باپ کی نصیحت ایک بار پھر یاد آ گئی۔

''راہ میں اگر کتے نظر آئیں تو خاموشی سے چلتے رہو۔ دوڑو مت کہ دوڑنے والے کے پیچھے کتے دوڑ پڑتے ہیں۔ اس لیے خاموشی سے چلتے رہو اور ان کے قریب سے گزرتے وقت کوئی حرکت کرو نہ ان کی طرف دیکھو۔ خاموشی سے گزر جاؤ۔''

''اس نے ایسا ہی کرنا چاہا مگر وہ نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ تھا اور کتوں کی نقل و حرکت سے اس کے دل میں اندیشے اُٹھ رہے تھے۔ اسے لگا جیسے وہ کسی تاریک کمرے میں محبوس ہے جہاں کونے میں ایک بڑا سا گھڑا رکھا ہے اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کمرے کے بیچوں بیچ پڑا ہے۔ کتے کے ذریعہ کاٹے جانے کے کئی بعد کی بات ہے۔ وہ تالاب کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہ پانی میں اسے اپنے عکس کی جگہ ایک کتے کا عکس نظر آیا۔ وہ چونک کر مڑا مگر وہاں کوئی کتا نہ تھا۔ اس نے پھر پانی میں دیکھا۔ اسے پھر کتے کا عکس نظر آیا۔ وہ ڈر گیا۔ پھر اس نے یہ بات اپنے چھوٹے چچا کو بتا دی۔ وہ چونک پڑے۔

''کیا تمہیں کبھی کسی کتے نے کاٹا ہے؟'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چھوٹے چچا نے فوراً سائیکل اُٹھائی اور اسے آگے بٹھا کر منگل ہاٹ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں ہر منگل کو بازار لگتا تھا۔ وہاں ایک حکیم صاحب بھی آتے تھے جو کتے کے کاٹے کا شافی علاج کرتے تھے۔ اس روز بھی منگل تھا۔ حکیم صاحب

آئے ہوئے تھے۔انہوں نے چار آنے کی ایک پڑیا دی اور کہا کہ اس لڑکے کو کسی تاریک کمرے میں تین دن اور تین راتیں بند رکھو۔کمرے میں ایک بہت بڑا گھڑا رکھ دو۔تین دن بعد میں آؤں گا۔پھر ہوا یوں کہ اسے دوا کھلا کر کمرے میں بند کر دیا گیا۔سارے روشن دان بھی بند کر دیے گئے۔چھپر میں جو چھید تھے، انہیں بھی بند کر دیا گیا۔اب اسے یہ یاد نہیں کہ ان تین دنوں میں اسے کچھ کھانے پینے کو ملا تھا یا نہیں۔تین دن اور تین راتیں گزر گئیں۔چوتھے روز حکیم صاحب آئے۔دروازہ کھلوایا گیا۔حکیم صاحب ناک پر رومال رکھ کر اندر داخل ہوئے۔انہوں نے گھڑے میں جھانک کر دیکھا اور واپس آ کر اعلان کیا۔

''زہر کے سارے کیڑے نکل گئے۔اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔''

مگر خطرہ تو سامنے کھڑا تھا۔منزل قریب تھی مگر کتے اس کی جانب خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ان میں سے چند ایک اُٹھ بیٹھے تھے اور اپنے بدن کو کھینچ کر انگڑائیاں لے رہے تھے۔وہ اپنی زبان بھی لپلپا رہے تھے۔پھر ان میں سے ایک کتا جو سب سے بڑا تھا اور بالکل سیاہ تھا، اُٹھ کھڑا ہوا۔پہلے اس نے اپنی اگلی دونوں ٹانگوں کو زمین پر جما کر زور کی انگڑائی لی اور پھر اس کی جانب محتاط قدموں سے بڑھا۔اس کی نیّت بخیر نظر نہ آتی تھی۔اسے لگا جیسے اس کا دل بیٹھا جا رہا ہو۔کتا زور سے بھونکا۔

''بھوں......بھوں......بھوں!'' پھر سبھی کتے ایک ساتھ بھونکنے لگے۔اسی لمحے اسے اپنی پشت پر بھی کتوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔اب وہ چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ اردگرد کے مکانوں سے لوگ لپک کر آئیں گے اور اسے ان درندوں سے چھٹکارا دلائیں گے۔اسے توقع تھی کہ سگریٹ پیتا ہوا آدمی اس کی مدد کو آئے گا، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔جو لوگ گھروں کے اندر تھے وہ باہر نہیں نکلے اور سگریٹ پیتا ہوا آدمی ایک مخصوص ادا کے ساتھ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اس کی جانب دیکھتا رہا تھا۔پان کی دکان پر بیٹھا ہوا بانکا دلچسپ نظروں سے اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔چائے خانے کا مالک اور وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ اس کی جانب یوں دیکھ رہے تھے گویا یہ روز کا معمول ہو۔اس کا خیال تھا کہ مستقبل کا کرکٹر بلّا لے کر دوڑا آئے گا یا پھر پانی بھرتا ہوا آدمی یا برتن مانجھتی ہوئی عورت اس نوجوان کو اس کی مدد کے لیے بھیجے گی مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا اور وہ نوجوان بلّے کو زمین پر ٹکا کر پُرشوق نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔کتے زور زور سے بھونک رہے تھے۔

''بھوں......بھوں......بھوں!'' اچانک اس کا ہونے والا مکان مالک بالکنی میں نمودار ہوا۔غالباً وہ کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر بالکنی میں نکل آیا تھا۔اس نے اوپر سے ہی پکار کر کہا۔

''ڈریئے مت......یہ صرف بھونکتے ہیں، کاٹتے نہیں۔آ جائیے، گیٹ کے اندر آ جائیے۔''

اس نے ایک لمحے کو نگاہیں اُٹھا کر مالک مکان کو دیکھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ کھڑا تھا۔ ادھر کتے تھے کہ کاٹ کھانے کے موڈ میں تھے اور وہ کالا کتا تو بالکل قریب آ گیا تھا۔ اس وقت وہ بالکل نہتا تھا۔ پہلے اس نے بازو ہلا ہلا کر، شی شی، ہش ہش کر کے انہیں ہٹانے کی کوشش کی لیکن اس کی اس حرکت سے کتے اور جوش میں آ گئے۔ اسے سڑک کے کنارے ایک بڑی سی اینٹ پڑی دکھائی دی۔ اگر وہ کسی طرح اس اینٹ تک پہنچ سکتا؟...... یا اگر وہ گھر سے چھتری لے کر چلا ہوتا۔ مگر آج تو مطلع صبح سے ہی صاف تھا۔ اب اسے کسی طرف سے بھی مدد ملنے کی اُمید نہیں رہ گئی تھی۔ تب اس نے بڑی سرعت کے ساتھ پینٹ کی بیلٹ کھولی اور اسے زور زور سے ہوا میں گھمانے لگا اور پھر بیلٹ کا بکلس ایک کتے کی تھوتھنی سے ٹکرایا تھا۔ کتے کے منہ سے کریہہ چیخ نکلی۔ وہ تیزی سے مڑا اور دُم دبا کر چیں چیں کرنے لگا۔ دوسرے کتے بھی جھجک جھجک کر پیچھے ہٹنے لگے۔ مگر وہ پیچھے ہٹتے جاتے تھے اور بھونکتے جاتے تھے۔ اس کے لیے اتنا موقع غنیمت تھا۔ اس نے لپک کر اینٹ اُٹھائی اور تاک کر اس کالے کتے کے منہ پر مارا جوان کا سرغنہ تھا۔ کتے کا سر چکرا گیا اور ایک بھیانک چیخ کے ساتھ اپنی پچھلی ٹانگوں پر اُلٹ گیا۔ اس کے پسپا ہوتے ہی میدان صاف ہو گیا اور سبھی دُم دبا دبا کر بھاگنے لگے مگر وہ بھاگتے جاتے تھے اور بھونکتے جاتے تھے۔ اس نے دوڑ کر دو تین ڈھیلے اُٹھائے اور انہیں تاک تاک کر مارنے لگا۔ کتے اب کافی دور جا کر کھڑے تھے اور وہیں سے غرّا رہے تھے مگر اب وہ ان کی غرّاہٹ سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ اتنے میں سگریٹ پیتے ہوئے آدمی نے زور سے آخری کش لیا اور پھر سگریٹ کے ٹوٹے کو ہوا میں اُچھالتے ہوئے اس کے قریب آیا اور بولا۔

''آپ ڈرتے نہیں؟ بڑے بہادر ہیں آپ!''

''وہ کالی چڑی والا تو ایک نمبر کا حرامی ہے۔ کئی لوگوں کو کاٹ چکا ہے۔'' پان کی دکان پر بیٹھے ہوئے بانکے نے وہیں سے کہا۔ تبھی مکان کا گیٹ کھلا اور پانی بھرنے والا آدمی باہر نکلا اور کہنے لگا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ یہ کتے کیوں بھونک رہے ہیں۔''

مکان مالک نے بالکنی میں کھڑے کھڑے ہاتھ ہلا کر کہا،

''آ جایئے، آ جایئے۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اوپر آ جایئے۔''

اس کے ہاتھ میں اب بھی چند ڈھیلے بچ رہے تھے۔ اس نے حقارت کے ساتھ ڈھیلوں کو سڑک کے کنارے پھینکا اور واپسی کے لیے مُڑ گیا۔

◀◀ ● ▶▶

● تجزیه

● عشرت ظهیر

اقبال حسن آزاد کا افسانہ 'مردم گزیدہ'

اقبال حسن آزاد بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، لیکن دیگر اصناف ادب میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ تنقیدی مضامین، تبصرے، انشائیے اور فن شاعری کے قابل لحاظ نمونے ان کے زنبیل ادب سے برآمد ہوتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں اشاعت پذیر ہو کر مقبول ہوئی ہیں۔ افسانوں کے تین مجموعے ''قطرہ قطرہ احساس'' (دو ایڈیشن)، ''مردم گزیدہ'' اور ''پورٹریٹ'' کے علاوہ تحقیقی کتاب ''اردو نثر میں طنز و مزاح کی روایت'' اہمیت کی حامل ہیں۔

فی الوقت مجھے ان کے افسانہ ''مردم گزیدہ'' پر تجزیاتی نوٹ رقم کرنا ہے۔ لیکن کسی ایک افسانہ پر اظہار خیال مشکل امر ہے۔ جیسا کہ معروف و مقبول شاعر بدنام نظر اپنے مضمون 'اقبال حسن آزاد کا پورٹریٹ' میں لکھتے ہیں:

> ''ایک کہانی پر لکھنا کوئی آسان کام نہیں، کیونکہ شاعری کی طرح آج کی کہانیوں میں بھی کئی پرتیں ہوتی ہیں۔ ہر پرت کو کھولنا اور گہرائی سے اس کا مطالعہ کرنا سر دست مجھ سے ممکن نہ ہو سکے گا۔''

زیر نگاہ افسانے کا عنوان دیکھ کر نہ جانے کیوں، غالب کا یہ شعر پردۂ ذہن پر ابھر آیا؛ حالانکہ اس شعر کا افسانہ 'مردم گزیدہ' سے بظاہر کوئی علاقہ نہیں:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

ممکن ہے، یہاں بھی افسانہ کے عنوان کے لیے قرۃ العین حیدر کی طرح 'شعر سے محض استفادہ کی صورت ہو۔' فی الحال غالب کے اس شعر کو یہیں چھوڑتے ہیں۔

پہلی نظر میں افسانہ 'مردم گزیدہ' سادہ لیکن موثر بیانیہ میں ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اس میں بتدریج

وارد ہونے والے واقعے اور احساسات کو فطری انداز میں، ہنرمندی اور خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

یہاں سادہ بیانیہ کے توسط سے ایک عام سے واقعہ کا اظہار ہے۔لیکن اس سادہ بیانیہ اور عام سے واقعے کے ذکر میں تہہ داری کے فکر انگیز پہلو اور ہنرمندی کی مسحور کن فضابندی، افسانہ نگار کے کمالِ فن کی غماز ہے۔

کوئی سوا سو سال کی مدت کے سفر میں فن افسانہ نے فنی تبدیلیوں اور رد وقبول کے مختلف مرحلے طے کیے ہیں۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں، لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کا افسانہ موضوع کے ساتھ اظہار بیان کے کرب کو لیے ہوئے ہے۔متذکرہ افسانہ 'مردم گزیدہ' میں بھی ایک خیال، ایک تصور اور ایک کیفیت کے اظہار میں سادہ بیانیہ انڈر کرنٹ کے روپ میں ہے۔

افسانہ کی فضابندی میں ناسٹلجک کیفیت اور تضاد کی دھندلی شبیہ اسے پرکشش اور Readable بھی بناتی ہے، اور انسان کی سرشت میں شامل تذبذب اور متضاد کیفیتوں کو بھی آشکار کرتی ہے۔

افسانے کا آغاز متوجہ کرتا ہے اور اس کا انجام گہرے استغراق میں مبتلا کرتا ہے۔افسانے کی ابتدائی عبارت ملاحظہ ہو:

''گلی تھی کہ شیطان کی آنت... ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔''

اور اس عبارت کے بعد نشان منزل پر پہنچنے کے سلسلے میں بتائی گئی علامتوں کا دل آویز توضیحی منظر نامہ ابھرتا ہے، یہ منظر نامہ مشاہدے کی تپش سے حقیقت آمیز بھی ہے اور گویا قاری کی نظروں میں Running Commentary جیسا دلچسپ بھی ہے۔

اس افسانے میں زندگی کی کئی حقیقتیں تہہ در تہہ پیوست ہیں، جو مشاہدوں اور تجربوں کی بھٹی میں تپ کر کھری اور حقیقت افروز انداز میں عکس ریز ہیں۔مثلاً مالک مکان کی رعونت، محلے میں چائے خانوں پر بلا مقصد کھڑے افراد، سرراہ کتے، جانور، اور 'بوتو' کی منظر کشی دلچسپ بھی ہے اور حقیقت سے قریب بھی۔

افسانے کے مرکزی کردار کو کرایہ کے لیے مکان کی جستجو ہے کیونکہ اس کے موجودہ مالک مکان نے اسے عاجز کر دیا تھا، اب وہ نئے مالک مکان سے ملنے اور مکان کے حصول کے لیے وقت مقررہ، صبح چھ بجے، نئے مکان تک پہنچنے کے لیے کوشاں تھا۔

نئے مالک مکان نے مکان تک پہنچنے کے لیے جس قدر نشانیاں اور علامتیں بتائی تھیں، افسانے میں ان کی منظر کشی نے ہنرمندانہ برجستگی اور سچی تصویر کشی کی ایسی رنگ آمیزی منعکس کی ہے، گویا قاری افسانے کی قرأت سے نہیں گزر رہا ہے، بلکہ مکان کی تلاش میں بتائی گئی نشانیوں، یعنی بڑی سڑک جہاں

بازار کے لیے مڑتی، وہاں سے بائیں ہاتھ پر پھوٹتی ہوئی گلی سے گزر کر سیلون تک آ گیا ہے اور پھر:

''کچھ آگے جا کر گلی کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا مندر... مندر کیا بس ایک چھوٹا سا شولنگ گڑا ہے...''

یہاں گلیوں، شاہراہوں کے آس پاس شیولنگ، ہنومان کی سنگی مورتی یا دیگر دھارمک علامتوں سے چھوٹے چھوٹے مندروں کے روپ و رنگ کی تعمیرات تصورات میں ابھر آتے ہیں۔ افسانہ نگار کی ہنرمندی ہے کہ منظر کشی میں سادگی اور غیر جانبدارانہ اظہار تو ہے، لیکن بین السطور سے سماج کے بہتیرے رنگ ڈھنگ بھی جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تلاش منزل کے نشانات و جزیات کے دلچسپ اور پر پیچ سلسلوں سے گزرتے گزرتے افسانے کا مرکزی کردار ناسٹلجک ہو جاتا ہے اور بچپن میں:

''... ایسی ہی ایک گلی سے گزرتے وقت ایک کتے نے اس کی پنڈلی میں دانت گڑا دیئے تھے...''

کتے کے دانت گڑانے اور اس کے اثرات کے تذکرے، دراصل آنے والے واقعات کے لیے بطور Psycho analysis فضابندی کرتے ہیں اور اس کے اندر خوف کے جرثومے کے پنپنے کے اشارے ہیں اور وہ انھیں، خوف، تذبذب اور متضاد کیفیتوں کے درمیان مکان کے قریب پہنچتا ہے جہاں:

''... آٹھ دس کتے گلی کے بیچوں بیچ اس طرح آڑے ترچھے پڑے دکھائی دیئے کہ آگے کا راستہ بند ہو گیا...''

گلی میں کتوں کا اس طرح آڑے ترچھے انداز میں پڑا رہنا عام سی بات ہے، یہ منظر ہم آئے دن دیکھتے ہیں، اور اس منظر کی خوف زدگی نے اس کے اندر آس پاس موجود افراد سے مدد کی آس جگائی، مگر کوئی اس کی مدد کو اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ سب تماشائی تھے۔

آس پاس کا منظر کچھ اس طرح ابھرتا ہے:

- ایک شخص پان کی دکان سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔
- ایک ادھیڑ عمر کا شخص لنگی باندھے ہینڈ پمپ سے پانی بھر رہا تھا۔
- اس سے ذرا ہٹ کر ایک عورت برتن صاف کر رہی تھی۔
- ایک نوجوان لڑکا ہاتھ میں بلا پکڑے طرح طرح کے پوز بناتے ہوئے شاٹ کھیلنے کی نقل کر رہا تھا۔

دنیا میں اکثر افراد محض تماشائی ہوتے ہیں، کوئی سڑک پر کیلے کے چھلکے سے پھسل کر گر جائے تو ہنستے ہیں۔ یہاں بھی گویا آس پاس کے یہ لوگ ہنسنے کے منتظر ہیں۔ ماضی میں کتے کے کاٹنے اور علاج کی صعوبت اور اذیت کو جھیلنے کی یادوں نے تازہ جھونکوں کی طرح بالآخر اس میں قوت مدافعت جگا دی اور اس نے ڈھیلے مار مار کر بالآخر تمام کتوں سے راہ کو صاف کر دیا، لیکن یہاں کہانی میں ایک ٹوئیسٹ (Twist) ہے۔ اسے مکان کی اشد ضرورت تھی، چونکہ اس کی بیوی حاملہ تھی لہٰذا وہ آباد محلّہ اور بھری پری بلڈنگ میں رہائش پذیر ہونا چاہتا تھا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی بے بس و بے سہارا نہ ہو اور اب وہاں، اس وقت مکان مالک بالکنی میں کھڑے کھڑے ہاتھ ہلا کر کہہ رہا تھا:

''آجایئے، آجائے، اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اوپر آجایئے۔''

لیکن:

''اس کے ہاتھ میں اب بھی چند ڈھیلے بچ رہے تھے، اس نے حقارت کے ساتھ ڈھیلوں کو سڑک کنارے پھینکا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔''

کہانی کے پورے منظر نامے میں، ناسٹلجک صورت حال اور پیراڈوکس کی کیفیت پیش آئند واقعے کے معاون ہیں، لہٰذا نئے مکان میں منتقل ہونے کی صورت میں مسلسل تفکر اور خوف کی کیفیت کے طاری ہونے کے امکان کی شدت کے پیش نظر بجا طور پر کہانی کے مرکزی کردار کو پرانے مکان کی طرف لوٹنے میں زیادہ عافیت دکھائی دیتی ہے، کیونکہ نئے مکان کے آس پاس کا ماحول اور ارد گرد افراد اسے کسی جذبۂ انسانیت اور مثبت عمل سے پرے، لاپروا اور تماشائی دِکھے، اور یہاں گویا آئے دن کا خطرۂ جاں تھا، لہٰذا افسانے کے مرکزی کردار کے واپس لوٹنے کا عمل افسانے کا تقاضائے حسن بھی ہے اور موثر اختتامیہ بھی، جو قاری کو گہرے استغراق میں مبتلا کرتا ہے۔

وہ سگ گزیدہ تھا لیکن اچانک گویا مردم گزیدہ کی صورت، منقلب ہو چکا تھا اور پان کی دکان پر ٹیک لگائے سگریٹ پیتے ہوئے شخص، ادھیڑ عمر، لنگی باندھے شخص، برتن صاف کرتی عورت، بلا پکڑے طرح طرح کے پوز بناتا ہوا نوجوان لڑکا اور خود مالک مکان سے وہ خوف زدہ تھا، اور صورت حال تھی:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

● افسانہ مع تجزیہ

● عشرت ظہیر

باباجان

میں چھ فولڈ میں کھلنے اور بند ہونے والے لکڑی کے بڑے گیٹ کے سامنے کھڑا ہوں۔ لیکن اب یہ 'چھ فولڈ' اور 'بڑا سا گیٹ' اپنے تہذیبی تمکنت اور شان وشوکت کھو چکا ہے۔ اس گیٹ کا کوئی ایک تہائی حصہ روڈ اونچا ہونے کے سبب زمین میں دھنس گیا ہے۔ کھلنے اور بند ہونے کی دشواری دور کرنے کے لیے اس کے آس پاس کی زمین میں گڈھا بنا دیا گیا ہے۔

میری نظروں میں جلنے بجھنے والے بجلی کے قمقموں کی صورت جھما کے ہو رہے ہیں۔

کبھی یہ گیٹ اپنی پوری شان وشوکت اور تمکنت کے ساتھ نظروں کے سامنے ابھر آتا ہے۔ کبھی وقت کے تھپیڑوں کی زد سے چور، حرماں نصیبی کی تصویر بنا آنکھوں میں چبھتا ہے، اور دل میں اندر، دور تک ایک ٹیس اٹھتی ہے، آندھیاں چلتی ہیں، اور میں خود کو لاچار اور انتہائی بے بس محسوس کرتا ہوں۔

آج یہ عمارت......ظہیر ہاؤس اونچی اونچی بلڈنگس سے گھری، زندگی کی تیز رفتاری میں پیچھے رہ جانے اور اپنی شکستگی پر تھکی تھکی سی اور نوحہ کناں ہے۔

میرے بغل میں میرا بڑا سا سوٹ کیس لیے کھڑے میرے بھائی وحید نے مجھے خاموش اور ساکت دیکھ کر کہا:

''اندر چلیں۔''

جھک کر گیٹ سے گزرتے ہوئے ہم، اس شکستہ عمارت کے نیم تاریک آنگن میں پہنچے۔

تین قطعہ میں منقسم اپنے وقت کی پرشکوہ اور تمکنت آمیز عمارت کا یہ پہلا حصہ تھا۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، ہر سو یاسیت انگیز خاموشی چھائی تھی۔ میں نے وحید کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہاں انار کا ایک پیڑ ہوا کرتا تھا......''

''ہاں۔ گر گیا۔''

دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ہم عمارت کے دوسرے حصے کے صحن میں داخل ہوئے۔ مجھے

محسوس ہوا،اس کے در و دیوار اسرار میں ملفوف ہیں اور ہمیں دیکھ رہے ہیں۔

کبھی اس آنگن کے ایک سرے پر مہندی، بیلا اور چمیلی کے پودے ہوا کرتے تھے،لیکن اب یہ آنگن چٹیل میدان کی صورت سخت اور اجاڑ تھا۔

عمارت کے تیسرے حصے میں روح فرسا اداسی اور گہرا سناٹا طاری تھا۔کبھی اس قطعہ میں داخل ہوتے ہی، آنگن میں امرود کا وشال پیڑ دکھتا اور آنگن سے متصل لمبے چوڑے برآمدے میں بالکل سامنے، چوکی پر باباجان تشہد کی صورت بیٹھے، بیڑی پیتے نظر آتے!

مگر اب نہیں۔ یہ پہلے کی بات ہے۔

اب نہ امرود کا پیڑ رہا نہ باباجان۔

لیکن ویران برآمدے میں خالی چوکی پڑی ہے—

ایک لمحہ کو مجھے لگا، باباجان چوکی پر عالم تشہد میں بیٹھے ہیں۔ رات کی نیم تاریکی میں ان کی انگلیوں میں پھنسی جلتی ہوئی بیڑی کی لو، دکھ رہی ہے۔ وہ کھانس رہے ہیں اور آنگن میں ہواؤں سے جھومتے امرود کے پیڑ کی ٹہنیاں اور ان پر بیٹھے پرندے، اور چڑیوں کی چہچہاہٹ، روانیِ حیات کی گواہی دے رہی ہیں۔ معاًایک محبت آگیں اور خوش کن جذبوں میں شرابور باباجان کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی:

''آ گئے، تم۔''

''ہاں، میں آ گیا؟'' اضطراری طور پر میں نے کہا اور چاروں طرف دیکھا۔

باباجان نہیں تھے۔ ہواؤں کا شور تھا۔ لیکن ان کی آواز؟ ایک واہمہ، ایک الیوژن...

اچانک وحید نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کے لیے، اس کمرے کو درست کر دیا گیا ہے۔''

میں کمرے میں داخل ہوا۔ یہ باباجان کا کمرہ تھا۔ کمرہ صاف ستھرا، لیکن خالی خالی تھا۔ کمرے کا خالی پن میرے اندر سرایت کرنے لگا، میں ایک کونے میں پڑی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ وحید نے میرا سوٹ کیس ایک طرف رکھ دیا اور کہا:

''آپ فریش ہو لیں، میں کھانا گرم کراتا ہوں۔''

''کھانا نہیں۔ کھانا ٹرین میں ہو چکا ہے۔ سر درد محسوس کر رہا ہوں، اگر اس وقت چائے مل جائے تو... مگر رات کے ساڑھے بارہ کا وقت ہے... زحمت ہوگی۔''

''کوئی زحمت نہیں۔ ابھی لاتا ہوں۔''

سر کے بھاری پن، سے یاد آیا۔ گھر میں کسی کو کوئی تکلیف، کوئی عارضہ، موسمی بخار، سردی زکام، کچھ بھی ہو، بابا جان راحت کا سامان کرتے۔ ٹیبلیٹ، سیرپ، انجکشن کسی بھی میڈیسن میں شامل اجزا اور اس کی تاثیر... مثبت و منفی سے وہ خوب واقف تھے۔ تابی کی بیماری میں ڈاکٹر نے جو دوائیں تجویز کیں، نسخہ دیکھتے ہی بابا جان نے کہا......

''اف......! یہ تو ہارٹ کی دوا ہے......تو کیا ہفتہ بھر سے ڈرپ (Dript) کے اندھادھند استعمال نے ہارٹ کو کمزور کر دیا!''

وہ دواؤں کے تعلق سے ڈاکٹر سے بھی کہتے۔

''ڈاکٹر صاحب اس کے استعمال سے تو نیند کا غلبہ ہوگا۔''

وحید چائے کا ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کونے میں پڑے چھوٹے سے ٹیبل کو میرے قریب کھسکایا اور اس پر چائے کا ٹرے رکھتے ہوئے کہا——

''سر درد کے لیے کوئی ٹیبلیٹ لیں گے کیا؟''

''نہیں۔ چائے ہی کافی ہے۔ تم جاؤ، آرام کرو، صبح باتیں ہوں گی۔''

بابا جان کی زندگی میں، میں سال میں دو بار، دونوں عید کے موقعے پر پابندی سے گھر آتا تھا۔ لیکن اس دفعہ کئی عید، بقرعید گزرنے کے بعد وحید کے اصرار پر آنا ہوا ہے۔ معلوم نہیں کیوں، یہاں آ کر، گھر پہنچ کر بھی گھر جیسی طمانیت نہیں۔

میں اب بھی سفر میں ہوں؟ میرا سفر کہاں سے اور کب شروع ہوا؟ اس کا مجھے علم نہیں، اور نہ ہی میں بتا سکتا ہوں کہ اس کا انت کہاں ہوگا......!

سفر دراصل ایک پیچیدہ اور رہسیہ میں ڈوبی ہوئی کیفیت ہے، اور زندگی کا لازمی جزو بھی۔ بابا جان سیلانی طبیعت کے حامل تھے۔ حالت سفر ان کے لیے باعث فرحت وانبساط اور لذت آمیز ہوتا...... کبھی سیاحت کے نام پر، کبھی کاروباری ضرورتوں کے لیے اور کبھی یوں ہی کسی کی ہم نوائی میں سفر اختیار کرتے۔

ایک دفعہ لمبے سفر سے لوٹے، میں نے انھیں تھکا تھکا سا اور مضمحل پا کر کہا۔

''آپ اپنے جان کو ہلکان کیوں کرتے ہیں۔ آرام اور سکون سے گھر میں رہا کریں۔ آمد و رفت کی کلفت اور صعوبت کس لیے؟ اس زحمت کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''تم نہیں جانتے۔'' انھوں نے کہا ''زندگی بذات خود ایک مسلسل سفر ہے۔ لیکن اس سفر کی پیمائش کوئی شخص اپنی مدتِ حیات سے نہیں کر سکتا۔ نہ یہ سفر، اس کی زندگی کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے، نہ اس

کے خاتمہ پر ختم ہوتا ہے۔ حالانکہ اس طویل سفر میں ایسے مقامات ضرور آتے ہیں، جہاں اس کے سلسلے ٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن زندگی ہمیشہ رواں دواں رہتی ۔''

''اس منطق کو میں سمجھتا ہوں۔ لیکن آپ کو بے آرام دیکھتا ہوں، اس لیے کہہ رہا ہوں۔ اس تگ ودو سے حاصل بھی کیا ہے؟''

''حاصل کیوں نہیں۔ مقولہ ہے، سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ اس مکان 'ظہیر ہاؤس' کے چھ فولڈ میں کھلنے اور بند ہونے والے پرشکوہ صدر دروازے کو دیکھتے ہو۔ اس کی ڈیزائننگ کا خیال مجھے کئی شہروں کی شاہی اور درباری عمارتوں کے وشال گیٹ کو دیکھ کر آیا۔ اس دروازے کے لیے سیاہ شیشم کی لکڑی میں نے جھارکھنڈ کے جنگلوں سے حاصل کی تھی اور......اور اس آنگن میں جھومتا ہوا یہ امرود کا درخت۔ جانتے ہو، اس کا پھل لگا پودا میں الہ آباد سے لے کر آیا تھا۔ تب سبھی کہتے تھے، یہ پودا جڑ نہیں پکڑے گا، سوکھ جائے گا، مگر یہ آج تناور درخت ہے، اس کی ٹہنیوں پر طرح طرح کے پرندے اور چڑیوں کا بسیرا ہے۔ ان کی چہچہاہٹ سے ہمارا گھر گونجتا رہتا ہے۔ اس کی شاخوں پر گلہریاں پھدکتی رہتی ہیں۔ یہ خوش کن نظارہ، خیر و برکت کا بھی سبب ہے۔''

میں یہاں، بابا جان کے اس کمرے میں تنہا ہوں۔ مگر میری تنہائی میری رفیق کی طرح یادوں کے قافلے میں مجھے ہم رکاب کیے ہے۔ حیات افروز، ایام دیرینہ لوٹ آئے ہیں اور خوش کن ساعتیں متحرک ہیں۔ میں بابا جان کی مدھم مدھم، سلجھی ہوئی سرگوشیوں کو سن رہا ہوں۔ حصار زیست کا یہ خوش کن لمحہ... اور وقت موجود مجھے ماضی کے خانے تہہ خانے میں دور تک لیے جاتا ہے — اور اب حصار زیست کے آس پاس تنہائی نام کی کوئی شے نہیں۔ تو کیا، یہ تخلیق کائنات کا اولین لمحہ ہے؟ وقت کا بلاخیز اور پرشور دریا بہہ رہا ہے، اور وقت کے دھارے میں ہم، بے دست و پا بہے جاتے ہیں۔ یہاں سرشارئ حیات اور لذت کوشی بھی ہے اور حادثات کی بلاخیزی سے بھی واسطہ پڑتا ہے —

ہم نے ایک دن دیکھا، بابا جان عالم سراسیمگی میں، متوحش اور مضمحل ٹیکسی سے اتر کر لڑکھڑاتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ میں لپک کر ان کے قریب گیا اور سہارا دے کر انھیں، ان کے کمرے تک پہنچایا۔ ان کی لمبی لمبی بے ترتیب سانسوں کی آمد و رفت نے ہمیں مضطرب اور بے چین کیا ہوا تھا، لیکن یہ وقت استفسار کا نہ تھا۔ انھیں راحت اور سکون کی صورتیں بہم پہنچائی گئیں۔ نگہداشت کی کوششوں نے انھیں احساسِ عافیت اور سکون بخشا۔ اور وہ سو گئے۔

ہمارے استفسار پر روح فرسا اور المناک واقعے کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

''ٹرین میں اپنے برتھ پر میں سو رہا تھا۔ اچانک شور و ہنگامے سے میری آنکھ کھل گئی۔ بغل کے ونگ میں کچھ شر پسند ایک لڑکی کے ساتھ دست درازی کر رہے تھے۔ لڑکی کے ساتھ کے شخص کو دو افراد نے دبوچ رکھا تھا اور زد و کوب کر رہے تھے۔ آس پاس کے مسافر ہتھیار بند غنڈوں کی ایکٹی ویٹی سے دہشت زدہ، گنگ تماشائی بنے تھے۔ مجھ سے ضبط نہ ہوا۔ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا تماشہ ہے۔ چلو ہٹو۔'' میں نے لڑکی اور غنڈوں کے درمیان آنے کی کوشش کی۔

''او بڈھے...... تمھاری جان بھاری ہے کیا، کہتے ہوئے ایک نے مجھے دھکا دیا اور پستول میری طرف تان دی۔ میں گر گیا، میرا سر برتھ سے ٹکرایا اور پیشانی پر زخم آیا......'

اور پھر انھوں نے، چین کھینچی، وکیم کیا، جانے کیا ہوا، ٹرین رک گئی اور وہ زبردستی لڑکی کو لیے ہوئے ٹرین سے اتر گئے...... اس کے ساتھ کا آدمی گڑ گڑاتا رہا، مدد کے لیے چیختا رہا......''

اس کے بعد بابا جان خاموش ہو گئے۔

بابا جان کی خاموشی محض اس وقت، اس ساعت تک محدود نہ رہی، بلکہ یہ خاموشی طویل ہو گئی۔ وہ گوشہ نشیں ہو گئے۔ کہیں آنا جانا موقوف، سفر نہ صرف ترک ہو گیا، بلکہ سفر کے نام سے بھی وحشت زدہ ہو جاتے، لرز جاتے، وہ چاہتے تھے ہم بھی شہر سے باہر کہیں نہ جائیں۔ وہ اپنے کمرے میں رہتے اور برآمدے میں چوکی پر تشہد کی صورت بیٹھے بیڑی پیتے رہتے۔

انہی دنوں امرود کے پیڑ میں کیڑے لگ گئے۔ اس کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگیں۔ بابا جان کئی عارضے میں مبتلا ہو گئے۔ میڈیسین کی اچھی واقفیت تھی لہٰذا ان سے ان کی کوئی بیماری بھی چھپی نہ تھی۔ بیماریوں سے سراسیمہ، متوحش اور منفی خیالوں سے وہ پریشان رہنے لگے۔

دوسروں کی بیماری اور تکلیف میں خبر گیری کرنے والے، دل جوئی اور حوصلہ بڑھانے والے اپنی بیماری سے پریشان اور خائف تھے۔ سفر کو لذتِ حیات کے طور پر اختیار کیے رہنے والے، سفر کے نام سے گھبراتے اور متوحش ہو جاتے۔ بابا جان کی یہ قلب ماہیت حیران کن اور تشویشناک تھی۔

ایک دن ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے ایڈمٹ ہونے کے لیے کہا۔ وہ نہ مانے، اور گھر آ گئے۔ مگر حیران کن طور پر آسودہ خاطر نظر آ رہے تھے۔ رات گئے، مجھے بلایا۔ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

پھر دھیرے سے کندھے کو تھپتھپایا، اور پورے تحمل اور طمانیت کے ساتھ گویا ہوئے:

''خوش رہو۔ یہ وقت رخصت ہے، میں سفر پر جا رہا ہوں، آخری سفر...... لیکن سلسلہ روز و شب......

حیات ومَمات دراز ہے...''

وہ خاموش ہوگئے۔اسی وقت آنگن میں امرود کا پیڑ زوردار، دھڑام کی آواز کے ساتھ زمین پر گر گیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بابا جان کی حیات کی لو بجھ گئی۔

اچانک کسی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز گونجی۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

میں سوچنے لگا۔ جاگتی آنکھوں کے سامنے سے ایک پوری رات گزر گئی، ایک دن تمام ہوا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ بڑا عجیب احساس!

صبح کی چائے کے بعد، میں وحید کے ساتھ قبرستان گیا۔قبر کے پاس پہنچ کر قدرے اطمینان ہوا کہ باباجان کی قبر پر تازہ مٹی پڑی تھی، اسے دھنسنے اور بے نشان ہونے سے محفوظ رکھا گیا تھا۔

قبرستان سے لوٹ کر ظہیر ہاؤس کے تیسرے قطعہ کے آنگن میں جیسے ہی داخل ہوا، ایک لمحہ کو لگا، سامنے برآمدے میں بابا جان تشہد کی حالت میں بیٹھے بیڑی پی رہے ہیں۔ اسی لمحہ میرے کانوں نے چڑیوں کی چہچہاہٹ بھی سنی......مگر ذرا قریب جانے پر میں نے دیکھا۔ وحید کا چھوٹا بیٹا، میرا بھتیجا عاقب، سامنے چوکی پر تشہد کی صورت میں بیٹھا ہے، شاید کہیں سے استعمال شدہ سگریٹ کا ٹکڑا اٹھالایا تھا، جسے اس نے اپنی انگلیوں کے سہارے ہونٹوں میں دبا رکھا تھا......!

میں سوچ رہا ہوں انسان اپنی اولاد کو وراثت میں جو چیز دیتا ہے، وہ دولت نہیں، اس کے خوابوں کا تاج محل ہوتا ہے، جو زندگی میں تگ ودو کا متقاضی ہوتا ہے۔ وقت کے اتھاہ سمندر میں زندگی کی مختلف لہریں ایک کو دوسرے سرے سے ملاتی ہیں، دراصل یہ لہریں متوازی خطوط ہوتے ہیں، جو ایک ہی سمت میں چلتے ہیں، لیکن کچھ دور جا کر ان میں سے کچھ لہریں غائب ہو جاتی ہیں اور کچھ اپنا سفر جاری رکھتی ہیں۔ وقت اپنی کڑیوں کو اسی طرح جوڑے رکھتا ہے تاکہ اس کا تسلسل کہیں ٹوٹ نہ جائے......!

◀◀ ● ▶▶

House No: 370 A, 4th Floor
Gali No 6 A, Zakir Nagar,
Jamia NagarNew Delhi - 110025
Mob: 9801527481,
Email.:ishratzaheer2@gmail.com

● تجزیہ

● رشیدہ منصوری

عشرت ظہیر کا افسانہ ''بابا جان'': ایک تجزیاتی جائزہ

عشرت ظہیر کا افسانہ ''بابا جان'' اردو ادب میں جدید افسانہ نگاری کا ایک شاندار نمونہ ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف روایتی کہانی کے بیانیے سے انحراف کرتا ہے بلکہ جدید افسانے کے بنیادی عناصر اور تکنیکوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قاری کے سامنے ایک گہری نفسیاتی اور وجودی کیفیت پیش کرتا ہے۔ اس افسانے میں روایت اور جدیدیت کا ایک خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے، جو اسے ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ یہ تحریر افسانے کی عصری اہمیت، اس کے تکنیکی اور موضوعاتی پہلوؤں اور اس کی علامتی گہرائی کا جائزہ پیش کرتی ہے۔

جدید افسانہ روایتی کہانی سے اس لیے مختلف ہے کیونکہ یہ واقعات کی منطقی ترتیب کے بجائے انسانی نفسیات، داخلی حقیقت، اور وجودی مسائل پر زور دیتا ہے۔ ''بابا جان'' میں عشرت ظہیر نے اسی جدید تکنیک کو اپنایا ہے۔ افسانہ روایتی ترتیب سے ہٹ کر پیش کیا گیا ہے، جہاں کہانی کا آغاز کسی اختتامی واقعے سے ہوسکتا ہے۔

یہ تکنیک قاری کو کہانی کے انجام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے، اور اسی ابہام اور رمزیت کے ذریعے افسانہ اپنی فکری اور جمالیاتی قدر کو اجاگر کرتا ہے۔

''بابا جان'' میں کرداروں کی شناخت محدود ہے، جو جدید افسانے کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ افسانے کے چار اہم کردار......وحید، افسانہ نگار، حویلی، اور ایک بچہ......کہانی کو علامتی سطح پر آگے بڑھاتے ہیں۔ حویلی اور چھ فولڈر والا دروازہ صرف عمارات یا اشیا نہیں، بلکہ ماضی، یادوں، اور ناستالجیا (Nostalgia) کی علامتیں ہیں۔ یہ علامتیں افسانے کو گہرائی عطا کرتی ہیں اور قاری کو ماضی و حال کے امتزاج سے جوڑتی ہیں۔

افسانے کی ابتدا ایک بڑے دروازے کے ذکر سے ہوتی ہے، جس کے چھ فولڈر لکڑی سے بنے ہیں۔ یہ دروازہ بابا جان کی شخصیت اور ان کے سفر سے جڑا ہے، جو ان کی زندگی کے تجربات اور کامیابیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ حویلی، جو بلند و بالا عمارتوں کے درمیان گھری ہوئی ہے، وقت کے ساتھ زوال پذیر ہوتی

دکھائی دیتی ہے۔ یہ زوال نہ صرف عمارت کا ہے بلکہ اس سے جڑی یادوں اور روایات کا بھی ہے۔

افسانہ نگار ماضی کی یادوں سے جڑی اذیت کو بیان کرتا ہے۔ حویلی کے آنگن میں انار کا پیڑ، مہندی اور چمپا کے پودے، اور امرود کا درخت اب غائب ہیں، جو وقت کے گزرنے اور تبدیلی کی علامت ہیں۔ بابا جان کی چوکی، جو خالی پڑی ہے، لیکن ایک لمحے کے لیے افسانہ نگار کو ان کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے، ایک گہری ناستالجک کیفیت پیدا کرتی ہے۔ یہ منظر افسانے کی علامتی گہرائی کو اجاگر کرتا ہے، جہاں ماضی اور حال ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں۔

افسانہ صرف انفرادی ناستالجیا تک محدود نہیں، بلکہ یہ سماجی بحرانوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ ٹرین کے واقعے میں، جہاں ایک لڑکی کے ساتھ بدسلوکی ہو رہی ہے اور کوئی مداخلت نہیں کرتا، بابا جان کی بہادری اور حساسیت نمایاں ہوتی ہے۔ وہ بدمعاشوں سے الجھ پڑتے ہیں اور زخمی ہو جاتے ہیں۔ یہ زخم صرف جسمانی نہیں، بلکہ روحانی بھی ہیں، جو سماج میں بڑھتے ہوئے غیر انسانی رویوں اور کمزوروں کے استحصال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ واقعہ بابا جان کے آخری سفر کی وجہ بنتا ہے، جو سماجی ناانصافیوں کے خلاف ان کی جدوجہد کی علامت ہے۔

افسانے کا اختتام انتہائی جاندار اور علامتی ہے۔ جب افسانہ نگار قبرستان سے واپس ظہیر ہاؤس پہنچتا ہے، تو وہ ایک لمحے کے لیے بابا جان کو چوکی پر تشہد کی حالت میں بیڑی پیتے دیکھتا ہے۔ لیکن قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ وحید کا بیٹا عاقب ہے، جو ایک استعمال شدہ سگریٹ کا ٹکڑا ہونٹوں پر دبائے بیٹھا ہے۔ یہ منظر افسانے کا سب سے خوبصورت کلائمیکس ہے، جو نسل در نسل منتقل ہونے والی عادات اور یادوں کی عکاسی کرتا ہے۔

لیکن اس کے بعد کی چند سطریں جدید افسانے کی تکنیک کے بجائے روایتی کہانی کا عنصر پیش کرتی ہیں جو افسانے میں ایک طرح کا اضافی اور غیر ضروری مواد ہے۔

''بابا جان'' جدید افسانہ نگاری اور روایتی کہانی کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ عشرت ظہیر نے اس افسانے میں علامتوں، رمزیت، اور غیر حتمی ترتیب کے ذریعے ایک ایسی کہانی پیش کی ہے جو قاری کو فکری اور جذباتی سطح پر جھنجھوڑتی ہے۔ حویلی، دروازہ، اور چوکی جیسی علامتیں ماضی کی یادوں اور وقت کے زوال کو بیان کرتی ہیں، جبکہ ٹرین کا واقعہ سماجی مسائل کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ افسانے کا اختتام، خاص طور پر عاقب کا بابا جان کی طرح تشہد کی حالت میں بیٹھنے کا منظر، نئی نسل کے ساتھ ماضی کے رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ افسانہ اپنی مختصر کردار سازی اور علامتی گہرائی کے ساتھ اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ عشرت ظہیر کی تکنیک اور ان کی روایت و جدیدیت کے امتزاج نے ''بابا جان'' کو ایک جاندار تخلیق بنا دیا ہے۔

◄◄ ● ►►

● افسانہ مع تجزیہ

● قاسم خورشید

اندر آگ ہے

کوئلری کے مزدوروں میں بے چینی تھی کہ سب کو خبردار کر دیا گیا تھا کہ آگ اندر ہی اندر پھیل رہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہیں سے کوئی دھماکہ بھی ہو۔ زمین کے اندر کام کرنے والے مزدور تیزی سے اوپر سے اوپر آ رہے تھے۔ ان کی بستیوں میں شور تھا۔ ٹھیکے داروں کے کہنے پر بھی ایک جگہ جمع ہوئے اور پھر حکمتِ عملی پر غور کیا جانے لگا۔ کالا سونا اندر ہی اندر دہک رہا ہے، اس تصوّر نے سب کے مستقبل پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔

انجینیر اپنے کاموں میں لگے تھے جہاں کہیں شک ہوتا تو زمین بے آبرو کی جاتی لیکن بہت اندر جانے پر بھی آگ کا نہ ملنا تشویش کا باعث ہوا۔ سائنس کی ایسی ناکامی کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آگ تو سچ مچ اندر ہے، جانچ کے ہر عمل سے آگ کے ہونے کا خاص امکان ملتا۔

جب تمام تر کوشش اور پورے یقین کے باوجود زمین کی تہہ میں جانے پر بھی آگ نہ ملی تو سبھی مزدوروں نے رائے دی کہ ہمیں پہلے کی طرح کام کرنے دیا جائے۔ ہم خود ہی اپنی حفاظت کرلیں گے۔ لیکن انھیں اجازت نہیں دی گئی۔ کئی دنوں کی کڑی محنت اور اعلا سطح تکنیکی جانچ کے باوجود دہکتے ہوئے انگاروں کا سراغ نہیں مل پایا اور تمام ماہرین نہ صرف یہ کہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے بلکہ ان کے اعتماد کو بھی سخت ٹھیس پہنچی تھی۔

اور پھر ایک رات کی گہری خاموشی سے اُبھری ایک عورت سُکھیا۔ سُکھیا بہت دنوں سے چُپ ہے۔ اسے مَینا پالنے کا بہت شوق ہے۔ مَینا کے بولنے پر اس کا جی بہل جایا کرتا تھا لیکن ان دنوں نہ جانے کیوں مَینا بھی چُپ چُپ ہے۔ جب اندر آگ پھیلی اور یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا کہ مزدوروں کی بستیاں بھی کسی وقت زمین دوز ہو سکتی ہیں تو سبھی مزدور، سائنس دانوں کے طے کردہ محفوظ مقامات پر جمع ہو کر کیرتن گانے لگے لیکن سُکھیا ان میں شامل نہیں ہو پائی بلکہ اس نے اپنا گھر بھی چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ کبھی کبھی گہری خاموشی سے اُوب کر مَینا کچھ بولنے لگتی تو سُکھیا مسکرا دیتی چوں کہ سُکھیا کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے۔ شاید اسی لیے اس کے کسی بھی عمل پر اب کسی کا کوئی خاص ردّ عمل نہیں ہوتا تھا۔ وہ باضابطہ طور پر کام پر بھی نہیں جایا کرتی تھی۔ ٹھیکے داروں کی ڈانٹ کا بھی اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔

سُکھیا چُپ کیوں ہوگئی ہے؟
اتنے بڑے حادثے کے امکان پر بھی سُکھیا کا کوئی ردّعمل نہیں؟
جب وہ عام مزدوروں کے ساتھ اندر کام کیا کرتی تھی تب بھی اسے کوئلے کے اندر کچھ تلاش کرتے ہوئے پایا گیا تھا۔سونا نہیں،کوئی قیمتی پتھر نہیں۔بلکہ اس کا کہیں کچھ کھو گیا تھا،شاید وہیں کہیں دفن تھا جسے وہ اکثر کریدا کرتی بلکہ وہ کسی دبی ہوئی ایسی شے کی تلاش میں تھی جس کے حاصل ہونے پر اس کی تمام تر خوشیاں لوٹ سکیں گی۔

سُکھیا کوئی غیر معمولی عورت نہیں تھی لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ہر رات نشے میں چُور اپنے مزدور پتی رام دین کی اذیتوں کا شکار ہونے کے باوجود ہر صبح ایک نئی امید کے ساتھ اس کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کو تیار ہوجایا کرتی تھی۔رام دین کو یہ اعتراف تھا کہ وہ سُکھیا پر بہت ظلم کرتا ہے۔دوسرے مزدور اُس کی ایسی حرکتوں کی کافی ملامت بھی کیا کرتے تھے لیکن پھر شام ڈھلے اس پر ایسی وحشت طاری ہوتی کہ کبھی کبھی وہ اپنی جھونپڑی کا تمام چھوٹا بڑا سامان غصّے میں باہر پھینک دیتا۔سُکھیا اذیت برداشت کرنے کے باوجود اسے بہت بُرا بھلا کہتی ہی جاتی۔

رام دین بے حد محنتی مزدور تھا۔ جب وہ نشے میں ہوا کرتا تبھی اپنی متضاد شخصیت کے ساتھ سامنے آتا لیکن نارمل حالات میں وہ تمام مزدوروں کے لیے سب سے زیادہ ہمدرد دوست ثابت ہوا کرتا۔ جب کبھی کوئی مزدور ٹھیکے داروں کے ظلم کا شکار ہوتا تو رام دین سب سے پہلے ان کے مقابلے پر آتا بلکہ ایک بار ایک بیمار مزدور سائمن باسکی کی جوان بیوی کو ایک ٹھیکے دار کے چنگل سے اس نے چھڑایا اور پھر تمام مزدوروں کے تعاون سے کافی کوششوں کے بعد ٹھیکے دار کو جیل بھی بھجوادیا تھا لیکن جب جلد ہی ٹھیکے دار کو رہا کردیا گیا تو رام دین مایوس رہنے لگا تھا۔ نشے کی حالت میں وہ کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آتا۔ان ہی دنوں کولیری میں کام کا بوجھ کچھ زیادہ ہوگیا۔مزدوروں کی تعداد بڑھی نہیں بلکہ رات میں اُوور ٹائم شروع ہوا۔ برسات کی وجہ سے کوئلہ نکالنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بہت ساری سرنگوں کے دھنسنے کا خدشہ پیدا ہوگیا تھا۔ پانی کے مسلسل بہاؤ کی وجہ سے ایک سرنگ کے دھنسنے پر کافی مالی نقصان بھی ہوا لیکن سرنگ میں کام کرنے والے مزدوروں کو بچا لیا گیا تھا لیکن وہیں آس پاس کام کرنے والے رام دین کا اچانک غائب ہوجانا حیران کن تھا۔ بہت چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ سرنگ کے دھنسنے پر صرف رام دین کو نہیں بچایا جاسکا تھا۔وہ وہیں دب کر مر گیا۔سُکھیا کے لیے یہ ایک غیر معمولی حادثہ تھا۔وہ رو دھو کر چُپ تو ہو گئی لیکن اس کے اندر کہیں کوئی پھانس باقی تھی۔ایک ہی سوال اس کے ذہن میں اُبھرتا کہ ایسا کیسے ہوا کہ سبھی اس حادثے میں زندہ بچ گئے اور میرے پتی کی جان چلی گئی؟ پھر وہ کئی سطحوں پر خود کو کریدنا چاہتی لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہی تھی۔اس کا گھر ایک دم خاموش ہوگیا تھا سکھیا کے ساتھ مَینا کا بھی چُپ ہوجانا

کسی غیر معمولی حادثے سے کم نہ تھا۔

اسے رام دین کی موت کے سلسلے میں جو تشویش تھی، وہ غلط بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ کس سے کہے؟ کون اس کے اندیشوں کی تائید کرے گا؟ کسی بھی وقت کسی بھی مزدور کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جانا بہت معمولی سی بات تھی۔

لیکن سُکھیا کے لیے یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اس رات سچ مچ بہت تیز بارش تھی۔ زمین کے اندر مزدور اپنے کاموں میں لگے تھے لیکن سُکھیا کو معلوم تھا کہ رام دین ان میں شامل نہیں تھا۔ اس کا کام کسی بھی طرح پانی کے بہاؤ کو روکنا تھا۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا۔ سرنگ کے اندر اس نے پانی کو جانے سے سچ مچ روک دیا اور ٹھیکے دار اس پر بہت خوش ہوا۔ تب اس نے رام دین کو اپنی چھتری میں بلایا۔ وہ اُس کے پاس گیا اور سُکھیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک چٹان کی اوٹ میں رام دین نے ٹھیکے دار کی دی ہوئی شراب پی۔ تبھی بارش اور تیز ہوگئی اور سرنگ کے دھنسنے پر یہ سارا معاملہ وہیں دفن ہو گیا۔

بارش کے تھمنے کے کچھ روز بعد ہی پتہ نہیں کیسے اندر ہی اندر آگ پھیلنے لگی جب کہ اتنی تیز بارش کے بعد ایسا ہونا شاید عام لوگوں کے لیے غیر متوقع تھا لیکن آگ تو اندر ہی بہت تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ لیکن دہکتے ہوئے انگاروں کا کہیں نام و نشان نہیں مل پا رہا تھا۔ یہ واقعی عجیب معاملہ تھا۔ جب کہ زمین بھی جگہ جگہ دھنس رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے مکان منہدم ہو رہے تھے پھر بھی جس آگ کا امکان تھا، اسے اب تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

آج جب سُکھیا کی کٹیا بھی دھنسنے لگی تو وہ مَینا کا پنجرا لے کر رات کے اندھیرے میں کھو گئی۔ ٹھیکے دار نے اس کا پیچھا کیا۔ لیکن بہت کوشش کے باوجود وہ سُکھیا کو رات کی تاریکی میں تلاش نہیں کر سکا۔ سُکھیا چلتے چلتے تھک گئی تو ایک جگہ بیٹھ گئی۔ پنجرا پاس میں ہی رکھ دیا اور نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔

صبح ہونے لگی تو وہ اچانک چونک اُٹھی۔ سب کچھ خاموش ضرور تھا لیکن لگتا تھا منظر کسی بھی آہٹ پر بول پڑے گا۔ سُکھیا نے پنجرا دیکھا۔ مَینا کو کسی طرح پنجرے سے باہر نکالا اور دھیرے سے اسے زمین پر رکھا لیکن جیسے ہی مَینا نے زمین کو چھوا، اس نے وہیں دَم توڑ دیا۔ سُکھیا بلک بلک کر رونے لگی۔ مَینا کا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانا، اس کا دَم توڑ دینا ایک ایسا حادثہ تھا جس نے ہر خاموشی کو اچانک بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سُکھیا زور زور سے چیخنے لگی۔ وہ مزدوروں کو پکارنے لگی۔

''دوڑو...... جلدی آؤ...... دیکھو یہاں آگ ہے...... بہت آگ ہے یہاں، جلدی آؤ......''

اور سچ مچ اس جگہ سے جیسے ہی رام دین کی بوسیدہ لاش برآمد ہوئی، چاروں طرف دہکتے انگاروں کا پتہ مل گیا۔ یہی انگارے تیزی سے مزدوروں کے وجود میں منتقل ہونے لگے۔

◄◄ ● ►►

● تجزیہ

● محمد مرجان علی

قاسم خورشید کا افسانہ ’اندر آگ ہے‘: ایک تجزیہ

اردو میں ایسے افسانے کم ملتے ہیں جو صرف واقعات کا بیان نہیں ہوتے بلکہ انسانی زندگی کے گہرے المیے اور سماج کی سچائیوں کو پیش کرتے ہیں۔ قاسم خورشید کا افسانہ ’اندآگ ہے‘ میں اسی نوعیت کا ایک گہرا تجربہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی ظاہری طور پر تو ایک کونکری (Coal Mines) اور اس میں کام کرنے والے مزدوروں کے اِرد گرد گھومتی ہے مگر اصل میں یہ انسان کے اندر میں سلگتی ہوئی آگ کی کہانی ہے۔ اِس کہانی میں ہمیں ایک ایسی آگ سے رؤ بہ رؤ کرایا گیا ہے جسے ہم محنت، محرومی، ناانصافی اور دبی ہوئی چیخوں کے طور پر بھی پہچانتے ہیں اور یہی آگ وقت آنے پر شدت بھی اختیار کر لیتی ہے۔

کہانی کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ کونکری کے اندر آگ پھیل گئی ہے۔ مزدور خوف زدہ ہیں، انجینئر اور سائنس دان اسے تلاش کرنے میں مصروف ہیں مگر آگ کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ سائنس کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ یہاں پر سائنس اور ماہرین کی ناکامی کے ذکر سے اصل میں اُس نظام کی ناکامی کی طرف افسانہ نگار نے اشارہ کیا ہے جو انسان کی محنت سے فائدہ تو اٹھاتا ہے مگر اس کے دکھ درد اور زندگی کے الجھے ہوئے مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اسی ماحول میں کہانی کی مرکزی کردار ’سُکھیا‘ سامنے آتی ہے۔ سُکھیا کوئی غیر معمولی عورت نہیں تھی۔ اس کے اندر برداشت اور حوصلے کا پہاڑ تھا جو عام عورتوں میں کم ہی پایا جاتا ہے۔ وہ روزانہ اپنے شوہر رام دین کے ظلم اور اذیتوں کا سامنا کرتی ہے مگر اس کے باوجود ہر صبح ایک نئی اُمید اور نئے حوصلے کے ساتھ زندگی کا آغاز کرتی تھی۔ اس کی زندگی دکھوں سے بھری ہوئی تھی لیکن اس نے کبھی ہار نہیں مانی۔ رام دین ایک مزدور تھا جو نشے کا عادی بن چکا تھا۔ نشے کی حالت میں وہ سُکھیا پر ظلم کرتا، اس کے ساتھ مار پیٹ کرتا اور طرح طرح کے طعنے دیتا۔ سُکھیا سب کچھ چپ چاپ سہہ لیتی ہے کیوں کہ اس کے دل میں اپنے شوہر کے لیے نفرت نہیں تھی بل کہ خوب ہمدردی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رام دین کا غصہ اور ظلم دراصل اس کی اپنی زندگی کی ناکامیوں اور مایوسیوں کا نتیجہ ہے مگر اب اُس کا شوہر رام دین کوئلے کی

کان میں حادثے کا شکار ہوکر مر چکا ہے۔اس کے بعد سے سُکھیا خاموش رہتی ہے اور اندر سے ٹوٹ چکی ہوتی ہے۔اس کے پاس صرف ایک مَینا باقی ہے جو اس کی تنہائی اور امید کا اکیلا کا سہارا ہے۔

رام دین کی زندگی بھی مزدور طبقے کے المیے کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ محنتی اور دوسروں کا ہم درد انسان تھا لیکن غربت اور ٹھیکے داروں کے ظلم نے اسے شراب کا عادی بنا دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی پر ظلم تو کرتا تھا مگر خود بھی اس سماجی جبر کا شکار تھا جس نے اسے انسان سے محض ایک مزدور بنا دیا ہے۔رام دین ایک محنتی، ایمان دار اور دوسروں کی مدد کرنے والا مزدور تھا۔ وہ ٹھیکے داروں کے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا تھا۔ایک دن شدید بارش کے دوران کان کے اندر کام ہو رہا تھا۔ پانی تیزی سے بہہ رہا تھا، رام دین نے بہاؤ روکنے کے لیے بہت محنت کی۔ ٹھیکے دار نے اسے بطورِ انعام شراب دی اور اپنی چھتری میں بلایا۔اسی دوران سرنگ دھنس گئی اور رام دین دب کر مر گیا۔سُکھیا نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ رام دین کو ٹھیکے دار کے لالچ نے مار دیا اور یہ نظام کیسے اپنے ایک محنت کش کو نگل جاتا ہے لیکن اس کی بات پر کسی نے یقین نہیں کیا۔اس کے بعد سکھیا اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی اور وہ اندر ہی اندر ٹوٹ سی گئی تھی۔ رام دین کی موت کے بعد سُکھیا کا چپ ہونا ایک خاموش احتجاج بھی ظاہر ہوتا ہے۔

رام دین کی موت کے بعد کان میں ایک اور عجیب واقعہ ہوتا ہے۔اتنی زیادہ بارش کے باوجود اندر ہی اندر آگ پھیلنے لگتی ہے لیکن کسی کو آگ نظر نہیں آتی۔مزدور حیران ہیں اور سائنس داں پریشان۔انھی دنوں سُکھیا اپنی مَینا کے ساتھ خاموش رہنے لگی ہے۔ جب آگ مزید پھیلنے لگتی ہے اور زمین دھنسنے لگتی ہے تو سُکھیا رات کے اندھیرے میں اپنی مَینا کا پنجرہ لے کر گھر سے نکل جاتی ہے۔ وہ تھک کر بیٹھ جاتی ہے، مَینا کو زمین پر چھوڑتی ہے اور جیسے ہی مَینا زمین کو چھوتی ہے، وہ مر جاتی ہے۔اسی لمحے زمین پھٹنے لگتی ہے، آگ کے انگارے پھوٹ پڑتے ہیں اور مزدور دوڑے آتے ہیں۔ وہاں سے رام دین کی لاش برآمد ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ اندر چھپی آگ بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

افسانہ' اَندر آگ ہے' کے آخری حصّے میں کہانی اپنے سب سے گہرے اور خاموش مطلب تک قاری کو پہنچایا جاتا ہے۔شروع میں جس آگ کے کان کے اندر پھیلنے کی بات کہی گئی تھی، وہ اصل میں ظاہری آگ نہیں تھی بل کہ انسان کے دل میں سلگتی ہوئی آگ تھی۔ یہ ایک ایسی آگ کی کہانی پیش کی گئی ہے جو ناانصافی، محرومی، غربت اور عدم اطمینان سے سلگتی ہے۔قاسم خورشید نے بہت خوب صورتی سے یہ بتایا ہے کہ اصل آگ کوئلے کی کان میں نہیں لگی بل کہ وہ ان مزدوروں کے دلوں میں دہک رہی ہے جو دن رات محنت کرتے ہیں مگر پھر بھی سکون، انصاف اور عزت سے محروم رہتے ہیں۔

سُکھیا کی چیخ اسی اندر کی آگ کا بیانیہ ہے۔ جب اس کی مَینا مرتی ہے، تو وہ ایک علامت ہے۔ مَینا سُکھیا کی امید اور زندگی کی خوشی کا نشان تھی اور اس کے مرنے کا مطلب ہے کہ اب سُکھیا کے اندر کی ساری امید بجھ گئی لیکن جیسے ہی مَینا زمین کو چھوتی ہے اور مر جاتی ہے، تب ہی زمین کے نیچے سے رام دین کی لاش اور دہکتے انگارے برآمد ہوتے ہیں۔ اس منظر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سُکھیا کے دکھ اور رام دین کی موت ایک ہی آگ سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہی آگ جو انسان کے اندر جلتی ہے اور ایک دن ظاہر ہو جاتی ہے۔

رام دین کی موت مزدور طبقے کی قربانی کی علامت ہے۔ وہ ایک محنتی اور ایمان دار مزدور تھا جسے سماجی نظام نے پیس کر رکھ دیا۔ سُکھیا کا چپ رہنا، مَینا کا مر جانا اور آخر میں اس کا چیخنا۔ یہ سب دکھاتا ہے کہ انسان کب تک اپنے دکھ دبائے رکھ سکتا ہے؟ جب درد حد سے بڑھ جائے تو خاموشی بھی چیخ بن جاتی ہے۔

اس افسانے میں سُکھیا کا کردار عورت کے صبر اور برداشت کی علامت ہے۔ وہ ظلم سہتی ہے مگر پھر بھی ٹوٹتی نہیں۔ وہ بولتی نہیں مگر اس کی خاموشی میں احتجاج ہے۔ جب وہ آخر میں چیختی ہے تو گویا پوری انسانیت کے دکھ کو آواز دیتی ہے۔

'اندر آگ ہے' ایک علامتی (Symbolic) کہانی ہے جس میں افسانہ نگار نے ہماری روزمرہ کی زندگی کے اس نظام کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو عام مزدور کے استحصال پر قائم ہے۔ کہانی میں مختلف علامتوں کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا سماجی و معاشی ڈھانچہ کس حد تک ناکام اور غیر انسانی ہو چکا ہے۔ کہانی میں ایک مزدور کی موت واقع ہوتی ہے مگر اس کی موت کا سبب واضح طور پر نہیں بتایا جاتا۔ یہ خود اس نظام کی علامت ہے جہاں مزدور کی جان کی کوئی قیمت نہیں اور اس کے مرنے پر بھی سچ چھپایا جاتا ہے۔ ٹھیکے دار زبردستی کام کراتا ہے۔ اوور ٹائم کا رواج عام ہے اور مزدور سے اس کی طاقت سے زیادہ مشقت لی جاتی ہے۔ آٹھ یا دس گھنٹے کے بجائے وہ دن رات کام کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ اس ظلم کے بدلے میں اسے نشے کا عادی بنا دیا جاتا ہے تا کہ وہ احتجاج نہ کر سکے اور بس مشین کی طرح کام کرتا رہے۔ یہ نشہ اس کے اندر کے انسان کو مار دیتا ہے۔ وہ انسان سے مزدور بن جاتا ہے، ایک ایسا جسم بن جاتا ہے جو صرف کام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گھر واپس آ کر وہ اپنی فرسٹریشن اپنے بیوی بچوں پر نکالتا ہے۔ کہانی میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ وہ شخص باہر کے لیے ہم درد ہے مگر گھر میں آتے ہی غصے اور تلخ زبانی کی مورت بن جاتا ہے۔ یہی سماجی جبر ہے جو انسان کو اندر سے جلا دیتا ہے۔ ٹھیکے دار کے ہاتھوں شراب پلا کر مزدور کو دوبارہ کام میں جھونک دیا جاتا ہے جس کا انجام اس کی موت کی صورت میں سامنے آتا ہے سکھیا (بیوی) اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ اس کے شوہر کی موت میں کچھ راز ہے مگر سماج کا نظام اتنا سخت ہے کہ کوئی سچ بولنے کی

ہمت نہیں کرتا۔افسانہ نگار نے 'سکھیا' اور 'مینا' کی علامتوں کے ذریعے دکھایا ہے کہ انسان کے اندر جب صبر مر جاتا ہے تو اس کی خاموشی آواز بن کر ابھرتی ہے۔ جو شعلہ اُس کے اندر جل رہا تھا، اب وہ عروج پر پہنچتا ہے۔اُس کا صبر مینا کی شکل میں مر جاتا ہے، تب وہ چیخنے چلانے لگتی ہے۔افسانہ نگار یوں لکھتا ہے:

''مَینا کا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانا، اس کا دَم توڑ دینا ایک ایسا حادثہ تھا جس نے ہر خاموشی کو بولنے پر مجبور کر دیا تھا سکھیا زور زور سے چیخنے لگی۔ وہ مزدوروں کو پکارنے لگی۔''دوڑو......جلدی آؤ...... دیکھو یہاں آگ ہے......بہت آگ ہے۔یہاں جلدی آؤ......''

یہاں سے کہانی اپنے عروج پر پہنچتی ہے اور واقعی، جب رام دین کی بوسیدہ لاش برآمد ہوتی ہے تو چاروں طرف دہکتے انگاروں کا پتہ چلتا ہے۔

افسانہ یہ پیغام دیتا ہے کہ سماج میں سب سے بڑی آگ وہ نہیں جو زمین کو جلا دے بلکہ وہ آگ ہے جو ظلم، ناانصافی، غربت اور بے بسی کی ہے جو انسان کے اندر سلگتی ہے۔قاسم خورشید نے اس افسانے کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب انسان کے اندر کے زخم حد سے بڑھ جائیں، تو وہ سماج کو بھی جلا دیتے ہیں۔یہ کہانی سادہ لفظوں میں مزدوروں کی زندگی کے دکھ، عورت کی بے بسی، اور نظام کی بے حسی کا آئینہ ہے۔

◄◄ ● ►►

Research Scholar,
Dept. of Urdu, Jai prakash University, Chapra (Bihar)
Contact: mdmarjanali07@gmail.com, 9931646092

ثالث کی ڈاک

نام رسالہ : استفسار (جے پور) بیادِ وزیر آغا

جنوری تا جون ۲۰۲۵ء

مدیران : شین کاف نظام عادل رضا منصوری

صفحات : ۴۳۶ قیمت : ۳۰۰ روپے

ملنے کا پتہ : مہیما ہیریٹج، سینٹرل اسپائن، ودیادھر نگر، جے پور (راجستھان)

● افسانہ

● تنویر احمد تماپوری

جنم دن مبارک

خوشگوار موسم تھا، ہینگنگ گارڈن میں ٹھنڈی ہوا کسی دلکش موسیقی کے ہلکی سروں کی طرح بہہ رہی تھی۔ پرندوں نے چہچہانے کے نئے سر اپنا لیے تھے۔ گارڈن کے داخلی حصے کی ایک بینچ پر بیٹھا میں، رنگ برنگی پوشاکوں میں اٹھکلیاں کرتے بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں زندگی اس وقت اپنے سب سے حسین روپ میں رواں تھی۔ میں یہاں اکثر آیا کرتا تھا۔ لافٹر کلب میں کچھ دیر قہقہے لگانا، ہلکی سی ورزش، تھوڑی سی جاگنگ۔ رٹائرمنٹ کے بعد یہی میری لگی بندھی لیکن جملہ مصروفیت تھی۔ اچانک ایک آواز نے مجھے پلٹنے پر مجبور کیا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔''

لہجہ مودب اور مہذب تھا۔ میرا ہم عمر تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔ چہرے پر گذرے سخت موسموں کا لیکھا جوکھا۔ ایک ہاتھ میں رسی سے بندھا کتا، دوسرے میں پرانے طرز کا سیل فون۔ وضع قطع کسی ریٹائرڈ کلرک جیسی لگ رہی تھی۔

''مجھے شاجی نائر کہتے ہیں۔ میں کیرلا سے ہوں۔'' اس نے ہاتھ جوڑ کر ابھینندن کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ مگر اس کی شخصیت میں جنوب ہندندارد تھا۔ نہ لہجے میں ملیالی رنگ تھا۔ نہ ڈیل ڈول میں ملباری چھاپ۔ ساوتھ انڈیا کی اکلوتی جھلک بس اس کے نام میں باقی تھی۔ الٹا اس کے لمبوترے چہرے کی سفیدی اور چنار سی طویل قامتی کشمیر کے برف زاروں یا پنجاب کے کھیتوں سے درآمد شدہ لگ رہی تھی۔ حالانکہ چہرے کی یہ سفیدی اچھی صحت کے علاوہ خون کی کمی کا سبب بھی ہو سکتی تھی۔ بڑھاپا بذات خود ایک لاغر اور کمزور بیالوجی کا نام ہے۔ اس کے علاوہ مجبوری اور بے بسی کی بہتات بھی ماتھے پر نیون سائن کی طرح جگمگ کر رہی تھی۔ مستزاد اس پر کھوں کھوں کرتی کھانسی۔ جو ہر ۵ منٹ بعد کسی ٹی وی کے ایڈ کی طرح آدھمکتی تھی۔ اس نے اپنے کتے کو کھانسی زدہ ملیالی میں پھسپھسا کر کچھ سمجھایا۔ کتا چپ چاپ اسکے پیروں میں بیٹھ کر دم ہلانے لگا۔

''میں نے آپ کو ہمیشہ لافٹر کلب میں قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔''

اس نے کھانسی کے بیچ اپنی بات قسطوں میں مکمل کی۔

''اوہ اچھا...... یہ ضروری ہے۔اب اس عمر میں ایسا کرنا چاہیے۔آپ نہیں ہوتے اس میں۔''
میں نے جواب دینے کی کارروائی سوالیہ انداز میں مکمل کی۔
''نہیں میرے پاس قہقہے لگانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔''
وجہ تو میرے پاس بھی نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا۔لیکن اس طرح تسبیح کے مایوس دانے پھیرتے رہنا مجھے پسند نہیں تھا۔نائر سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔پہلی نظر میں یہ شخص مجھے کچھ سنکی اور خبطی سا لگا۔
''اگر روبی نا ہوتی تو میں......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
''اچھا!''
میں اور کیا کہتا۔بات کو اچانک اس نے کہیں بیچ سے اٹھایا، کان سے پکڑا اور میرے سامنے لا کھڑا کیا۔جس کا نا سر پلے پڑ رہا تھا نا پیر۔
''آپ روبی کو جانتے ہیں؟''
میرے انکار میں سر ہلانے کے بعد اس نے بات کی ڈور کو وہیں سے جوڑا۔لیکن سر پیر اب بھی غائب تھے۔تاہم پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر کھوں کھوں کے بیچ بھی ایک عجیب سی چمک دیکھی۔
''یہ میری روبی ہے۔میری دوست میری ہم دم۔''
اس کی پچکار سے کتے کی دم میں بجلی سی دوڑ گئی۔اس کی رفتار دوگنی ہوگئی۔
''روبی کا نام سن کر میں سمجھا شاید وہ آپ کی مسز کا نام ہے۔'' میں حیرت زدہ تھا۔
''مسز کو پورے 5 سال سے مس کر رہا ہوں۔''
یہ شخص حالات کو پراسرار بنا کر پیش کرنے میں ماہر تھا۔
''مطلب......؟''
بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ درد مشترک لگ رہا تھا۔ میں دل ہی دل اپنی کہانی کی تانیں اس کی کہانی سے ملانے لگا۔
''کرونا کی وبا نے اسے چھین کر بدلے میں یہ کھانسی بخشی ہے۔'' بیوی کی یاد نے بیک وقت اس کی کھانسی میں خشکی اور آنکھوں میں نمی کو چوگنا کر دیا۔
بے پناہ اذیت اس کی آنکھوں میں محسوس کرنا میرے لیے بھی اذیت ناک تجربہ تھا۔
''بچے ہیں؟''
''تین ہیں۔دو لڑکے، ایک لڑکی۔لڑکی اپنے پتی کے ساتھ کوچی میں رہتی ہے اور لڑکے یہیں۔''

''یہیں ممبئی میں؟''

''جی بلکہ ایک ہی گھر میں۔مگر اپنے پورشن میں مصروف اور اپنے آپ میں مست۔بیمار باپ کھانستے کھانستے مر بھی جائے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''یہ واقعی بہت افسوسناک تھا۔''

مجھے دکھ ہونے لگا۔اب نائر کے بارے میں میری رائے بدل رہی تھی۔خیر میرے حالات اتنے دگرگوں نہیں تھے۔کچھ ڈھارس بندھی۔میرا بیٹا مجھ سے رابطے میں ہوتا تھا۔حالانکہ سہیل کینیڈا میں رہتا ہے۔پھر بھی حتی الامکان میرا خیال رکھتا تھا۔آج کل تو چھٹیوں پر بچوں کے ساتھ یہیں آیا ہوا تھا۔

''آپ سے بات کر کے اچھا لگ رہا ہے۔اس عمر میں کوئی قریب نہیں آتا۔بچے تک نہیں پوچھتے۔اپنے کاروبار، اپنی زندگی، اپنی فیاٹاسیز، انہیں فرصت کہاں ملتی ہے۔سپنا جب تک زندہ تھی کھینچ کھانچ کر کم سے کم ڈنر کی ٹیبل تک سب کو لاتی تھی۔''

مجھے نجمہ کی یاد آئی۔بیویاں ساری ایسی ہی ہوتی ہیں۔بے لوث اور محبت لٹانے والی۔

اس کے لہجے کی بے بسی نے بادلوں کے دلوں کو چیر دیا۔ بوندا باندی کی شکل میں انکے آنسو نکلنے لگے۔آنسو میرے بھی نکل رہے تھے۔ نکلنا ضروری بھی تھا۔خود میری زندگی اس سے زیادہ الگ کہاں تھی۔سب کچھ نہیں تو بہت کچھ لگ بھگ ویسا ہی تھا۔بس فرق اتنا تھا کے میرا ایک بچہ تھا۔دیکھا جائے تو برا بھی نہیں تھا۔تاہم یہ ستم تو پھر بھی جاری تھا کہ وہ سمندر پار رہتا ہے۔

میں وہاں سے اٹھا بوجھل قدموں سے لافٹر کلب کی طرف چل دیا۔عموماً میں یہاں گاڑی سے آتا تھا۔مگر آج سہیل بچوں کے ساتھ شہر گھومنے نکلا تھا۔لہٰذا پیدل ہی چل دیا۔گھر زیادہ دور نہیں تھا۔تاہم اتنا قریب بھی نہیں کے اس عمر میں ایک ہی بار میں دم لیے بغیر پہنچ جاوں۔لہٰذا کچھ دیر ستانے کے لیے یہاں رکا تو نائر سے ملاقات ہوئی۔

آج لافٹر کلب کے قہقہے بھیروی کا الاپ لگ رہے تھے۔نائر کی اداس آنکھیں، اس کی تنہائی، اسکی بیماری اور بے بسی پورا وقت میرے آس پاس ہی خیمہ زن رہے۔ان حالات نے پہلے تو میری مرحوم بیوی کی یادوں کے لیے چور راستہ بنایا۔پھر اس میں بجھی بارودی سرنگوں کو تیلی دکھائی۔میں جلد ہی یہاں سے طائب ہوا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

آدھے گھنٹے بعد گھر پہنچا، معلوم پڑا بچے ابھی نہیں آئے۔چھٹیوں کا پورا مزہ لے رہے تھے۔آج گھر بیوہ کی مانگ جیسا سونا پن نشر کر رہا تھا۔پتا نہیں یہ سچائی تھی یا نائر کی صحبت کا اثر۔تاہم اکثر بزرگوں کا یہ

درداب مشترک تھا۔کافی دیرانتظار کیا۔شاید وہ لوگ باہر سے کھا کرآنے والے تھے۔کھانا میرے لیےضروری نہیں تھا۔اس عمر میں ہوتا بھی نہیں۔مگراس کا کیا جائے کہ ضعیفی میں انسان واپس بچوں جیسا ہوجاتا ہے۔یا پھر چابی بھرے کھلونے جیسا۔ بہت سوں کواگلی سانسوں کی بحالی کے لئے وقفے وقفے سے دوائی نامی چابی کی ضرورت پڑتی ہے۔اوران چابیوں کوگھمانے کے لیےغذانامی گراری کی۔لہذا میں نے کھانا زہر مار کیا۔پھر اگلی سانسوں کی بحالی کےجتن کیےاورسوگیا۔اگلے پندرہ منٹ کےاندراٹاغفیل ہونے میں میرا اپنا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔کمال اسی چابیوں کے گچھے کا تھا۔جس میں سے ایک کے ماتھے پرانیٹی ڈپریسنٹ لکھا ہوا تھا۔

اگلے چار پانچ دن نائرنظرنہیں آیا۔شاید کہیں چلا گیا تھا یا پھراتفاقات کا دریا مخالف سمت بہہ نکلا تھا۔ میں سر جھٹک کراپنے معمول پر چلتا رہا۔میرا معمول بھی کوئی زیادہ خوشگوارنہیں تھا۔ڈھاک کے وہی تین پات۔صبح عام سی ہوتی تھی۔ یوگا،نہانا،کھانا اورٹی وی،شام کی چائے پھر پارک،پھررات کا کھانا پھر دوائی۔ اگلے دن پھر سے پھر کی وہی تکرار۔پچھلے دن کے سارے معمولات کی ڈیٹا شیٹ من وعن اگلے دن کی وال پرکاپی پیسٹ ہوجاتی۔یہ ساری چیزیں پہلے مجھےاتنا کھٹکتی نہیں تھی۔نائر نے میری ساتویں حس کو جگادیا تھا۔میری آنکھ اب خوردبینی ہوچلی تھی۔ہر چیز کو زوم کر کے دیکھنے لگی تھی۔

کچھ دن بعد ایک شام نائر پھرنظر آگیا۔ بالکل اسی حلیے میں تھا۔اسی طرح ایک ہاتھ میں موبائل۔دوسرے میں کتے کی رسی۔ چہرے پرفکروں کا جال۔معمول کے ہائے ہلو کے بعد اس گہرے ہوتے سناٹے کی جھیل میں پہلا پتھراسی کا تھا۔

''کل ہاسپٹل گیا تھا۔''

''ہوں!''

اس عمر میں یہ کوئی انہونی تو تھی نہیں۔جس پر میں حیرت کا اظہار کرتا۔

''الزائمرکی ابتداڈائگنوس ہوئی ہے۔''

حیران تو میں اب بھی نہیں تھا۔ہاں پریشان ضرور ہوا۔پھر بھی چپ رہا۔کیا کہوں۔کچھ دیر کے سناٹے کے بعدنائرخودہی بول پڑا۔

''اب میں اولڈ ایج ہوم میں بھرتی ہونے کا سوچ رہا ہوں۔''

''اس میں کونسی لاجک ہے بھائی؟''

خودمیری آواز مجھے کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

''میرے ایک پڑوسی کوکچھ سال پہلےان کے بچوں نے کنبھ کے میلے میں چھوڑ دیا تھا۔''

''تو......؟''

''میرے بچے بھی ایسا کریں گے۔''

''بکواس۔ایسے کیسے؟تم سوچتے بہت ہو۔''

''میرا پڑوسی اب تک واپس نہیں پہنچا۔''

میری بات سنی ان سنی کر کے کہنے لگا۔اب کے شاید وہ اپنے آپ سے بھی مخاطب تھا۔

''کیسے نہیں پہنچا۔ٹیکنالوجی کے اس دور میں،دنیا سمٹ کر مٹھی میں آ گئی ہے بھائی۔''

''دنیا ان کی مٹھی میں ہوتی ہے۔جن کا دماغ بس میں ہوتا ہے۔''

مجھے یاد آیا۔آج نائرا اتنا بے چین کیوں ہے۔الزائمر دماغ کے ساتھ ساتھ اس کے حوصلوں میں بھی سیندھ لگا رہا تھا۔یہ بات مجھے بھی دکھی کر گئی نائر لاکھ الزائمر زدہ سہی۔لاکھ قنوطیت پسند سہی لیکن اس کے اندیشوں کی تلچھٹ میں فکر کے کئی رنگ مخفی تھے۔میں کیا بولتا۔نہ بولنے کا موقع تھا۔نہ الفاظ۔میں نے اپنی چپی پر مزید گہرے پردے اوڑھ لئے۔بس اسے دیکھتا رہا۔اس کے شک کی سوئیاں غلط سمت نہیں تھیں۔

''میری پریشانی بڑھاپا یا بیماری نہیں ہے۔اکیلا پن اور بے بسی کا کیا کروں۔''

کھوں کھوں کے ایڈ کے بیچ اصل کانٹینٹ مگر سچ کا تھا۔

''بچوں کا نہیں تو پوتے پوتی کا خیال کرو۔وہ تو پوچھتے ہوں گے تم کو۔''

''چھوڑو یار۔آتے جاتے ٹکراؤ ہو جاتا ہے تو ہائے،ہلو کا ایک ادھ سکا اچھال دیتے ہیں بس۔''

اس کی زبان ریس کے میدان میں فیراری بن چکی تھی۔

''پیرینٹس ایک پھلدار درخت کی طرح ہوتے ہیں۔ابھی ان کو تمھاری ضرورت ہوگی۔''میں نے اپنے تجربے کی آخری پینی بھی خرچ کر دی۔

''میرے بھائی بچے اسی وقت تک آپ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔جب تک آپ پھل دے رہے ہوں۔جیسے ہی پھل رک گئے۔شجر ممنوعہ بنا دیتے ہیں۔''

نائر کی بات جتنی سخت تھی اتنی ہی سچ بھی تھی۔ہر گذرنے والا دن بزرگوں کو زیادہ بے وقعت کرتا جا رہا تھا۔سائینس اور اس کی ایجادات جہاں نئے جہانوں کو کھوج رہی تھی،وہیں پرانے رشتے گم بھی ہو رہے تھے۔بزرگوں کے تجربے اور ہنر کی نئی نسل کو ضرورت نہیں تھی۔کیونکہ انہوں نے چور راستے ڈھونڈ لیے تھے۔چیٹ جی پی ٹی اور اے آئی کی مدد سے پیرانہ سالی کو حاشیے پر دھکیلا جا رہا تھا۔

نائرا گلے دو ہفتوں تک نظر نہیں آیا۔ممبئی کے باہر تھا یا شاید بیمار۔کہیں وردھ آشرم تو نہیں پہنچ گیا۔

یہ خیال کچوئے کے سر کی طرح میرے سر میں ابھرنے لگا۔ایک دن اس کی واٹس اپ ڈی پی پر ریسٹ ان پیس لکھا دیکھا تو آناً فاناً فون کرنا پڑا۔ نائر کی بیٹی سے ملی اس کی اچانک موت کی خبر مجھے اندر تک دکھی کر گئی۔

آج کل میں گارڈن نہیں جا رہا تھا۔ مجھ پر ہونے والے اداسی کے حملوں کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ میرے بچوں کی واکیشن ختم ہو رہی تھی۔ وہ واپسی کی تیاری میں تھے۔لہذا سارا وقت ان کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔

بڑھاپے کی نیند مٹی کے کچے برتنوں جیسی ہوتی ہے۔ ذرا سی آہٹ بھی اسے توڑ دیتی ہے۔ایک رات میری اینٹی ڈپریسنٹ والی نیند کو بھی فون کی رتی بھر بیپ نے توڑ دیا۔لیکن میسیج تو جوڑنے کا تھا۔ساری کوفت جاتی رہی۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے سہیل کبھی میرے جنم دن سے غافل نہیں ہوتا تھا۔آج بھی سب سے پہلے رات بارہ بجتے ہی اس کا مبارکباد والا میل آ گیا۔مگر وہ تو گھر ہی میں ہے۔ساتھ مل کر منا سکتے تھے۔ میں نے سوچا۔شاید میرے آرام کا خیال آیا ہو۔ میں نے موبائل نکالا اور اس کا نمبر ڈائل کیا۔دوسری گھنٹی پر بہو نے فون اٹھایا۔

''کیا بات ہے پاپا خیریت تو ہے۔اتنی رات کو آپ کا فون؟''

رات کے اس پہر بغل والے کمرے سے بیمار بزرگ کے طرف سے کال آئے تو جوان ہاتھ پاوں کا پھولنا بنتا ہے۔

''میں سہیل کو اٹھاتی ہوں۔'' وہ گھبرا گئی تھی۔

''ارے نہیں سب ٹھیک ہے بیٹے۔کیا سہیل سو رہا ہے؟''

''جی وہ تو دس بجے ہی سو گئے آج۔''

''اچھا۔ چلو تم بھی سو جاو۔جنم دن کی مبارکباد کا میسیج آیا تھا سہیل کے میل سے۔سوچا بات کر لوں۔مگر یہ ہوا کیسے۔''

''سسٹم خود ہی اپنے وقت پر آٹو میٹک بھیج دیتا ہے پاپا۔''

''مطلب؟''

''وقت اور تاریخ ریمائنڈر میں فیڈ کیا ہوا ہے نا...... پہلے سے۔''

میں ہونق سا ہو کر موبائل کو کچھ دیر تک گھورتا رہا۔پھر میرے لرزتے ہاتھ خود بہ خود اینٹی ڈپریسنٹ کی نئی پیکٹ کھوجنے لگے۔

◄◄ ● ►►

Reyaet Almani Company
Reyaz/(Saudi Arabia)-11411
966501724826

● افسانہ

● ہما فلک

خدا اب ابابیل نہیں بھیجتا!

''حق اللہ!

اللہ بادشاہ!''

چھن چھن ٹھک......چھن چھن ٹھک کی آواز کے ساتھ کھڑاؤں کے گھسٹنے کی آواز بھی شامل تھی اوراس چھن چھن ٹھک کے اختتام پرایک مخصوص وقفے سے حق اللہ......اللہ بادشاہ کی آواز۔

گرمی کی شدت سے مجبور سب اپنے اپنے آشیانوں میں چھپے بیٹھے تھے۔کچھ سوئے جاگے لوگوں میں اعجاز وہ تھا جسے درد کی ہلکی ہلکی لہر سونے نہیں دے رہی تھی اور درد کے باعث پیش آنے والے رت جگے جاگنے نہیں دے رہے تھے۔ایسے میں گلی سے آتی ان آوازوں نے اس کے اعصاب کو بری طرح جھنجھوڑ دیا۔گرمی کی شدت اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ اے سی بند کیا جائے مگر ٹھنڈک سے چوٹ میں درد شروع ہو چکا تھا۔اعجاز کو یہ سوچ کر سخت کوفت ہوئی کہ اگر اس وقت وہ سو رہا ہوتا تو نیند میں خلل ضرور پڑتا۔بھری دوپہر میں جب ہر طرف خاموشی کا راج ہو کسی پھیری والے یا فقیر کی صدا بہت پریشان کرتی ہے۔گھٹن کا احساس چوٹ کی وجہ سے پیدا ہوا چڑ چڑا پن اس پر اس فقیر کی آواز!

اس نے ایک جھٹکے سے اٹھنے کی کوشش کی تو درد کی تیز لہر نے اسے یاد دلایا کہ وہ ابھی ایسی کسی سرگرمی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔لیکن اس فقیر کو سبق سکھانا بھی ضروری تھا۔اس نے پاس پڑی بیساکھی پکڑی اور اس کا سہارا لے کر بہت احتیاط سے کھڑا ہو گیا۔آواز قریب آتی جارہی تھی اعجاز دروازے کی طرف آہستہ روی سے چلتا ہوا گیا جب تک اس نے دروازہ کھولا فقیر تھوڑا آگے جا چکا تھا۔اس نے اسے آواز دی

"Heyyou"

فقیر رک گیا مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا ۔

''سنا نہیں تم نے یہاں آؤ'' اعجاز نے بارعب لہجے میں کہا وہ سر جھکائے اس کی طرف آ گیا۔

''کیا تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ اس وقت سب سو رہے ہوں گے۔''

''سب سو ہی تو رہے ہیں۔'' فقیر نے نظریں جھکائے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں تو تمہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے۔''

''سب سو رہے ہیں، احساس مر چکا ہے!''

''ہٹے کٹے ہو کر مانگتے پھرتے ہو شرم نہیں آتی، پیٹ کبھی بھرتا بھی ہے تم لوگوں کا؟''

''فقیر کا پیٹ تو بھرا ہوا ہوتا ہے۔''

''تو پھر مانگتے کیوں ہو؟ اپنی اوقات یاد رکھنے کے لیے یا دوسرے کی اوقات دیکھنے کیلئے؟''

''جو مال کی ہوس میں مانگیں وہ فقیر نہیں، بہروپئے ہوتے ہیں فقیری کا نام بدنام کرنے والے؛ جانتے ہیں تم لوگ کتنے بھولے ہو خیرات پر یقین رکھتے ہو، سائل کو خالی ہاتھ لوٹانے سے ڈرتے ہو اور اس بات کا فائدہ ہی وہ لوگ اٹھاتے ہیں۔''

''تو تمہارا خیال ہے کہ تم ایک سچے فقیر ہو باقی سب بھکاری ہیں؟ جھوٹے بہروپیے؟''

''اس دنیا میں سب بھکاری، سب جھوٹے، سب بہروپیے ہیں۔ کبھی صبح سے شام تک اپنے معمول پر غور کرنا سب سمجھ آنے لگے گا۔'' یہ کہہ کر فقیر تو اپنی چھڑی چھن چھناتے ہوئے آگے چلا گیا جب کہ اعجاز پرسوچ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

اگلے دن صبح سے غیر محسوس انداز میں اس کے کان باہر کی طرف لگے تھے۔

''حق اللہ! اللہ بادشاہ!''

بالآخر وہ آواز سنائی دے گئی اعجاز جلدی سے باہر نکل آیا اس کے گھر کے سامنے والی گلی میں وہ چلتا ہوا قریب آ رہا تھا۔ اعجاز نے پاؤں سے سر تک اس کا جائزہ لینا شروع کیا پیروں میں کھڑاویں اور موٹے موٹے کڑے پہنے ہوتے اس کے اوپر کالی دھوتی اور کالا ہی لمبا سا کرتا جو کہ گھس کر اپنی رنگت کھو رہے تھے۔ ہاتھوں اور گلے میں بھی بڑے بڑے موتیوں والی مالائیں پہن رکھی تھی۔ سر کے بال شانوں تک لمبے، جو بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ مل کر شاید کنگھی نہ کرنے کہ وجہ سے، آپس میں الجھ چکے تھے پہلی نظر میں اسے دیکھ کر کسی بہروپیے کا گمان ہوتا تھا اس کے ہاتھ میں درخت کی ایک شاخ چھڑی کی صورت پکڑی ہوئی تھی جو درمیان میں کہیں کہیں ٹیڑھی تھی اس چھڑی کے آخری سرے پر گھنگھرو لگے ہوئے تھے۔ وہ کچھ قدم چلتا پھر چھڑی کو زمین پر مارتا چھن کی آواز سے گھنگھرو بجتے تو وہ پکار اٹھتا حق اللہ اللہ بادشاہ !!'' لکڑی کی کھڑاویں گھنگھروں کی آواز میں جب اس کی پرسوز آواز شامل ہوتی تو گلی کی خاموشی میں ایک بارعب

سا ارتعاش پیدا ہوتا۔ جانے کیوں اس کی آواز میں سارے جہاں کا درد محسوس ہوتا تھا مگر لکڑی کی کھڑاویں جیسے دنیا کو اپنے قدموں تلے روندتی چلی جا رہی ہوں اور گھنگھرو کی آواز اس سب سے بے نیاز ایک خوشی کی جھنکار پیدا کرتیں جس میں غم کی آمیزش تھی۔ وہ جیسے جیسے قریب آ رہا تھا اس کا تجسس بڑھ رہا تھا یوں تو اس کی آواز بہت بار کانوں میں پڑی تھی اسے اپنے پاس سے گزرتے دیکھا بھی تھا مگر اتنا تفصیلی جائزہ لینے کا موقع پہلی بار ملا تھا یا اس حادثے کے بعد ہر بات سے اچاٹ دل کہیں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔

جب وہ گلی کے کنارے تک پہنچا تو اس نے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی وہ چونکہ اسے ہی دیکھ رہا تھا تو نظروں کا ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں......ان کی کشش بیان سے باہر تھی وہ اس پر صرف ایک نظر ڈال کر بے نیاز ہو گیا تھا مگر ان آنکھوں کا تاثر......اور بے پناہ چمک......وہ اسے بے اختیار ہو کر پکار اٹھا۔

بات سنیں! ''آج لہجے میں کل والا تحکم نہیں تھا۔ فقیر رک گیا مگر آج بھی مڑ کر اسے نہیں دیکھا۔ اعجاز چند لمحے منتظر رہا پھر خود ہی اس کے قریب چلا گیا۔

''کل آپ نے ایک بات کہی تھی۔'' فقیر کی شخصیت میں کچھ ایسا رعب تھا کہ اعجاز کے لہجے میں غیر ارادی طور پر احترام جھلک آیا۔

''صبح سے اب تک جو اپنے چہرے اتارے اور پہنے ہیں ان پر غور کر لیا ہوتا جواب مل جاتا۔'' فقیر نے نرمی سے جواب دیا۔

''مجھے آپ بہت تعلیم یافتہ لگتے ہیں آپ کے لہجے اور گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے۔''

''گھر سے کسی تعلیمی ادارے تک پندرہ بیس سال کا سفر انسان کو صرف حرفوں اور ہندسوں کی پہچان دیتا ہے علم نہیں۔''

''تو علم کہاں سے ملتا ہے؟''

''علم کی تلاش میں در در بھٹکنا پڑتا ہے بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ کسی پر یہ در وا ہو جاتا ہے کسی کو اس در کی خاک بھی نہیں ملتی۔ جو ایک بار اندر چلا جائے اسے واپسی کا راستہ نہیں ملتا......اور زیادہ کی ہوس اسے آگے اور آگے لئے جاتی ہے۔''

''واہ! کیا کچھ وقت آپ رک سکتے ہیں؟''

''میں تو رکا ہوا ہوں وقت گزر رہا ہے۔''

فقیر چلنے لگا تو اعجاز اپنی چھڑی کا سہارا لے کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔

''کیوں آتے ہو پیچھے؟ ''

''مجھے اس دروازے تک جانا ہے۔''

''جس پر یہ در کھلا اور وہ اسے ہاتھ لگا کر پلٹ آیا پھر دعویٰ کرنے لگا کہ اس نے سب پا لیا سمجھو اس کا سارا سفر رائیگاں گیا۔''

''لگتا ہے آپ بہت جانتے ہیں۔''

''جاننے کی جستجو نے ہی در بدر کر رکھا ہے۔''فقیر زیر لب بڑبڑایا۔

''روپ بہروپ کی بات کریں۔''

''ایک شخص صبح سے رات تک کئی چہرے بدلتا ہے یہ اس کے کردار ہوتے ہیں جو اسے ہر صورت نبھانے ہی ہیں ایسا کرنے میں برائی کیا ہے؟''

''جو کردار اسے ودیعیت ہوئے ان کو نبھانے میں کوئی برائی نہیں برائی تو وہاں شروع ہوتی ہے جب کوئی وہ کردار ادا کرنے لگے جو اس کا ہے ہی نہیں، یا جو وہ نہیں ہے وہ دکھانے کی کوشش کرے۔''

''یعنی اگر کوئی پارسا نہیں ہے تو پارسا نظر آنا چاہے؟ تو تمہاری نظر میں جو پارسا نہ ہو اس کی اس کوشش میں برائی ہے؟''

''برا روپ نہیں برا دھوکہ ہے، اور یہ کسی اور کو نہیں اپنے آپ کو دھوکہ ہے!''

''وہ کیسے؟''

''ان کے دل کے داغ ان کے ماتھوں پر محراب کی صورت چمکتے ہیں، ان کی سب نمازیں ان کا دامن پکڑتی ہیں، وہ ہاتھ میں تھامے تسبیح پر دن رات جھوٹ کا ورد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ روپ بھر کر یہ سب کرنا بہت آسان ہے مگر تن کا اجلا لباس بھی ان کے من کی میل ڈھانپ نہیں سکتا۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب انسان آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے۔ اپنی روح کے آئینے کے سامنے!''

''مگر میں نے تو کئی ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو مرتے دم تک اس بات کا ادراک نہ کر سکے۔''

''ادراک؟''فقیر طنزیہ ہنسا

''خود پر اترنے والے صحیفوں میں اپنی غرض کے لئے تحریف کرنے والے ادراک کیا جانیں؟''

فقیر اسے گہری سوچ میں چھوڑ کر اپنی کھڑاویں کھڑکھڑاتا آگے چل پڑا۔

چند دن گزر گئے فقیر نہیں آیا اعجاز غیر محسوس انداز میں اس کا منتظر تھا تبھی تو جب دور سے وہی مخصوص آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں تو وہ چھڑی ٹیکتا گھر کے باہر بنے چبوترے پر آ بیٹھا تا کہ اسے اس

کا انتظار محسوس نہ ہو گیا۔

''خدا ایسے لوگوں کو عذاب نہیں دیتا؟'' فقیر اس پر ایک بے نیازسی نظر ڈال کر آگے بڑھنے لگا تو اس نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔

فقیر رک گیا

''خدا اب ابابیلیں نہیں بھیجتا............''

وہ جیسے خود سے ہی مخاطب تھا

''جی؟'' اعجاز کے لہجے میں ناسمجھی کا عنصر نمایاں تھا

''ابرہہ کے ہاتھیوں کے لشکر کو ابابیلوں کی چونچ میں کنکریاں بھر کر بھیج کر بھوسا بنا دینے والا خدا اب ابابلیں کیوں نہیں بھیجتا؟'' فقیر کے لہجے میں سوال تھا

''وہ تو خدا کے گھر کی حرمت کی حفاظت کے لئے تھا۔اب حرمت کے معنی بھی بدل چکے ہیں اور تحفظ کی تعریف بھی ہاں خدا اب اسی لئے ابابیلیں نہیں بھیجتا اب لوگ خود چونچ میں پتھر بھرے حق کہنے والوں پر برسنے لگے ہیں ۔''

''ایسی باتیں کریں گے تو۔۔۔۔''

''ہاں جانتا ہوں جتنے قتل آج تک مذہب کے نام پر ہوئے اور ہو رہے ہیں کسی اور وجہ سے کم ہی ہوئے ہوں گے۔''

عریاں سچ جب کئی جھوٹوں کے چنگل میں اپنا دامن بچانے کے لئے جائے عافیت ڈھونڈھنے لگے۔وہ جھوٹے اس سچ کو گھیرے میں لئے اس کے گرد ہاہا کار مچاتے ناچنے لگیں خدا تب بھی ابابیلیں نہیں بھیجتا۔

آپ کو خدا سے مسئلہ ہے یا انسان سے؟

انسان سے کیا مسئلہ آدھے ہوس میں ننگے ہیں آدھے بھوک سے ننگے ہیں۔

سب بھوکے ہیں

سب ننگے ہیں

حق اللہ

اللہ بادشاہ

فقیر اسے مخمصے میں چھوڑ کر جا چکا تھا

آپ کہاں رہتے ہیں؟

وہ چند دن کا انتظار اعجاز کو بہت طویل محسوس ہوا تھا جب وہی مانوس آواز دور سے آتی سنائی دی تو وہ تیزی سے باہر آیا تھا اب چوٹ میں کافی آرام تھا لیکن پلستر نہیں اترا تھا اور پلستر کے اندر ہونے والی خارش اسے بے چین رکھتی...... یا شاید اندر اس فقیر سے دوبارہ ملنے کی آرزو...... وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

میں ہر جگہ رہتا ہوں

اور میں کہیں بھی نہیں ہوں؟

آپ اتنی مبہم باتیں کیوں کرتے ہیں میں نے تو صرف آپ کا ٹھکانہ پوچھا ہے

کہا نا میں ہر جگہ ہوں اور میں کہیں بھی نہیں

"صرف خدا ہر جگہ موجود ہے"

خدا اللہ بھگوان گاڈ

فقیر نے نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پر اسرار انداز میں مسکرایا

اسکی نظروں کی وہ چمک اس کی آنکھوں کو خیرہ کر گئی کہ وہ نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا

وہ ہر جگہ رہ سکتا ہے تو اسے اتنے گھروں کی کیا ضرورت ہے؟

میں تو کہتا ہوں سب مندر مسجد گرجے توڑ کے خدا کو ان گھروں سے نکال کر انسانوں کو بسایا جائے۔عبادت گاہوں کو کیوں؟ سب عیاشی کے اڈوں کو توڑ کر کیوں نہ یہ کام کیا جائے؟

سب عیاشی کے اڈے ہیں بھیا ......سب عیاشی کے اڈے

حق اللہ

اللہ بادشاہ

سوشل میڈیا پر ایک خبر گردش کر رہی تھی کہ اسلامیات کے سابقہ پروفیسر کو توہین مذہب کے جرم میں لوگوں نے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا۔ایک خوبصورت اور بھرپور جوان پروفیسر کا مسکراتا ہوا چہرہ تصویر میں اسے جانا پہچانا محسوس ہوا

ذرا غور سے دیکھا تو کانوں میں حق اللہ____ اللہ بادشاہ کی آواز گونجنے لگی۔

◄◄ ● ►►

Rhon Str.32
63071,Offenbach am Main
+491739054897

تبصرے

نام کتاب: زوال
صنف: ناول
ناول نگار: عبدالصمد
اشاعت اول: 2025
صفحات: 256
قیمت: 300 روپے
مبصر: اقبال حسن آزاد

یہ ناول ''زوال''، ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار عبدالصمد کی تخلیقی بصیرت اور سماجی شعور کا ایک نہایت اہم اظہار یہ ہے۔ ۲۰۲۵ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہونے والا یہ ناول اردو فکشن کے اس تسلسل کی نمائندگی کرتا ہے جس میں فرد اور معاشرہ دونوں کی باہمی کشمکش مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

''زوال'' کے عنوان سے ہی ایک گہرا فلسفیانہ اور علامتی مفہوم جھلکتا ہے۔ یہ ناول محض کسی فرد یا طبقے کے زوال کی داستان نہیں بلکہ ایک پورے عہد کی فکری، اخلاقی اور تہذیبی گراوٹ کا بیانیہ ہے۔ عبدالصمد نے اپنی مخصوص طرزِ نگارش میں انسانی وجود، اقتدار، اخلاقیات، اور سماجی تضادات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری خود کو اس کہانی کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

ناول کے پس منظر میں ایک ایسی دنیا ہے جہاں اقدار منہدم ہو چکی ہیں، تعلقات مفادات کی بنیاد پر استوار ہیں اور انسان اپنی شناخت کھو چکا ہے۔ یہی وہ فکری نکتہ ہے جس پر عبدالصمد کا تخلیقی فلسفہ قائم ہیکہ زوال محض مادی یا سیاسی نہیں ہوتا، بلکہ روحانی اور اخلاقی سطح پر بھی قوموں اور افراد کو نگل لیتا ہے۔

عبدالصمد کی نثر کا سب سے نمایاں پہلو اس کی علامتی گہرائی اور بیانیہ کیسادگی ہے۔ ان کے جملے سادہ ہوتے ہوئے بھی تہہ دار مفہوم رکھتے ہیں۔ ''زوال'' میں ان کی زبان میں نہ صرف ادبی شائستگی ہے بلکہ درد مندی، احتجاج، اور سوالیہ لہجہ بھی موجود ہے۔ بعض مقامات پر بیانیہ علامتوں اور استعاروں سے

بوجھل ہوجاتا ہے جو اس کے فکری گہراؤ کو بڑھاتا ہے۔

ناول کے کردار مختلف سماجی اور فکری طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔کوئی کردار محض فرد نہیں بلکہ پورے نظام کی علامت ہے۔عبدالصمد کی کردار نگاری میں نفسیاتی باریک بینی اور حقیقت نگاری دونوں موجود ہیں۔وہ کرداروں کے ذریعے معاشرتی زوال کی تہوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔جہاں انسان خود اپنے وجود کا دشمن بن چکا ہے۔

''زوال'' کو عبدالصمد کے دیگر ناولوں جیسے ''دوگز زمین''، ''اجالوں کی سیاہی'' اور ''شکست کی آواز'' کے تسلسل میں پڑھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف اپنے عہد کے اجتماعی المیے کو مختلف جہتوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنے مخصوص تنقیدی و علامتی انداز میں انسان کی تنہائی، شکستگی اور بے معنویت کو اجاگر کرتے ہیں۔

''زوال'' ایک ایسا ناول ہے جو قاری کو محض کہانی نہیں سناتا بلکہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ اردو ادب میں عبدالصمد کی فکری پختگی اور تخلیقی جرأت کا نیا سنگ میل ہے۔

ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے یہ ناول محض ایک تخلیق نہیں بلکہ ایک عہد کی دستاویز ہے...... ایک ایسا آئینہ جس میں ہم اپنے سماج، اپنی اقدار اور اپنی ذات کا زوال صاف دیکھ سکتے ہیں۔

◄◄ ● ►►

نام کتاب: ''غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے''

صنف: تحقیق وتنقید

مصنف: فخر الدین عارفی

صفحات: 208

قیمت: 300 روپے

رابطہ: 9234422559

مبصر: اقبال حسن آزاد

فخر الدین عارفی ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، محقق، ناقد، صحافی اور ناظم مشاعرہ ہیں اور ہر جگہ کامیاب ہیں۔اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے ''سلگتے خیموں کا شہر'' (۱۹۸۴) اور ''شہر احساس'' (۲۰۰۴) منظر عام پر آ کر شرف قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ''غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے'' ان کی تازہ ترین تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے۔

فضل حق عظیم آبادی کا بہت ہی مشہور شعر ہے:

یہ بستی اب بھی بازار ختن ہے باکمالوں سے　　غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے

فخر الدین عارفی نے اسی شعر کے مصرع ثانی کو اپنی کتاب کا عنوان بنایا ہے جوان کی ادب فہمی اور دیدہ وری کی دلیل ہے۔

کتاب کے سرورق پر عظیم آباد کے تعلق سے غالب کا درج ذیل شعر درج ہے:

گفتمش چوں بود عظیم آباد　　گفت رنگیں تر از فضائے چمن

یہ شعر بھی فخر الدین عارفی کی شعر فہمی اور موقع شناسی پردال ہے۔

فلیپ پر اردو کے مشہور ادیب اور شاعر پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمان عطاء کاکوی کی عظیم آباد کے تعلق سے نہایت قیمتی رائے قلب ونظر کو مسرت اور طمانیت بخشتی نظر آتی ہے۔فرماتے ہیں:

''عظیم آباد کے تعلق سے اکثر مبصرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے بعد عظیم آباد اردو ادب کا تیسرا مرکز ہے۔لیکن اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ دلی کے بعد اردو کی مرکزی حیثیت لکھنؤ کو نہیں بلکہ عظیم آباد کو حاصل ہے۔تاریخ ادب اردو اس بات کی شاہد ہے کہ عظیم آباد میں جب شعر وسخن کی شمع روشن ہوئی تو اس وقت لکھنؤ میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور عظیم آباد کی اسی روشنی نے دیگر مقامات کے شعراء کو اتنا فریفتہ کیا کہ وہ پروانہ وار بہار کے مختلف مقامات میں ہجرت کر کے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔اشرف علی فغاں جو احمد شاہ بادشاہ دہلی کے دودھ بھائی تھے،عظیم آباد کو ہی اپنا مستقر بنا کر محفل سخن میں ظرافت کے پھول کھلاتے رہے اور اسی سرزمین میں پیوند خاک ہوئے۔میر انیس کے دادا میر حسن جو مثنوی سحر البیان کے مصنف تھے ان کے استاد بھی عظیم آباد کی ادبی فضا کو منور کرتے رہے اور یہیں ابدی نیند سو رہے ہیں۔اس طرح نہ جانے کتنے اہل قلم بہار کی ادبی محفلوں کو روشن کرتے رہے۔یہ وہ وقت تھا جب لکھنؤ گوشہء گمنامی میں تھا۔''

پروفیسر عطاء کاکوی کے اس بیان سے دبستان عظیم آباد کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور شاید یہی وہ بیان ہے جس سے تحریک پا کر فخر الدین عارفی کے ذہن میں دبستان عظیم آباد پر تحقیق کرنے کا خیال آیا ہوگا؟

تحقیق ایک مشکل ترین صنف ہے۔اس میں تنقید سے کہیں زیادہ محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔محقق کو ایک ایک لفظ کی تحقیق کے لیے ستر ستر کنویں جھانکنے پڑتے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ تنقید نگاروں کی بہ نسبت محققین کی تعداد بہت کم ہے۔

کتاب کے پیش لفظ میں فخر الدین عارفی نے ''دبستان کا تصور اور دبستان عظیم آباد'' کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ پیش کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''دبستان عظیم آباد کے پس منظر میں تاریخ،جغرافیہ اور تہذیب کے متعدد عوامل شامل ہیں جو اس

کواردو کاایک مستقل دبستان ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔‘‘

اس پیش لفظ کے علاوہ ایک اور مضمون ’’غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے‘‘ کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔اس مضمون میں فخر الدین عارفی نے دبستان عظیم آباد کی قدامت کے بارے میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔وہ جناب سید ابو طالب زیدی کے مضمون بعنوان ’’شاد کی غزل گوئی‘‘ کے حوالے سے یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ عظیم آباد اردو کا قدیم ترین دبستان ہے۔

اس مضمون کے آخر میں سلطان غزل، سلطان اختر کا ایک قطعہ درج ہے:

مخزن دیدہ ور عظیم آباد خوش نما سر بہ سر عظیم آباد
کل بھی اس کا وقار سر بہ فلک آج بھی معتبر عظیم آباد

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس میں بہار سے تعلق رکھنے والے 22 شعراء وادباء پر تحقیقی مضامین شامل ہیں جن کے نام نامی اسم گرامی درج ذیل ہیں۔

شعرائے کرام:

1۔مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی
.2راسخ عظیم آبادی
.3شاد عظیم آبادی
4۔فضل حق آزاد عظیم آبادی
5۔یگانہ چنگیزی
6۔سید شاہ حامد عظیم آبادی
7۔پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی
8۔علامہ جمیل مظہری
9۔علامہ سید شاہ فضل امام واقف عظیم آبادی
10۔مظہر امام
11۔سلطان اختر
12۔رمز عظیم آبادی
13۔پروفیسر لطف الرحمٰن
14۔شمیم فاروقی

15۔کیف عظیم آبادی

حصہ نثر میں درج ذیل ادیب شامل ہیں۔

16۔قاضی عبدالودود

17۔پروفیسر عبدالمغنی

18۔پروفیسر اختر اورینوی

19۔سہیل عظیم آبادی

20۔شکیلہ اختر

اورصحافت کے باب میں دوصحافیوں کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔

21۔حافظ سید محمد عمر فرید

22۔سید عبدالرافع

درج بالا سبھی مضامین نہایت عرق ریزی کے ساتھ لکھے گئے ہیں لہٰذا ان کی ادبی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔

علاوہ ازیں دبستان عظیم آباد کے تعلق سے تین اہم کتابوں ''دیدہ وران بہار''از پروفیسر عبدالمنان طرزی ''بہار کی بہار''از پروفیسر اعجاز علی ارشد اور''بہار میں تخلیقی نثر''از ڈاکٹر قیام نیر کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا۔یہ تینوں کتابیں اپنے موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں اوران کی مدد سے دبستان بہار کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

کتاب کے آخر میں ''اوراق پارینہ'' کے تحت ''اردو میں مشاعروں کی روایت'' اور ''عظیم آباد کا ایک یادگار مشاعرہ'' شامل ہیں۔دونوں مضامین دلچسپ اوراہم ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے نہ صرف منفرد ہے بلکہ اردو ادب میں ایک اہم اضافہ بھی ہے۔مزید برآں یہ ریسرچ اسکالرز کے لیے بھی اہمیت کی حامل ہے۔دبستان بہار کے تعلق سے ریسرچ کرنے والا کوئی بھی اسکالر اسے نظرانداز نہیں کرسکتا۔میں اس شاندار پیش کش پر جناب فخرالدین عارفی کو تہہ دل سے مبارک دیتا ہوں۔

◀● ▶

نام کتاب: کیسا انتظار

(افسانوں کا مجموعہ)

مصنفہ: پروفیسر افسانہ خاتون

(ریٹائرڈ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو، جے۔ڈی۔وومینس کالج، پٹنہ)

اشاعت:2024
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
صفحات:132
قیمت:200روپے
مبصر:اقبال حسن آزاد

پروفیسر افسانہ خاتون کا افسانوی مجموعہ ''کیسا انتظار'' اردو افسانے کے موجودہ منظر نامے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔مصنفہ نے اردو زبان وادب کی خدمت تدریس اور تحقیق دونوں سطحوں پر کی ہے،اوراب تخلیقی سطح پر بھی اُن کی یہ کاوش اُن کے وسیع مطالعے،حساس مشاہدے،اورنسائی شعور کی گہرائی کا مظہر ہے۔

یہ کتاب محض افسانوں کا مجموعہ نہیں بلکہ عصری معاشرت کے بدلتے ہوئے رویّوں،عورت کے داخلی وخارجی کرب،اور انسانی رشتوں کی ناپائیداری کی کہانی ہے۔

کتاب میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں،جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

قدآور، رقیہ باجی، بے نیاز،عطر دان، اجنبی،غلط ہی سہی، ایک اور قربانی، کوسی والی دادی، اونچی سطح،ایک ہی راز، کب آ وگے؟، انمول تجارت، لاچار،بجلیاں اور کیسا انتظار۔

ان عنوانات سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے انسانی زندگی کے مختلف رنگوں......محبت، رشتے،قربانی، بےبسی، وفا،اور سماجی تلخیوں کو اپنے قلم سے محسوساتی اور فکری انداز میں پیش کیا ہے۔

پروفیسر افسانہ خاتون کا اسلوب سنجیدہ،شگفتہ اور تاثراتی ہے۔ وہ واقعات کی سطح پر نہیں رکتیں بلکہ کرداروں کے اندرونی مکالموں اور نفسیاتی کیفیات کو نمایاں کرتی ہیں۔

ان کے افسانے عورت کی مظلومیت کے بجائے اُس کی انسانی حیثیت اور اخلاقی قوت کو اجاگر کرتے ہیں۔

''رقیہ باجی''، ''اجنبی'' اور ''ایک اور قربانی'' جیسے افسانے عورت کی قربانی،احساسِ ذمہ داری، اور سماجی جدوجہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں مکالمہ فطری اور رواں ہے، کہانی کی فضا میں ادبی لطافت اور جذباتی شدت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

''کیسا انتظار'' بطور عنوانی افسانہ ایک انتظار، محرومی، اور وقت کے بہاؤ کی تمثیل بن کر سامنے آتا ہے جو مجموعے کے مرکزی خیال کو سمیٹ لیتا ہے۔

افسانہ خاتون کی زبان سادہ مگر پُر اثر ہے۔ ان کے جملے چھوٹے مگر معنوی گہرائی رکھتے ہیں۔

مصنفہ نے روزمرہ کے الفاظ میں ادبی چمک پیدا کی ہے، جو قاری کو فنی لطف اور فکری تحرک دونوں عطا کرتی ہے۔

افسانوں میں منظر کشی اور علامتی اظہار کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ مثلاً ''بجلیاں'' میں جدید زندگی کے شور اور عدمِ سکون کی علامتی پیشکش، یا ''اونچی سطح'' میں طبقاتی تقسیم کے خلاف لطیف احتجاج۔

پروفیسر افسانہ خاتون کا قلم نسائی شعور سے مزیّن ہے مگر وہ نسائیت کو کسی نظریاتی نعروں تک محدود نہیں کرتیں۔ ان کے کردار عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مکمل انسان کے طور پر ابھرتے ہیں۔

وہ دکھ سہتے ہیں، مگر ٹوٹتے نہیں؛ ان میں نرمی بھی ہے اور وقار بھی۔

''کیسا انتظار'' ایک علامتی عنوان ہے، جو انسانی زندگی کی اُس دائمی کیفیت کی نمائندگی کرتا ہے جہاں خواہشیں، خواب، اور رشتے ہمیشہ کسی انتظار میں رہتے ہیں............ کبھی محبت کے، کبھی انصاف کے، کبھی سکون کے۔

سرورق پر رنگوں کی آمیزش، چہروں کے دھندلے عکس، اور ایک ہاتھ کی تصویر گویا انسان کی بے بسی اور جذباتی کثافت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ بصری علامتیں کتاب کے تخلیقی مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔

''کیسا انتظار'' اردو افسانے کی اُس روایت سے جڑا ہوا ہے جسے عصری حسیت اور اخلاقی آگہی نے مستحکم کیا ہے۔

یہ کتاب نہ صرف ادبی حلقوں کے لیے بلکہ عام قارئین کے لیے بھی دلچسپی رکھتی ہے، کیونکہ اس میں روزمرہ زندگی کی سچائیاں فنی مہارت سے پیش کی گئی ہیں۔

''کیسا انتظار'' ایک حساس، فکری اور سماجی سطح پر بیدار ذہن افسانہ نگار کی تخلیق ہے۔

پروفیسر افسانہ خاتون نے اپنے افسانوں میں زندگی کی تلخیوں، محبت کی روشنیوں اور عورت کی داخلی طاقت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری ہر صفحے پر خود کو کسی نہ کسی کردار میں پہچان لیتا ہے۔

یہ مجموعہ اپنے فنی معیار، نسائی احساس اور سماجی بصیرت کے باعث اردو فکشن میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

صفدر امام قادری کے شخصی نقوش: ایک تبصرہ

مبصر: فرحت صغیر

کتابوں کی بھیڑ میں اِن دنوں کئی بار اچھی کتابیں نظر سے غائب ہو جاتی ہیں اور معمولی کتابیں بہ وجوہ بازار کے جبر سے میدان میں دھماچوکڑی مچاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مارکٹ اکانومی کے اِس دور میں ایسی اُتھل پتھل ہر جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایسے میں جب کبھی ہماری نگاہ کسی کتاب پر ٹھہر جائے اور ہمارا ذہن اس کے ارد گرد گھومنے لگے تو یہ واقعی خوشی کی بات ہوتی ہے۔ گذشتہ دنوں ایسی ہی ایک کتاب نظر سے گزری۔ ''صفدر امام قادری: شخصی نقوش'' جسے ممتاز محقق اور رباعی گو، ظرافت نگار اور ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ادیب ڈاکٹر ظفر کمالی نے مرتّب کیا ہے۔ ۶۰۸ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب ترتیب و تدوین کے اعلا اصولوں کے ساتھ نہایت عالمانہ سلیقے کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

صوبۂ بہار کے جن اردو اساتذہ اور ادبا کی خدمات کا بالعموم قومی سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے، ان میں صفدر امام قادری سرِ فہرست ہیں۔ وہ نقاد اور محقق، صحافی اور خاکہ نگار، سفرنامہ نویس اور مترجم کی حیثیت سے نمایاں خدمات پیش کرنے کی وجہ سے گذشتہ چار دہائیوں میں اعتبار کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ اِس سے الگ اردو درس و تدریس کے عمومی کاموں کے ساتھ مقابلہ جاتی امتحانات میں شامل ہونے والے طلبہ و طالبات کی رہنمائی میں انھوں نے اتنی کامیاب کوششیں کی ہیں جس کا مدِّ مقابل ملک میں شاید ہی کوئی دوسرا اردو استاد ہو۔ جس شخص کی اس قدر ہمہ جہت خدمات ہوں، اس کے حوالے سے مکمل کتاب کی اشاعت ایک نیک فال ہے۔

جب کسی کتاب کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری کسی اہم محقق نے اٹھائی ہو تو علمی اعتبار سے ایک معیاری کارکردگی کے مظاہر اپنے آپ چلے آئیں گے۔ یہ کتاب صفدر امام قادری کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر محیط ہے۔ مرتّبِ کتاب نے یہ حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا کہ صفدر امام قادری کی ادبی حیثیت پر اس کتاب میں ایک بھی تنقیدی مضمون شامل نہیں ہے۔ اس سے یہ اندازہ اپنے آپ ہو جاتا ہے کہ اِس کام کے لیے الگ سے مکمل کتاب چھپ کر سامنے آئے گی۔ ''غبارِ خاطر'' میں ابوالکلام آزاد نے حبیب الرحمان خاں شروانی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ یہ نجی خطوط ہیں اور سیاست کی چھلنی سے چھان کر خاص اُن کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔ اُسی طرح ڈاکٹر ظفر کمالی نے اس کتاب کو ادبی اور علمی خدمات کی چھلنی سے چھان کر صرف صفدر امام قادری کی شخصیت کے ذرّوں اور ستاروں کو سمیٹنے کی ایک مہم شروع کی ہے۔ اس مہم کی کامیابی اِس کی بھرپور ضخامت بھی ہے جس میں چھوٹی بڑی اکیاون تحریریں میں مختلف ابواب کے

عنوانات کے تحت سجائی گئی ہیں۔ فی زمانہ ہماری نگاہ ایسی کسی دوسری کتاب پر نہیں ٹکتی ہے جس میں کسی استاد کی خدمات کو شخصی حوالے سے اس قدر شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ اِس پیش کش میں ادیب اور صحافی، استاد اور شاگرد، عورت اور مرد، نو آموز اور کہنہ مشق، ملکی اور غیر ملکی سب طرح کے لوگوں کا جمِ غفیر ہے۔ کہنا چاہیے کہ کتاب کے مرتّب نے اس بات کا خصوصی التزام رکھا ہے کہ صفدر امام قادری کی شخصیت کی پرتوں کو کھولتے ہوئے ہر طبقے کی کاوشیں منظر عام پر آجائیں۔ اِس سے ایک Cross Sectional Examination کا اندازِ نظر ابھرتا ہے جو اِن دنوں کسی بھی شخصیت کے سلسلے سے شائع ہونے والی کسی کتاب میں ہونا ہی چاہیے۔ اِس سے اِس کتاب کی رنگا رنگی میں اضافہ ہوا ہے اور قارئین کے دوران یکسانیت سے بدحظ بھی نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے اس کتاب کے مضامین ہم پڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور صفدر امام قادری کی شخصیت کے ایک ایک پہلو اپنے آپ روشن ہو جاتے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں ظفر کمالی نے دس صفحات پر مشتمل ایک مختصر سا ''عرضِ مرتّب'' لکھا ہے جس میں کتاب کے اکثر وبیش تر مضامین کی شمولیت کا جواز پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے مختلف ابواب کے حوالے سے انھوں نے کلیدی اشارے فراہم کر دیے ہیں جن سے پڑھنے والے کو ایک ایک تحریر کا تناظر کھُل کر سامنے آجاتا ہے۔ ظفر کمالی نے یہاں دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر آزمایا ہے اور کتاب کے پڑھنے والوں کے لیے طول طویل مقدمہ لکھ کر کسی طرح کی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہونے دی ہے۔ قارئین اپنے طور پر فیصلہ کر لیں کہ اِن مضامین میں صفدر امام قادری کی زندگی کے کون سے پہلو سامنے آئے ہیں۔ اس اَمر کا وہ آزادانہ تجزیہ بھی کریں۔ مرتب کی حیثیت سے ظفر کمالی کی یہ حکمتِ عملی نہایت موزوں ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے کس طرح غور وفکر کر کے اس کتاب کے متفرق مضامین کو ایک لڑی میں پرونے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

اس کتاب کا پہلا حصہ صفدر امام قادری کے دو مضامین سے آراستہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مضمون اِس کتاب میں شامل نہیں ہیں۔ اُن کے کچھ خطوط اور انٹرویو میں سوالات کے جوابات کے بہانے ان کی باتیں براہِ راست زبان وقلم کے حوالے سے سامنے آتی ہیں۔ ''جیسا سیکھا، جو کچھ پڑھایا'' عنوان سے صفدر امام قادری کا مضمون اس کتاب کا افتتاحیہ ہے۔ بائیس صفحات پر مشتمل یہ مضمون اِس کتاب اور موضوع میں داخلے کا وہ دروازہ ہے جس سے گزر کر آپ کتاب اور موضوعِ کتاب کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں۔ یہاں صفدر امام قادری نے اپنی تدریسی زندگی کی روداد لکھی ہے۔ وہ چاہتے تو کامیابی کے بڑے بڑے ستون پر زیادہ توجہ دیتے مگر انھوں نے اس روداد میں اوّلاً اپنے اساتذہ اور تربیت کرنے والوں کا ذکر کیا، پھر اسکول، کالج اور یونی ورسٹی کے ماحول سے گزرتے ہوئے اپنی تقرری، مقابلہ جاتی

امتحانات کے طلبہ کی تدریس میں اختصاص جیسے موضوعات پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ درس و تدریس کے ساتھ انھوں نے تصنیف و تالیف پر کسی طرح توجہ کی اور تمام کاموں میں کس انداز سے توازن قائم کیا، اِس کی تفصیل بھی یہاں شامل ہے۔ صفدر امام قادری نے اپنی زبان سے زندگی کا جو لیکھا جوکھا پیش کیا ہے، وہ غرور و تمکنت اور بڑبولے پن سے مبرا ہے۔ ایسی تحریروں میں عام طور سے بے احتیاطی ہو جاتی ہے اور تفخر کا زور بڑھنے لگتا ہے۔ انھوں نے اس روداد میں کمال انکساری سے اپنی زندگی کے واقعات کو چلتی ہوئی فلم کی طرح دکھا دیا ہے جس میں اُن کی شخصیت کی علمی اور شخصی ترجیحات اور توجہات کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ اسی حصّے میں ایک مختصر سی تحریر ''میری کالم نویسی'' کے عنوان سے بھی شامل ہے جس میں صفدر امام قادری کی صحافیانہ دل چسپیوں کی تاریخ چند صفحات میں سمٹ کر سامنے آگئی ہے۔ اِس مضمون سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ صحافت سے ان کا رشتہ کس قدر پرانا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں صحافتی کوچوں کی سیر اانھوں نے اسکول کے زمانے سے شروع کر دی تھی۔

اس کتاب میں چار خاکے شامل ہیں۔ تین صفدر امام قادری کے اور چوتھا بیگم صفدر امام قادری کا خاکہ ہے جو ظفر کمالی نے لکھا ہے۔ مرحوم مرزا کھونچ نے ۲۳ جنوری ۱۹۹۸ء کے لکھے اپنے خاکے میں صفدر امام قادری کو ایک پہلودار شخصیت کا مالک تسلیم کیا ہے۔ اِس میں ان کی ابتدائی زندگی کی بہت ساری جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مرزا کھونچ نے صفدر امام قادری کی نشو و نما اور شخصیت کے ابتدائی نقوش کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مختصر سی تحریر ایک عام بچّے کی شعر و ادب کے کوچے میں داخلے کی روداد فراہم کرتی ہے۔ دوسرا خاکہ معروف ناول نگار اور خاکہ نگار غضنفر کا لکھا ہوا ہے جس کا نہایت دل پذیر عنوان ''سیانا مجذوب'' رکھا گیا ہے۔ غضنفر نے صفدر امام قادری کی شخصیت میں موجود تنقیدی جراثیم اور بے باکی کے عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں خاکہ لکھا ہے۔ خاص طور سے مختلف مواقع سے صفدر امام قادری کی جواُن سے ملاقاتیں رہیں، اُن کی کبھی افسانوی اور کبھی ظریفانہ تصویر کشی سے خاکے میں رنگ بھرا گیا ہے۔ محض چند واقعات کا ذکر ہے مگر اِس سے صفدر امام قادری کی شخصیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔

مرتبِ کتاب ظفر کمالی ایک محقق، نقاد، شاعر تو ہیں ہی، اسی کے ساتھ وہ ظرافت نگار اور خاکہ نگار بھی ہیں۔ انھوں نے اِس میں اپنے جو دو خاکے شامل کیے ہیں، ان کی تفصیل کا اِس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اِن پر کتاب کے باون صفحات خرچ ہوئے ہیں۔ یہ دونوں خاکے نہ ہوتے تو کتاب آدھی ادھوری معلومات میں ہی قید ہو جاتی۔ جب اِن خاکوں کو پڑھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ظفر کمالی نے نہایت اختصار کے ساتھ زندگی کے جانے اَن جانے سیکڑوں پہلوؤں کو اِن دونوں خاکوں میں قید کر لینے میں کامیابی پائی ہے۔ جتنی وسیع

وعریض دنیا کوظفر کمالی نے اِن دونوں خاکوں میں سمیٹنے میں کامیابی پائی ہے، واقعتاً انھوں نے دریا کوکوزے میں بند کردیا ہے۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ صفدر امام قادری کی شخصیت اور اُن کے کارناموں کے ان تمام پہلوؤں کووہ پیش کر دینا چاہتے ہیں جن سے اُن کی پہچان متعین ہوتی ہے۔ یہاں ایک طرف ذاتی تجربات کی آنچ محسوس کی جا سکتی ہے تو دوسری طرف مشاہدے کی قوّت اور شخصیت کے تشکیلی عناصر کو واضح کر دینے کی کامیاب کوشش ہوئی ہے۔ظفر کمالی نے بیگم صفدر امام قادری کا جو خاکہ لکھا ہے، وہاں بھی ان کا ایک مقصد اندرونِ خانہ کے دریچوں سے صفدر امام قادری کی شخصیت کو اُبھارنا ہے۔شاید اس خاکے کی شمولیت کا یہ کھلا جواز ہے۔

اس کتاب میں ''عنایات بزرگاں'' عنوان سے چھے مضامین شامل کیے گیے ہیں۔ یہ تمام مضامین شخصیت شناسی کے زمرے میں آتے ہیں۔ خاص طور سے ابتدائی دو مضامین صفدر امام قادری کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایسا ذریعہ ہیں جن کا کوئی بدل ممکن نہیں۔مولانا علی الیاس عاجز صفدر امام قادری کے اسکول کے استاد رہے ہیں۔انھوں نے عہدِ طفولیت سے عہدِ شباب کے دور کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسا مضمون لکھ دیا ہے جس میں اسکول کے دور سے لے کر گذشتہ زمانے تک صفدر امام قادری ایک زندہ کردار کی شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔اسی طرح صفدر امام قادری کے بڑے بھائی اور مشہور شاعر ظفر امام کا مضمون بہ عنوان ''صفدر امام قادری: میرا فخر'' لکھا ہے۔سولہ صفحات میں انھوں نے پانچ ، چھے دہائیوں کی زندگی کو اپنے تاثرات ، مشاہدات اور تحلیل و تجزیے سے روشن کر دیا ہے۔اسی کے ساتھ قاسم خورشید، سہیل انجم، ریحان غنی اور اقبال حسن آزاد کے خاکے بھی صفدر امام قادری کی شخصیت کے کسی نہ کسی ایسے گوشے کو واضح کرنے میں کامیاب ہیں جنھیں جانے اور سمجھے بغیر شخصیت کی بنیادوں کو واضح نہیں کیا جا سکتا۔

صفدر امام قادری کی شخصیت کے حوالے سے ظفر کمالی کی ایک سو پچاس رباعیات ''سوغات'' عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئی تھیں۔ان رباعیات میں صفدر امام قادری چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ان رباعیات کی بنیاد پر معروف ماہر لسانیات پروفیسر علی رفاد فتیحی اور ڈاکٹر امتیاز وحید کے مضامین شامل کیے گیے ہیں۔ دونوں مضامین حقیقت میں ان رباعیات کے بطن سے ابھرتے ہوئے صفدر امام قادری کے اُس چہرے کو پیش کرنے کی کوشش ہیں جسے قارئین کو ضرور جاننا چاہیے۔ پروفیسر فتیحی کا مضمون مختلف شخصی اعمال کی مثالی صورتِ حال سے موازنہ اور مطابقت قائم کرنے کی بہترین کوشش ہے۔اسی طرح امتیاز وحید نے اُن رباعیات میں صفدر امام قادری کی شخصیت کے اوصاف کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اِس کتاب کا ایک باب 'حلقۂ احباب کی محبتیں' عنوان سے شامل ہے جس میں آٹھ لوگوں کے مضامین ہیں۔ایس۔اے۔شکیل، سہیل وحید، واحد نظیر، محمد ذاکر حسین ،نوشاد احمد کریمی، نظام الدین احمد، غلام

مولا اور حفصہ اختر کے مضامین شخصیت کے بہت سارے نئے پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں کامیاب ہیں۔ ایس۔اے۔شکیل، صفدر امام قادری کے اسکول کے ہم جماعت ہیں، انھوں نے اپنے مختصر مضمون میں بہت محبت سے صفدر امام قادری کی شخصیت کی خصوصیات کو واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل وحید نے اب سے تیس، پینتیس برس پہلے کے شہرِ پٹنہ اور اُس زمانے میں ادبی شخصیت کی نشو ونما اور علمی اعتبار سے دن بہ دن مستحکم ہوتی شخصیت کو اُجاگر کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ واحد نظیر نے صفدر امام قادری سے اپنے تعلقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے زندگی کے مختلف مواقع سے بہت سارے نشیب و فراز کو واضح کرنے کی مشقت اٹھائی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین ندوی کے مضمون کا عنوان ہے۔ ''اک مردِ قلندر ہمہ اوصاف یگانہ''۔ انھوں نے عظیم آباد کی بہت ساری محفلوں میں صفدر امام قادری کی بااثر موجودگی کی آنکھوں دیکھی تفصیل بتائی ہے۔ انھوں نے مختلف سے می ناروں کے دوران عظیم آباد میں اُبھر رہی نسل نو میں کس طرح صفدر امام قادری نے اپنے پَر پھیلائے، اِس کے احوال واضح کیے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ صفدر امام قادری نے اپنی تدریس سے کس طرح بہترین نتائج پیش کیے ہیں اور بہار کے اردو طالب علموں کو قومی سطح پر پہنچانے میں ان کی کیسی خدمات ہیں؟ نوشاد احمد کریمی، نظام الدین احمد کے مضامین بھی ان کی شخصیت کے بہت سارے گوشوں کو اُبھارنے میں کامیاب ہیں۔

اس کتاب میں ڈھاکا یونی ورسٹی، بنگلا دیش کے دو اساتذہ کے مختصر مضامین بھی شامل ہیں۔ موجود صدرِ شعبۂ اردو پروفیسر غلام مولا نے صفدر امام قادری کی شخصیت میں موجود بعض انسانی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اِس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ صفدر امام قادری نے بنگلا دیش کے مختلف سے می ناروں میں اپنی علمی موجودگی سے پروگرام کے مندوبین کو بہت فائدہ پہنچایا۔ ان کی راست گوئی اور علمی موضوعات پر گہرائی سے گفتگو کرنے کے انداز سے وہ بہت متاثر ہیں۔ پروفیسر حفصہ اختر نے مختلف کانفرنسوں میں صفدر امام قادری سے اپنی ملاقاتوں کے تذکرے کے ساتھ بنگلا دیش کے سفرنامے کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے مذکورہ سفرنامے کو ہندستان اور بنگلا دیش کے بیچ خیر سگالی کے جذبے کو فروغ دینے کا ایک ذریعہ مانا ہے۔ انھوں نے ذاتی گفتگو اور سے می نار کے مختلف جلسوں میں صفدر امام قادری کی علمی باتوں کی بنیاد پر انھیں اردو کا ایک جیتا جاگتا انسائیکلوپیڈیا تسلیم کیا ہے۔ ان دونوں مضامین کی شمولیت سے اِس کتاب کے دائرۂ کار میں وسعت آ گئی ہے۔

اس کتاب کے دو ابواب خاص طور سے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جن میں صفدر امام قادری کے پرانے اور نئے شاگردوں کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ دونوں حصوں میں گیارہ گیارہ مضامین موجود ہیں۔ کچھ نے اختصار کے ساتھ لکھا ہے تو کچھ نے تفصیل سے اپنے تجربات و مشاہدات درج کرائے ہیں۔ اس کتاب کے یہ دونوں حصّے دلچسپ، سب سے زیادہ Live اور Moving معلوم پڑتے ہیں۔

اگر یہ مضامین نہ ہوتے تو صفدر امام قادری کی شخصیت کے درجنوں پوشیدہ پہلو ہماری آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح روشن نہ ہو پاتے۔ مرتّبِ کتاب علمی دنیا کی جانب سے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کیوں کہ انھوں نے اتنی بڑی تعداد میں صفدر امام قادری کے شاگردوں کے مضامین شامل کر کے اردو دنیا کو ایک دلچسپ تحفہ فراہم کر دیا ہے۔ میری دانست میں اردو کے کسی استاد پر فی زمانہ ایسی کوئی کتاب سامنے نہیں آئی جس میں اُن کے شاگردوں کی اتنی بڑی تعداد میں تحریریں شامل ہوں۔ اِن مضامین میں محض رسمی باتیں نہیں ہیں بلکہ ہر مضمون شخصیت کے کسی نہ کسی خاص پہلو کو واضح کرنے میں کامیاب ہے۔ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ترتیب و تدوین کے مرحلے میں ظفر کمالی صاحب نے دہراو کو کم کیا ہوگا اور ہر مضمون کے کسی انوکھے اقتباس کو اُبھارنے کی کوشش کی ہوگی۔

''اظہارِ عقیدت'' کے عنوان سے اولاً جو گیارہ مضامین شامل ہیں، وہ سب پرانے شاگردوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اِن میں افسر بھی ہیں، یونی ورسٹی کے اساتذہ اور اسکول کے کچھ استاد بھی شامل ہیں۔ بعض ایسے ہیں جنھوں نے بیس، پچیس برس پہلے صفدر امام قادری کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا تھا۔ اِس طرح ان کی یادوں میں بسی ہوئی اپنے استاد کی شبیہ، صفحۂ قرطاس پر اُتر آئی ہے۔ انڈین ریلوے سروس کے سینیر افسر جناب تنویر حسن نے اپنے مضمون میں یہ بتایا ہے کہ وہ اُن کی زندگی کے لیے فرینڈ، فلاسفر اور گائڈ کی طرح سے سامنے آئے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ایک مختصر مدّت میں سول سروس کے نصاب کو پڑھنا اور امتحان کو پاس کرنا ایک الگ کام تھا مگر صفدر امام قادری نے ان کے اندر ایک ایسا ادبی شعور پیدا کر دیا جو آج بھی اُن کے لیے بہت اہم ہے۔ انھوں نے صفدر امام قادری کی تصنیفی اور انتظامی حیثیت پر بھی نظر ڈالی ہے اور یہ بتانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ کس طرح انھوں نے اپنی علمی شخصیت کے دائرۂ کار کو وسعت بخشی۔ انھوں نے باتوں باتوں میں صفدر امام قادری کے تصوّرِ سماج اور محروم طبقات کے تئیں ان کے ہمدردانہ جذبات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مضمون میں یکسر ایک نئے پہلو کو واضح کر دیا ہے۔

حکومتِ بہار کے سینیر افسر جناب جاوید اقبال نے اپنے تعلیمی سفر کے ساتھ ساتھ استاد کی حیثیت سے صفدر امام قادری کی گوناگوں خدمات کو اُبھارا ہے۔ انھوں نے تصنیف و تالیف میں مستعدی، شاگردوں کو حقیقی تعلیم سے آراستہ کرنا اور مختلف طرح کی ادبی اور علمی سرگرمیوں میں طلبہ کو شامل کر لینے کے انداز کو سب سے زیادہ پسند کیا ہے۔ شعبۂ اردو مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا کی استاد ڈاکٹر ترنم جہاں نے اپنے تفصیلی مضمون میں تقریباً دو دہائیوں کے واقعات بیان کرتے ہوئے صفدر امام قادری کی ایک زندگی بداماں تصویر تیار کر دی ہے۔ اِس میں استاد کی اعلیٰ اقدار کے ساتھ ساتھ تعلیم و تدریس کی ہمہ جہت سرگرمیوں کا

تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ جگہ جگہ واقعات کی نیم ظریفانہ پیش کش سے ترنم جہاں نے ایک خوش گوار ماحول تیاّر کر دیا ہے۔ انھوں نے صفدر امام قادری کی تدریس کی صفات واضح کرتے ہوئے ان کی محنت، خود سپردگی اور پابندی وقت کو کلیدی اہمیت عطا کی ہے۔ ان کے مضمون میں صفدر امام قادری کی تعلیمی و تدریسی تکنیک اور نئے انداز و اطوار سے پڑھانے کے طور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اے۔ این۔ کالج، پٹنہ کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر منی بھوشن کمار نے اپنے مضمون کے عنوان میں صفدر امام قادری کو ''استاد و محرک'' کہا ہے۔ تقریباً پچیس برس کے تعلق کو مختصر سے مضمون میں انھوں نے خوب خوب واضح کیا ہے۔ انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ شہر میں علمی و ادبی سرگرمیوں میں شمولیت، مضمون نویسی کی طرف توجہ اور نئی نئی کتابوں کے مطالعے کے لیے شوق پیدا کرنے کے سبب صفدر امام قادری کو ''اردو زبان و ادب کا کارپوریٹ استاذ'' قرار دیا ہے۔ اس کی صراحت میں انھوں نے یو۔ جی۔ سی۔ نٹ اور سول سروس یا دیگر مقابلہ جاتی امتحانات کی نہایت مختصر مدّت میں طلبہ کی عملی رہنمائی جیسے امور پر اختصار کے ساتھ کارآمد گفتگو کی ہے۔ اِس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اُن کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں صفدر امام قادری کی شخصیت کا بڑا حصہ ہے۔

رانچی، جھارکھنڈ سے تعلق رکھنے والے اور فی الوقت بھاگل پور یونی ورسٹی میں فائز ڈاکٹر تسلیم عارف کے مضمون کا عنوان ہے: ''صفدر سر اور اُن کا طریقۂ تدریس''۔ یہ مضمون اِس کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون کے ایک بڑے حصّے کو رواں تبصرے (Running Commentary) کی طرح پیش کیا ہے۔ کبھی صفدر امام قادری بچوں سے سوال کرتے ہیں، کبھی سوالات کے جواب سامنے آتے ہیں، کبھی بحث و مباحثہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، کبھی تناو کا ماحول ہوتا ہے تو کبھی خوش گوار کیفیت کے واقعات کے درمیان اپنے آپ ایک ایسی ٹھوس تدریسی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر تسلیم عارف نے اپنے مضمون میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا ہے کہ صفدر امام قادری اپنے شاگردوں کی ادبی و علمی تربیت بڑے اِنہماک سے کرتے ہیں۔ یہ تربیت ہمہ جہت ہوتی ہے۔ انھوں نے مختلف مواقع سے دیگر اساتذہ سے تقابُل بھی کیا ہے اور اس میں صفدر امام قادری کا اختصاص اُجاگر کیا ہے۔

ڈاکٹر نکہت پروین، ڈاکٹر سرتاج سبحانی، ڈاکٹر محمد عبدالرحمان ارشد اور راج دیو کمار کے مضامین اپنے اپنے تجربوں کی بنیاد پر صفدر امام قادری کے تدریسی انداز کو سمجھنے کے لیے کارگر ذریعہ ہیں۔ سب نے اپنے اپنے تجربوں کی بنیاد پر اپنے نتائج اخذ کیے ہیں۔ یہ مضامین حقیقت میں الگ الگ زاویوں سے صفدر امام قادری کی شخصیت اور ان کے ادبی و تدریسی کارناموں کو سمجھنے میں مددگار ہیں۔

شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی کی استاد ڈاکٹر افشاں بانو نے ''کتابِ زندگی کا اشتراک'' عنوان نے جو مضمون لکھا ہے، اس میں اپنی تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے استاد کی خصوصی توجہ کا بیان موجود ہے۔ اِس مرحلے میں انھوں نے مختلف اسفار اور ادبا و شعرا سے استاد کے حوالے سے ملاقاتیں اور قومی یا بین الاقوامی سے می ناروں میں شمولیت وغیرہ کو اپنے لیے نیک فال سمجھا ہے۔ ناظرین عشرت نے اعلا تعلیم کی جدو جہد میں صفدر امام قادری نے اُن کی کس طرح رہنمائی کی، اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ادب اور شاعری کی تعبیر وتشریح کے لیے جو نکات انھوں نے سیکھے، اُس کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔

اس کتاب میں ''گل ہائے عقیدت'' عنوان سے گیارہ نئے شاگردوں کے مضامین شامل کیے گیے ہیں۔ یہاں نئے سے مراد ایسے شاگرد ہیں جو گذشتہ ایک دہائی میں صفدر امام قادری کے درس میں شامل ہوئے۔ جھارکھنڈ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمد مرشد کا تفصیلی مضمون ''شہہ سوارِ علم و ادب: استاد صفدر امام قادری'' کے عنوان سے شامل ہے۔ انھوں نے اِس بات پر خصوصی توجہ دی ہے کہ صفدر امام قادری کی تعلیمی و تدریسی روٹین صبح سے شام تک کس طرح آراستہ ہوتی ہے۔ انھوں نے تدریس کے علاوہ سفر اور ادبی پروگراموں میں شرکت کے احوال بھی لکھے ہیں۔ اجمیر شریف، آگرہ، حیدرآباد اور جے پور جیسے شہروں میں استاد کے ساتھ ٹورسٹ بن کر تاریخی وتہذیبی مقامات کی سیر کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے۔ ڈاکٹر شبنم پروین نے اپنے مضمون میں انھیں ایک مشفق استاد قرار دیا ہے۔ محترمہ شگفتہ ناز نے اپنے مضمون کا عنوان جاں نثار اختر کے ایک شعر سے چُنا ہے: ''یہ علم کا سودا، یہ رسالے، یہ کتابیں''۔ انھوں نے دس برس کی مدّت میں اپنے تجربات کی بنیاد پر جو تفصیل لکھی ہے وہ کسی دوسرے مضمون میں دستیاب نہیں۔ استاد کی چاے نوشی اور خورد و نوش کے امور میں انھوں نے استاد کی خصوصی دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے۔ تصویر کشی اور لباس کے انداز پر اُن کی توجہ کے بارے میں بھی انھوں نے لکھا ہے۔ استاد کی ذاتی زندگی کے بعض احوال بھی انھوں نے انٹرویو کی بنیاد پر درج کیے ہیں۔ محترمہ ناز یہ تبسم، محمد شوکت علی اور محمد عامر کے مضامین بھی ذاتی تجربات کی بنیاد پر مکمل ہوئے ہیں۔

شعبۂ اردو جے پرکاش یونی ورسٹی، چھپرا کے ریسرچ اسکالر اور اُبھرتے ہوئے ادیب محمد مرجان علی کے مضمون کا عنوان ''ہمہ وقت ادیب اور استاد: صفدر امام قادری'' معنویت اور بلاغت کے اعتبار سے بے حد توجہ طلب ہے۔ گذشتہ چار پانچ برسوں میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے دوران انھوں نے درس و تدریس، سے می ناروں میں شرکت، مقالہ نویسی اور طرح طرح کے ادبی وعلمی کاموں میں استاد کے ساتھ سایہ بن کر اپنی زندگی کو کس طرح کامیابی کے ساتھ بدلا ہے، اس کی تفصیل انیس صفحات کے اِس مضمون

میں شامل ہوئی ہے۔طلبہ کی خبر گیری،انھیں تکنیکی مہارتوں سے لیس کرنے کی فکراور ہمہ وقت درس وتدریس کے ماحول کوقائم رکھنے کی صلاحیت کےسلسلے سے استاد کی مہارت کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔محمد ابورافع نے ایک عام طالب علم سے مضمون نگار بن جانے کی کہانی کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ابورافع نے درس و تدریس کے علاوہ اپنے استاد کے بعض شخصی اوصاف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔محترمہ شاذیہ حسن نے صفدر امام قادری کو''ایک ہمہ جہت شخصیت'' قرار دیا ہے۔انھوں نے استاد کی شاگردوں کی کار باری اور ذاتی زندگی کے مسائل میں خصوصی دلچسپی لے کرانھیں حل کرنے کی بات کو اہمیت دی ہے۔مزاج کی شگفتگی اور ساتھ ہی ساتھ دوٹوک انداز کو انھوں نے اپنے مضمون میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔محترمہ ناہید پروین نے اپنے مختصر مضمون میں کم وقت میں اپنی ادبی اور تعلیمی ترقی کے لیے استاد کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے استاد کی شخصیت کے بعض خاموش پہلوؤں پر بھی چند الفاظ رقم کیے ہیں جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ محترمہ کی نگاہ کتنی باریک ہے۔

اس کتاب میں صفدر امام قادری کے دو انٹرویوز شامل ہیں۔ پہلا انٹرویو مشہور ڈرامہ نگار کینیڈا میں مقیم جناب جاوید دانش کا کورونا کے دور میں آن لائن لیا گیا انٹرویو ہے جسے محمد مرجان علی نے ٹیپ سے قلم بند کیا ہے۔اسی طرح دوسرا انٹرویو معروف نقاد ڈاکٹر امتیاز وحید کا بالمشافہ گفتگو ہے۔دونوں انٹرویوز سے صفدر امام قادری کی شخصیت اور ادب وسماج کے تعلق سے اُن کے تصورات اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ پچاس صفحات میں پھیلے یہ دونوں انٹرویوز اِس بات کا مظہر ہیں کہ زندگی،ادب اور سماج کے معاملات پر وہ دو ٹوک اظہارِ خیال کرتے ہیں۔اِن انٹرویوز سے صفدر امام قادری کا سوچتا ہوا ذہن اور بہت سارے امور پر اُن کے خاص خیالات اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔اکثر سوالوں کے جواب غیر رسمی ہیں اور بہت بار یہ جوابات ہمیں اندر سے خبر دار کرتے ہیں۔ادبی اور تعلیمی معاشرے پر اُن کے تصورات ہمیں بار بار چونکاتے ہیں۔ اِن انٹرویوز سے یہ بات بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ صفدر امام قادری کے ذہن میں کام کرنے کے بہت سارے منصوبے ہیں اور وہ اُن پر حسبِ موقع عمل پیرا رہتے ہیں۔مرتب نے اِن دونوں انٹرویوز کو شامل کر کے پڑھنے والوں کے لیے بہت ساری کار آمد باتیں جمع کر دی ہیں۔

۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۸ء کی ایک دہائی میں لکھے گئے ظفر کمالی کے نام چھوٹے بڑے ۴۵ خطوط جو اُس دوران صفدر امام قادری نے لکھے تھے،انھیں ظفر کمالی نے محفوظ رکھے تھے۔انھوں نے کوئی ستّر صفحات ایک مختصر تعارف کے ساتھ پیش کر دیے ہیں۔ان خطوط میں ظفر کمالی کے ذریعہ مختصر حواشی بھی لکھے گئے ہیں۔ اِن خطوط کا تعارف کراتے ہوئے ظفر کمالی نے لکھا ہے:

''صفدر امام قادری ۱۹۸۶ء میں پٹنہ آئے تھے اور میں نے ۱۹۹۰ء میں پٹنہ کو خیر باد کہا۔ ان سے میرے روابط ۱۹۸۷ء کے بعد ہوئے۔ تقریباً چونتیس برسوں کے عرصے میں ہم وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کو خطوط لکھتے رہے۔ کاغذات کے ذخیرے کو کھنگالنے پر میرے نام ان کے چوّن خطوط دستیاب ہوئے۔ میں نے انھیں حزم واحتیاط سے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ چند جگہوں پر حواشی بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے ہمارے درمیان ادبی روابط کا قدرے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں مکتوب نگار کی زندگی کی پرچھائیاں بھی نظر آئیں گی اور ادبی منصوبہ سازی کی تصویریں بھی۔ صفدر دوستوں کی دلداری کا کتنا خیال رکھتے ہیں اور ان کا انداز کیسا بچھ جانے والا ہوتا ہے، اس کے واضح اشارے بھی یہاں موجود ہیں۔ ان کی خوشیوں اور زندگی کی محرومیوں کا تذکرہ بھی جا بجا بکھرا ہوا ہے، اس سے ان کی زندگی کے بعض گوشوں اور شخصیت کی عقدہ کشائی میں مدد مل سکتی ہے''۔

جناب عبدالوہاب قاسمی نے ''صفدر امام قادری کی تصنیفات وتالیفات: ایک تعارف'' میں صفدر امام قادری کی تمام مطبوعہ کتابوں کا اختصار کے ساتھ تعارف پیش کیا ہے۔ تحقیقی اعتبار سے اِس مضمون کی خاص اہمیت ہے۔ پہلے حصّے میں انھوں نے تخلیقی وصحافتی ادب کے تحت صفدر امام قادری کی چار کتابوں کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرے حصّے میں تنقیدی کتب کے طور پر سات کتابوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ تیسرا حصہ مرتّبہ کتابوں کا ہے جس میں بیس کتابوں کا تعارف شامل ہے۔ چوتھے حصے میں انگریزی اور ہندی تالیفات کے ذیل میں بارہ کتابوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ ہر کتاب کی اشاعت کا سال، ابواب کے عنوانات، صفحات کی تعداد اور دیگر ضروری احوال شامل کیے گیے ہیں۔ اِس سے کتاب پڑھنے والوں کے لیے کارآمد مواد سامنے آجاتا ہے اور ہر کوئی چند صفحات میں اُن کی تمام تصنیفات وتالیفات کے بارے میں اندازہ کر سکتا ہے۔ کتاب کے آخر میں دو شعرائے کرام ڈاکٹر نوشاد احمد کریمی اور امان ذخیروی کا تہنیتی کلام شامل کیا گیا ہے۔ مرتب نے کتاب کے فلیپ پر اپنی دس نئی رباعیات شامل کی ہیں۔ معلوم ہو کہ اس سے قبل ظفر کمالی نے صفدر امام قادری کی شخصیت کے حوالے سے ۱۲۵ رباعیات کا مجموعہ 'سوغات' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔

یہ کتاب اگرچہ ۶۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں چھوٹی بڑی ۵۱ تحریریں شامل ہیں مگر موضوع کی مناسبت سے کارآمد تحریریں اِس سلسلے سے پیش کی گئی ہیں کہ آپ پڑھنے کے لیے خود مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک بات سے دوسری بات اور ایک موضوع سے دوسرا موضوع۔۔۔ یہ سلسلہ کتاب کے آخری صفحات تک چلتا رہتا ہے۔ مرتبِ کتاب ڈاکٹر ظفر کمالی کی یہ سب سے بڑی کامیابی ہے کہ انھوں نے موضوع کتاب کے تمام شخصی پہلوؤں کو اُبھارنے میں اپنی طرف سے کوئی کوتائی نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز بن گئی ہے۔عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی نے اس کتاب کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتاب کی ایک کاپی کی قیمت ۸۰۰ روپے ہے جو کتاب کی ضخامت اور معیارِ طباعت کوملحوظ رکھتے ہوئے زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔اِسے براہِ راست ناشر یا9931646092 نمبر پر رابطہ کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu University, Patna Centre
Email: sagirfarhat@gmail.com

صفدر امام قادری:فکری وفنّی زاویے......ایک تبصرہ

کتاب کا نام: صفدر امام قادری:فکری وفنّی زاویے

مرتّب:ظفر کمالی

مبصّر: ناہید پروین

ناشر:عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

کل صفحات:640

قیمت: روپے800

مبصر:ناہید پروین

موجودہ عہد کے مصنفین اور اساتذہ میں صفدر امام قادری اچھے خاصے معروف ہیں۔گذشتہ دنوں اُن کی شخصیت اور تدریسی خدمات کے حوالے سے ایک ضخیم کتاب ’’صفدر امام قادری: شخصی نقوش‘‘ منظرِ عام پر آئی تھی جس میں ان کی شخصیت اور تدریسی خدمات کا احاطہ کیا گیا تھا۔اب ۶۴۰ صفحات پر مشتمل ایک دوسری کتاب ’’صفدر امام قادری:فکری وفنّی زاویے‘‘ چھپ کر سامنے آئی ہے۔دونوں کتابوں کے مرتّب معتبر نقاد اور محقق ڈاکٹر ظفر کمالی ہیں۔ہم عصر ادبا وشعرا پر مختصر تہنیتی کتابوں کا چلن اب عام ہے لیکن اتنی ضخیم کتابیں جن میں ہر حلقے کے لکھنے والے موجود ہوں، یہ خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ایک بڑا حلقہ اس بات پر اب بھی مُصر ہے کہ احتساب اور قدر شناسی کسی کی زندگی میں ممکن نہیں؛ آدمی کی حقیقی پہچان اس کے گزر جانے کے بعد ہی معلوم ہوتی ہے۔اس کے برعکس بعض محقّقین بھی اِس بات کے طرف دار نظر آتے ہیں کہ کسی بھی شخصیت کی زندگی میں اُس کے بارے میں تحسین وتنقید کا عمل ہرگز نامناسب نہیں۔کسی شخصیت کی زندگی میں اگر بات چیت شروع ہو تو بعض تحقیقی امور پر زیادہ درست مواد میسّر آسکتا ہے۔اس شخصیت کے گزر جانے کے بعد کبھی کبھی یہ ناممکن ہوتا ہے۔اس لیے عصر حاضر کے مصنفین کے حوالے سے

ایسی کتابوں کی اشاعت کو غیر ضروری طور پر خود تشہیری کے بجاے ایک سنجیدہ علمی کوشش سمجھنا چاہیے۔

اِس کتاب میں مرتّب نے چھوٹے بڑے ۷۲ مضامین شامل کیے ہیں۔ سب کے سب مصنف کی ادبی کتابوں اور خدمات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ ہم عصر ادیبوں میں بہت کم ایسے خوش نصیب لکھنے والے ملیں گے جن کے فضل و کمال پر اتنی تعداد میں تنقیدی تحریریں مشہور اہالیانِ قلم نے پیش کی ہوں۔ اس اعتبار سے صفدر امام قادری کو خوش نصیب مصنفین کی فہرست میں شامل کیا جائے گا جن کی خدمات پر نقادوں نے بخل سے کام نہیں لیا۔ اسی لیے اِس کتاب میں ہر مکتبۂ فکر کے مصنفین کی تحریریں موجود ہیں۔ صفدر امام قادری کی مختلف تصانیف پر ہر نسل کے مصنفین نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ یوسف ناظم، ریاض الرحمان شروانی، سید محمد عقیل، پیغام آفاقی، شفیع جاوید، شوکت حیات، محمد مختار وفا اور امام اعظم کے مضامین اگرچہ شامل ہیں مگر وہ اِس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ دیگر بزرگ لکھنے والوں میں فاروق احمد صدیقی، محمد منصور عالم، اظہار خضر، علی احمد فاطمی، انیس الرحمان، غضنفر، اقبال حسن آزاد، جاوید دانش، اے۔ کے۔ علوی وغیرہ کے نام شمار میں لیے جا سکتے ہیں جو فی زمانہ اردو کی بزرگ نسل کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اِسی کے ساتھ اِس کتاب میں ہم عصر ادب کے بہت سارے نمایاں نام بھی موجود ہیں۔ عطا عابدی، نسیم احمد نسیم، مشتاق احمد، سید افروز اشرفی، جمال اویسی، محسن خاں، خالد عبادی، محمد ذاکر حسین، مفتی محمّد ثناء الہدیٰ قاسمی، غزال ضیغم، شہاب ظفر اعظمی، مقصود دانش، واحد نظیر وغیرہ ہم عصر ادب کے نمایاں کرداروں کی تحریروں سے یہ کتاب معتبر ہوئی ہے۔

مرتبِ کتاب نے یہاں بڑے اور نامی گرامی مصنفین کے پہلو بہ پہلو نئی نسل کے اُن لکھنے والوں کو بھی موقع دیا ہے جن میں سے بعض کی پہچان تو قومی سطح پر ہو چکی ہے مگر ان میں سے چند ایسے بھی ہیں جو اپنی تحریروں کی بدولت ہم سے داد کی خاص توقع رکھتے ہیں۔ اس حلقے میں علینہ علی ملک، سلمان عبدالصمد، عبدالوہاب قاسمی، الفیہ نوری، آصف ابرار، افشاں بانو، عرشِ منیر، محمد مرجان علی، محمد ولی اللہ قادری، اشتیاق احمد بھاگل پوری، شاہد حبیب، محمد فیروز عالم، صابر رضا رہبر مصباحی، محمد حسین، مبارک حسین مصباحی، محمد مرشد، قسیم اختر، ابراہیم افسر، عابدہ پروین، نیلوفر یاسمین، افضال عاقل، محمد طیب نعمانی، شبنم پروین، محمد عدنان عالم، شہزادا انجم برہانی، تسلیم عارف، ابرار احمد اجراوی، محمد نور نبی انصاری اور محمد عنایت اللہ وغیرہ کے مضامین کی شمولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ مرتب کتاب نے ہر نسل کے لکھنے والوں کو سر جوڑ کر ایک منچ پر بٹھایا ہے۔ اس سے قدر شناسی کی ایک ہمہ جہت فضا قائم ہوتی ہے کہ مختلف نسلوں کے لکھنے والوں میں صفدر امام قادری کی حیثیت کس طور پر قائم ہے؟

اس کتاب میں صفدر امام قادری کی تنقیدی جہات کو ابھارنے کی خاص کوشش کی گئی ہے۔ عمومی تنقید

پرکم تحریریں شامل ہیں۔ لیکن یہاں اُن کی کتابوں کو مرکز میں رکھ کر صفدر شناسی کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔ اُن کی ۱۷ کتابوں پر مختلف نقادوں کے تجزیاتی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ بعض کتابوں پر صرف ایک تحریر بھی موجود ہے مگر ''نئی پُرانی کتابیں'' پر۱۲، ''جانے پہچانے لوگ'' پر۱۱، ''بنگلا دیش کو میں نے دیکھا'' پر۹، اور ''عرض داشت'' کتاب کے حوالے سے کوئی ۸ مضامین اس کتاب شامل ہیں۔ یہ ۷۲ مضامین چوں کہ مشہور و معروف اور آزمودہ کار لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں، اِس لیے ہر تحریر تنقیدی اعتبار سے قابلِ توجّہ معلوم ہوتی ہے۔ ہر لکھنے والے نے اپنے مضمون میں صفدر امام قادری کی علمی جہت کو پرکھنے میں کامیابی پائی ہیں۔ ان مضامین سے صفدر امام قادری ایک ایسے مصنف کے طور پر ابھرتے دکھائی دیتے ہیں جو صرف نقاد نہیں، جو صرف محقق نہیں بلکہ وہ ایک ہمہ جہت ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں جس کی ادبی رنگارنگی حیرت انگیز ہے کیوں کہ وہ نقاد اور محقق کے طور پر تو ایک طویل مُدت سے اپنی پہچان رکھتے ہی ہیں مگر اس سے سوا وہ یہاں خاکہ نگار، سفر نامہ نگار، صحافی، مترجم، مرتبِ متن اور شاعر کے طور پر ہمارے لیے اہمیت کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔

عام طور سے اتنی ضخیم کتابوں میں مرتبین زیادہ تفصیلی مقدمہ شامل نہیں کرتے کیوں کہ پوری کتاب کے مضامین اپنے آپ بہت کچھ کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اِس کتاب کے مرتب ڈاکٹر ظفر کمالی نے اتنی تعداد میں مضمون نگاروں کو جمع کرنے کے باوجود کوئی ۲۲ صفحات پر مشتمل 'عرضِ مرتب' لکھی ہے۔ عرضِ مرتب روایتی انداز کی تحریر نہیں ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ کتاب میں شامل تمام مضامین کے سلسلے سے اپنی ادارتی رائے پیش کریں۔ اِس کے علاوہ انھوں نے 'عرض مرتب' کے ابتدائی ۶ صفحات میں صفدر امام قادری کی ادبی اہمیت پر اپنی نپی تُلی گفتگو کی ہے۔ چند صفحات میں کسی شخص کا مکمّل ادبی شناخت نامہ تیار کر دیا جائے، یہ آسان بات نہیں۔ 'عرض مرتب' سے ظفر کمالی کی تحریر کا معیار اور شخصیت شناسی کے مرحلے میں اقدار پر خصوصی توجّہ پڑھنے والوں کو بہ یک نظر معلوم ہو جاتی ہے۔ انھوں نے مضمون نگار کی تحریروں پر اپنی رائے دیتے ہوئے صرف تعارف تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے کوشش کی ہے کہ اس بہانے کچھ تنقیدی گفتگو بھی سامنے آ جائے۔ اس تحریر کے مطالعے سے پڑھنے والوں کا نقطۂ نظر اور علمی و ادبی تناظر اپنے آپ واضح ہو جاتا ہے۔

صفدر امام قادری کے تنقیدی اوصاف پر پہلا مضمون مشہور ناول نگار غضنفر کا ہے جس میں انھوں نے صفدر امام قادری کے چند بنیادی تنقیدی امتیازات کو واضح کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ انھوں نے صفدر امام قادری کو صف شکن نقاد تسلیم کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کس طرح دوٹوک انداز میں اپنی بات دلیلوں کے ساتھ کہتے ہیں۔ انھوں نے کسی ادبی متن کے اندر اُتر کر صفدر امام قادری کے تجزیے کے انداز کو پسند کیا ہے۔ انھوں نے تنقیدی کاموں میں لگن، دلچسپی اور انہماک کو ان کے بنیادی اوصاف میں

شامل کیا ہے۔تنقید معروضی ہونی چاہیے، اِس باب میں صفدر امام قادری کی تنقید کو انھوں نے سراہا ہے۔ انھوں نے مختلف مضامین سے اقتباسات فراہم کرتے ہوئے اپنے مضمون کو مکمل کیا ہے۔

اِسی طرح اِس کتاب کے آخری حصّے میں مقصود دانش، ابرار احمد اجراوی، محمد نور نبی انصاری اور محمد عنایت اللہ کے مضامین مجموعی خدمات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لکھے گئے ہیں۔ مقصود دانش نے اُن کی فکشن سے متعلق متعدد تحریروں کے حوالے سے اپنا مضمون مکمل کیا ہے۔ انھوں نے ان کی مدلل گفتگو کے انداز و آداب کو قابلِ توجّہ مانا ہے۔ افسانوی تحریوں کے دوران فنّی اور تکنیکی امور پر صفدر امام قادری کس طرح غور کرتے ہیں، اس کی مثالیں پیش کر کے انھوں نے اُن کے تنقیدی اطوار کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی نے اپنے مختصر مضمون میں صفدر امام قادری کے بعض مضامین کے حوالہ جات پیش کر کے اُن کے اندازِ تحریر، متن پر ان کی خاص گرفت اور جہانِ معنیٰ کی سیر جیسے امور پر گفتگو کر کے اُن کے ایک بڑے نقاد ہونے کی دلیلیں فراہم کی ہیں۔ اِسی طرح ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اور نور نبی صاحبان کے مضامین بھی اردو ادب میں اُن کی مجموعی حیثیت کے سلسلے سے روشنی ڈالتے ہیں۔

اِس کتاب میں مرتب نے تصنیفات کی بنیاد پر مضامین جمع کیے۔ ہر تصنیف پر چند مضامین شامل ہیں۔ اِس اندازِ پیش کش کے متعدد علمی و عملی فوائد نظر آتے ہیں۔ اکثر مضمون نگاروں نے اجمالی گفتگو سے گریز کرتے ہوئے اُن کتابوں پر زیادہ توجّہ کی ہے جن کا انھیں جائزہ لینا تھا۔ شاید اسی لیے اکثر مضامین میں تکرار اور دُہراو کے معاملات کم سے کم نظر آتے ہیں۔ اس طریقۂ کار کا یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ متن اساس تنقید کی فضا سازگار ہوتی ہے۔ اکثر مضمون نگاروں نے صفدر امام قادری کی الگ الگ تحریروں کا اپنے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ یہ خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ ایک کتاب کے سلسلے سے جب متعدد نقادوں کے مضامین ایک ساتھ پڑھنے کا ہمیں موقع ملتا ہے تو الگ الگ لکھنے والوں کے پاس الگ الگ تنقیدی نکات بھی ہوتے ہیں۔ مرتبِ کتاب کی یہ حکمتِ عملی علمی اعتبار سے پسندیدہ تسلیم کی جائے گی جس سے اِس کتاب کا اعتبار بڑھ جاتا ہے۔

اکثر کتابوں پر مضامین کی شمولیت میں ظفر کمالی صاحب نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اُس کتاب کا جائزہ مختلف نسلوں کے محققین و ناقدین لیں۔ اس سے اضافی طور پر ایک علمی توازن بھی قائم ہوتا ہے۔ اس میں کتاب کے مضامین کا باسی پن بھی گھٹتا ہے اور چیزوں کو اختلاف و اتّفاق اور مختلف ذہنوں سے پرکھنے کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی خوب ہے کہ یہ تمام مضامین بالکل تازہ ترنہیں ہیں بلکہ کچھ مضامین تو ۲۰ اور ۳۰ سال پرانے ہیں۔ اس کا واضح فائدہ یہ ہوا ہے کہ جس طرح گذشتہ چار دہائیوں میں صفدر امام قادری نے تصنیفی سرگرمیاں جاری رکھیں، اسی طرح ان کے کاموں کا بھی وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جاتا رہا۔

اس کتاب میں سب سے زیادہ مضامین ''نئی پرانی کتابیں'' کے حوالے سے جمع کیے گئے ہیں۔

صفدر امام قادری کے تبصروں کی یہ کتاب ۲۰۱۳ء میں جب منظرِ عام پر آئی تھی تو اُس زمانے کے رسائل و جرائد کے صفحات میں اِس کتاب کے حوالے سے تعریف وستایش کے احوال خوب خوب بیان ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے کہ اس کتاب پر نہایت معتبر اور معمر نقادوں کے ستایشی مضامین یہاں شامل ہیں۔ ممتاز ناقد اور محقق ریاض الرحمان شروانی اور معروف ترقی پسند نقاد سید محمد عقیل رضوی کے تعریفی تبصرے اس کتاب کے بے حد روشن پہلو ہیں۔ ممتاز ناول نگار پیغام آفاقی کی تحریر اگر چہ مختصر ہے مگر صفدر امام قادری کے تنقیدی اوصاف واضح کرنے میں وہ پورے طور پر کامیاب ہے۔ اُن بزرگوں کے تنقیدی تبصرے صفدر امام قادری کے لیے ادب کے دروازے کھولنے کی بشارت بھی ہیں۔ اِن بزرگوں کے پہلو بہ پہلو نئی نسل کے بہت سارے نقادوں کی تحریروں کی یک جائی ایک نیا علمی منظر نامہ مرتب کرتی ہے۔ یہاں یہ خوش گوار احساس بھی قائم ہوتا ہے کہ بعض نئے لکھنے والے کس قدر چاق و چوبند ہیں اور کسی ادبی متن کا کس قدر گہرائی سے مطالعہ کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے سے سلمان عبدالصمد، عبدالوہاب قاسمی، الفیہ نوری اور افشاں بانو کے مضامین بہ طورِ خاص پڑھے جانے چاہییں جہاں نئی نسل نے ایک ٹھوس تنقیدی بنیاد پر اپنی شناخت کا بہترین دعوا پیش کیا ہے۔

صفدر امام قادری کی دیگر تنقیدی کتابوں 'ذوقِ مطالعہ'، 'محمد حسین آزاد کا تنقیدی شعور اور دیگر مضامین'، 'مشاہدات' اور 'عہدِ سرسید کے ادبی اور علمی نقوش' پر بھی بزرگ اور نئی نسل دونوں مصنفین کی آرا سامنے آتی ہیں۔ ممتاز افسانہ نگار شفیع جاوید کا مضمون ان کے مخصوص اسلوب کی نمائندگی کے ساتھ صفدر امام قادری کی تنقیدی بصیرتوں کا اعلانیہ بھی ہے۔ ممتاز ترقی پسند نقاد علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون سے صفدر امام قادری کے نئے تنقیدی ذہن کی اصولی بنیادیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہیں۔ محمد ولی اللہ قادری نے 'ذوقِ مطالعہ' اور 'محمد حسین آزاد کا تنقیدی شعور' دونوں کتابوں پر تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور ان کے تنقیدی معیار و مرتبے کے تعین کے لیے خصوصی توجّہ صرف کی ہے۔ 'مشاہدات' کتاب پر نہایت طویل تبصرہ جناب عبدالوہاب قاسمی کا شامل ہے جس میں کتاب کے ایک ایک مضمون کا بہت ہی باریک بینی کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان تمام تحریروں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ عہدِ حاضر کے نمائندہ نقادوں میں صفدر امام قادری اعتبار اور امتیاز رکھتے ہیں۔

غیر افسانوی ادب کے حوالے سے صفدر امام قادری کی تین کتابوں 'عرض داشت'، 'جانے پہچانے لوگ' اور 'بنگلا دیش کو میں نے دیکھا' پر کوئی ۲۸ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ 'عرض داشت' پر دو صاحبِ طرز افسانہ نگار شفیع جاوید اور شوکت حیات کی تحریریں اس بات کا مزید ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ اپنے

عہد کے ممتاز مصنفین نے صفدر امام قادری کے کاموں کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا ہے۔ 'عرض داشت' پر شفیع جاوید کی تحریر اُن کی جہاں دیدنی کا مظہر ہے۔ شوکت حیات، رہبر مصباحی اور واحد نظیر کی تحریریں صفدر امام قادری کے امتیازات روشن کرنے میں کامیاب ہیں۔ صفدر امام قادری کے صحافتی کالم علمی دنیا میں کچھ خاص توجّہ سے پڑھے جاتے ہیں۔ اُن کے علمی اعتبار اور غور وفکر کی بنیادوں کو دیکھنا ہو تو اِس کے لیے یہ سب سے بہتر نمونہ ہیں۔ ظفر کمالی نے اپنے مقدمے میں اُن کی کالم نگاری کے بارے میں بے حد واضح رائے دی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل میں یہ آٹھ تحریریں اِس کتاب کا حصّہ ہیں۔ ہر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صفدر امام قادری نے کس طرح مدلّل انداز میں بے باکی کے ساتھ علمی اسلحوں سے لیس ہو کر اپنے یہ کالم لکھے۔ ان میں موجود انوکھے پہلوؤں پر بھی ان مصنفین نے اشارے کیے ہیں۔

کورونا کے دوران صفدر امام قادری نے ادیبوں، شاعروں اور اپنے متعلقین کے حوالے سے چند خاکے لکھے جنھیں ۲۰۲۱ء میں یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ اس کا خوب خوب نام 'جانے پہچانے لوگ' رکھا گیا ہے جس میں چھوٹے بڑے ۱۵ خاکے شامل ہیں۔ اِس کتاب کے تعلق سے ۱۱ مضامین شامل کیے گئے ہیں جو ۸۶ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی بزرگ لکھنے والوں میں پروفیسر انیس الرحمان، غضنفر اور اقبال حسن آزاد کے مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب وتدوین چوں کہ ڈاکٹر عابدہ پروین اور ڈاکٹر نیلوفر یاسمین نے مشترکہ طور پر کی ہے، اس لیے ان کے مقدمے کو توجّہ سے پڑھنا چاہیے۔ مرتبِ کتاب ظفر کمالی نے اِن کے مشترکہ مضمون کو 'جانے پہچانے لوگ' پر شامل سب سے اچھا مضمون مانا ہے۔ ڈاکٹر سلمان عبدالصمد کا مضمون بھی فنِ خاکہ نگاری کے اصولوں کی بنیادیں تلاش کرتے ہوئے لکھا گیا ہے، اس لیے اس میں دوسرے مصنفین سے موازنہ ومقابلہ اور نتائج اخذ کرنے کا ایک خاص طریقہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

''بنگلا دیش کو میں نے دیکھا'' صفدر امام قادری کا سفرنامہ ہے جو ۲۰۲۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ۵۰ برسوں کے اِس ملک کے حوالے سے اردو زبان میں زیادہ سفرنامے نہیں لکھے گئے ہیں۔ حال کے دور میں تو مزید سستی رہی ہے۔ صفدر امام قادری نے گذشتہ برسوں میں دو بار بنگلا دیش کا سفر کیا۔ وہ اپنی کھُلی آنکھوں کے ساتھ ساتھ بصیرتوں کا دربار سجائے ہوئے بنگلا دیش پہنچتے ہیں۔ وہاں کی تہذیب، قدرتی مناظر، تعلیمی ادارے سب صفدر امام قادری کے مرکزِ نگاہ بنتے ہیں۔ ظفر کمالی نے جاوید دانش اور علی احمد فاطمی جیسے بزرگ لکھنے والوں کے مضامین سے اس حصے کا آغاز کیا ہے، یہ بھی خاص بات رہی کہ یہ دونوں سفرنامہ نویس بھی ہیں۔ اِن کے علاوہ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین، شبانہ نوید (بنگلا دیش) افضال عاقل، محمد طیب نعمانی اور شبنم پروین کے مضامین بھی بڑے معرکے کے ہیں۔ اِن لکھنے والوں نے کوشش کی ہے کہ سفرنامہ لکھنے کے فن کو بھی سامنے

رکھتے ہوئے صفدر امام قادری کے سفرنامے کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

اس کتاب کے مطالعے سے صفدر امام قادری کی بعض مشہور کتابوں کے ساتھ کچھ کم معروف کتابوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔ کتاب کے مرتب نے خاص کتابوں پر اگر زیادہ مضامین شامل کیے ہیں تو اسی کے ساتھ کچھ کتابوں پر ایک ایک یا دو مضامین شامل کر کے پڑھنے والوں کو ان کم معروف کتابوں کے تعلق سے بھی بے خبر نہیں رکھا گیا ہے۔ بہار ٹکسٹ بُک کارپوریشن کی جانب سے گیارھویں اور بارھویں جماعت کے لیے صفدر امام قادری کی ایک کتاب ''اردو زبان و ادب کی مختصر تاریخ'' درسی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہے جس میں اُن کے تیرہ مضامین شامل ہیں۔ ممتاز محقق پروفیسر محمد منصور عالم نے اپنے مختصر جائزے میں کتاب کے علمی مقام و مرتبے کی جانچ پرکھ کی ہے۔ انھوں نے کتاب کے تحقیقی اعتبار کو سمجھتے ہوئے مصنف کو آیندہ اشاعتوں میں بعض اضافوں کے مشورے بھی دیے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ آنے والے وقت میں صفدر امام قادری اِس کتاب میں چند ابواب کے اضافے سے اردو طلبہ کے لیے ایک مزید مفید کتاب تاریخ ادب اردو کے حوالے سے تیار کر دینے میں کامیاب ہوں گے۔

2006 میں بہار اردو اکادمی نے صفدر امام قادری کی تصنیف کردہ کتاب ''سید محمد محسن'' شائع کی۔ یہ حقیقتاً ایک فرد نامہ یا مونوگراف ہے۔ ایسی کتابوں کا مقصد محض تعارف ہوتا ہے جہاں یہ نشانہ مقرر ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ اُس شخص کے اوصاف و کمالات یکجا کر دیے جائیں۔ ڈاکٹر علینہ علی ملک نے اپنے مضمون میں اس کتاب کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اُنھوں نے کتاب کے تمام ابواب اور حصّوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سید محمد محسن کے حوالے سے ایسی کتاب کس حد تک ضروری تھی۔ اُنھوں نے اختصار کے ساتھ تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھنے کی وجہ سے اِس کتاب کو اہم قرار دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ محسن شناسی میں مختصر کتاب کے ہونے کے باوجود اس کی کون سی جگہ متعین ہوتی ہے۔

'عہدِ سرسید کے علمی اور ادبی نقوش' کتاب کے حوالے سے دو مضامین شامل ہیں۔ شاہد حبیب اور محمد فیروز عالم کے مضامین میں اِس کتاب کی معنویت پر بحث کی گئی ہے اور اِس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اِس کے بطن میں اُتر کر نفسِ مضمون کا جائزہ لیا جائے۔ اِسی طرح شوکت حیات کے ناولٹ ''سر پٹ گھوڑا'' کو شائع کرتے ہوئے صفدر امام قادری نے جو تفصیلی مقدمہ لکھا تھا، اُس کا ولی اللہ قادری نے اپنے مضمون میں جائزہ لیتے ہوئے اِس بات کی شہادت بھی دی ہے کہ شاید ہی کوئی نقاد اِس کتاب کو پڑھتے ہوئے اِس مقدمے میں کوئی اضافہ کر سکے۔ مقدمے میں صفدر امام قادری نے ناولٹ کے نام کے سلسلے سے جو بحث کی ہے، اُس کی ولی اللہ قادری نے تنقیدی اعتبار سے اہمیت کے پیشِ نظر خوب خوب تعریف کی ہے۔

صفدر امام قادری کی کتاب ''روشن ہے ریگ زار'' کے حوالے سے ثناء اللہ دوگھروی کا ایک مختصر سا تبصرہ شامل کتاب ہے۔ اس کتاب میں عربی ادبیات کی عہدِ حاضر میں معنویت کے حوالے سے صفدر امام قادری کا مضمون لائق توجہ ہے۔ عربی کی پچیس نظموں کے انگریزی تراجم کی بنیاد پر انھوں نے اردو ترجمے پیش کیے ہیں۔ ثناء اللہ ثنا دوگھروی نے اِس کتاب کو اردو حلقے کے لیے ایک اہم اثاثہ قرار دیا ہے۔ تراجم کو بھی انھوں نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے اور کتاب کو اہالیانِ اردو ادب کے لیے ایک نیک فال تصور کیا ہے۔ شہریار کی شاعری کا ایک بھرپور انتخاب نیشنل بک ٹرسٹ کے لیے صفدر امام قادری نے ''یہ زمیں کچھ کم ہے'' عنوان سے کیا تھا۔ جس کا جائزہ ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی نے لیا ہے۔ شہزاد انجم برہانی نے صفدر امام قادری کے تفصیلی مقدمے کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اُس مقدمے میں کس طرح شہریار کی شاعری کے تمام بنیادی اوصاف سمٹ کر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ انھوں نے صفدر امام قادری کے انتخاب کو ایک ایسا نمائندہ انتخاب تسلیم کیا ہے جس میں شہریار کے مختلف مزاج و اسالیب کو یکجا کر دیا گیا ہے جس کے بعد کوئی بھی مجموعی طور پر مطالعہ کر کے نتیجہ خیز گفتگو تک پہنچ سکتا ہے۔

''میرے والدین'' عنوان سے صفدر امام قادری کی ایک کتاب ہے جس میں انھوں نے اپنے والد اور والدہ کے خاکے شامل کیے ہیں۔ ایسی کتابیں بہت کم ملتی ہیں جہاں مصنفین نے اپنے والدین کے بارے میں اِس قدر تفصیل سے لکھنے کی کوشش کی ہو۔ اس کتاب پر مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نے صفدر امام قادری کے اُسلوب کی سادگی اور غیر آرائشی طور کو پسند کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ والدین کی زندگیوں میں اُن کی اولاد کی زندگی بھی اپنے آپ شامل ہو جاتی ہے، اسی لیے اِس کتاب کو پڑھتے ہوئے صفدر امام قادری کی زندگی جگہ جگہ سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر افشاں بانو نے اِس کتاب کو عام سطحِ زندگی سے آگے کی زندگیوں کا ایک خاکہ قرار دیا ہے۔ اِن خاکوں کو اُنھوں نے یادنگاری یا ڈائری سے قریب تر تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے اس بات کا خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ مصنف نے بڑے بڑے کارناموں کے مقابلے چھوٹی اور عام اہمیت کی چیزوں پر زیادہ توجہ کی ہے جس سے اعلا اخلاقی اقدار اپنے آپ واضح ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر افشاں بانو نے کتاب سے ضروری اقتباسات پیش کر کے اِس بات کی وضاحت کی ہے کہ ''اِن خاکوں کے پیچھے مثالی زندگی کا ایک تصور اور اُس کی تلاش و جستجو بھی ہے''۔

اس کتاب میں صفدر امام قادری کی کئی مرتبہ کتابوں پر بھی مضامین شامل کیے گیے ہیں۔ اردو صحافت کی دوصدی تقریبات کے پیشِ نظر ۲۰۲۲ء میں ''صحافت: دوصدی کا احتساب'' عنوان سے صفدر امام قادری نے ایک ضخیم کتاب 752 صفحات پر مشتمل ترتیب دی تھی جس میں اردو صحافت کی تاریخ کے حوالے

سے 24 ابواب اور 70 مضامین شامل تھے۔اس کتاب کے سلسلے سے ڈاکٹر تسلیم عارف اور ڈاکٹر محمد ولی اللہ قادری کے مضامین شامل ہیں۔ دونوں مبصرین نے اِس کتاب کو کتابِ حوالہ قرار دیا ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ مستقبل کے محققین اِس سے فیض حاصل کریں گے۔ اِسی طرح ظفر کمالی کی ادبی خدمات کے حوالے سے 2023 میں صفدر امام قادری نے ایک اور ضخیم کتاب بہ عنوان ''ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں'' شائع کی۔ اس کتاب میں بھی پچاس سے زیادہ مضامین ظفر کمالی کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے شامل کیے گئے ہیں۔اس کتاب کا تنقیدی جائزہ ڈاکٹر اے۔ کے۔علوی نے لیا ہے۔انھوں نے اپنے مضمون میں اِس کتاب کی ادبی و علمی اہمیت واضح کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ ظفر کمالی جیسے ادب کے خاموش خدمات گار کے لیے اِس طرح کی کوششیں کیوں ضروری تھیں۔انھوں نے اِس کتاب کو عوام و خواص میں توجہ کے ساتھ مطالعے کی دعوت دی ہے۔

صفدر امام قادری کی بنیادی حیثیت اگر چہ نثر نگار بالخصوص نقاد کی ہے مگر انھوں نے خال خال شاعری بھی کی ہے۔اب سے تقریباً بیس برس پہلے شملہ کے پہاڑوں پر اُن کی پچیس نظمیں ایک ساتھ مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئی تھیں۔اُن نظموں کے حوالے سے دو مشہور ادیبوں غزال ضیغم اور ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کے مضامین اس کتاب میں اِس وجہ سے شامل کیے گئے ہیں تا کہ صفدر امام قادری کی ادبی خدمات کے اِس خاموش گوشے پر روشنی پڑ سکے۔غزال ضیغم نے اُن نظموں کو تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح تسلیم کیا ہے۔انھوں نے اپنے مضمون میں مختلف نظموں سے مثالیں پیش کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ تخلیقات حقیقت میں نگار خانۂ رقصاں ہیں۔شہاب ظفر اعظمی نے اِن نظموں کی لفظیات اور تجربہ پسندی کی بھر پور داد دی ہے۔اسما کا جس طرح صفدر امام قادری نے اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے، انھوں نے اسے حیرت انگیز قرار دیا ہے۔دونوں مضمون نگاروں نے اِس بات کی تعریف کی ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں پہاڑی سلسلے سے اردو میں کسی دوسرے شاعر نے شعری سرمایہ یادگار نہیں چھوڑا۔

ایسی کتابیں سرسری انداز میں مرتب نہیں ہو سکتی ہیں۔ظفر کمالی صاحب نے اِس کتاب کی اشاعت کے مرحلے میں کتنی مشقتیں اُٹھائی ہوں گی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔کثیر التصانیف مصنفین کے حوالے سے کتابوں کی تدوین یوں بھی مشکل کام ہے۔مرتب کی ہزار کوششوں کے باوجود بعض کتابوں کے تعلق سے یہاں مضامین شامل نہیں ہو سکے ہیں۔خاص طور سے صفدر امام قادری کی مرتبہ کتابوں کا ایک بڑا حصہ یہاں تذکرے میں آنے سے رہ گیا ہے۔سر شاخ طلب (سلطان اختر)، اب وہاں رات ہو گئی ہو گی (باصر سلطان کاظمی)، دھوپ ایسی تو نہیں تھی پہلے (راشد انور راشد)، دنیا عجب بازار ہے (مجتبیٰ حسین کے خاکے) اور ''مجتبیٰ حسین: فن اور شخصیت'' ایسی کتابیں ہیں جن کے مقدمات اچھے خاصے تفصیلی ہیں۔اُن کا اس کتاب میں جائزہ شامل ہوتا تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی۔ اِسی طرح صفدر امام قادری کی ہندی اور انگریزی زبانوں میں جو

تصنیفات وتالیفات ہیں، اُن پر بھی اختصار کے ساتھ گفتگو کی جاسکتی تھی۔ عین ممکن ہے کہ مرتب کتاب کے ذہن میں کسی آئندہ کتاب کا کوئی خاکہ موجود ہو جس میں ایسی چیزیں شامل کی جاسکیں گی۔

اِن سب کے باوجود ظفر کمالی نے 640 صفحات میں جو سرمایۂ ادب صفدر امام قادری کی خدمات کے حوالے سے اکٹھا کیا ہے، وہ یقیناً کئی برسوں میں تیار ہوا ہوگا۔ کتاب کی ترتیب وتدوین اتنے سلیقے سے کی گئی ہے کہ مواد میں کوئی دہراو معلوم نہیں ہوتا۔ ہر مضمون میں کوئی نہ کوئی نئی بات یا نیا نقطۂ نظر موجود ہے۔ لکھنے والوں کو بغیر دلیل کے شاید ہی کسی بات کے کہنے کی گنجائش رہ گئی ہو۔ انھوں نے اپنے مقدمے میں خود بھی نہ صرف یہ کہ دوسروں کی تحریروں کی اشاعت کا جواز فراہم کیا ہے بلکہ اپنے طور پر صفدر امام قادری کی ادبی شخصیت کے حوالے سے واضح اور مدلل رائے بھی مقدمے میں شامل کی ہے۔ انھوں نے بعض معترضانہ تحریریں بھی شامل کی ہیں اور ایسے نقادوں کو بھی اپنا نقطۂ نظر واضح کر دینے کی سہولت دی ہے۔ عام طور سے اِس انداز کی کتابوں میں معترضانہ گفتگو دیکھنے میں نہیں ملتی ہے مگر مرتب نے یہ حوصلہ دکھایا ہے اور ایسے نقادوں کو کھل کر اپنی باتوں کو پیش کرنے کے مواقع عنایت کیے ہیں۔ یہ بھی اچھا کیا کہ مرتّب نے مقدمے میں اُن مضمون نگاروں کے جوابات لکھنے سے پرہیز کا رویّہ رکھا۔

ظفر کمالی موجودہ دور میں علمی اعتبار سے ملک میں صفِ اول کے لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے صفدر امام قادری کی ادبی وعلمی خدمات کے حوالے سے چیزوں کو حسنِ ترتیب سے اس طرح یکجا کیا ہے کہ اس بنیاد پر اُن کے ممدوح یعنی صفدر امام قادری کی علمی شناخت متعین ہوسکتی ہے۔ چوں کہ انھوں نے ''شخصی نقوش'' کے حوالے سے اِسی قدر ضخیم کتاب ترتیب دی ہے، اس لیے اس کتاب میں شخصیت اور درس وتدریس میں نمایاں خدمات کے حوالے سے کوئی تحریر شامل نہیں ہے۔ شخصیت اور فن کے حوالے سے گذشتہ چند برسوں میں اردو میں جو کتابیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی ہیں، اُن میں افادیت، علمی دائرۂ کار اور ترتیب وتدوین کی خوبیوں کی وجہ سے یہ کتاب بہترین ہے اور لازمی طور پر نئے محققین کے لیے حوالہ جاتی اہمیت کی حامل رہے گی۔ عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی نے اِس کتاب کو ایک خاص سلیقے سے طباعت کے اعلا معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جو اصحابِ ذوق اس کتاب کے طلب گار ہیں، وہ 800 روپے کی قیمت ادا کر کے براہ راست پبلشر یا فون نمبر 9931696092 سے حاصل کر سکتے ہیں۔

◄◄ ● ►►

Leela Niwas, Kunkun Singh Lane,
Patna: 800006. Bihar
Mob: 7352797515, Email:nahid77996@gmail.com

نام کتاب: چہرہ سوال ہے
صنف: شاعری
شاعر: خورشید اکبر
سال اشاعت: جنوری 2025
صفحات: 200
قیمت: 500 (10 امریکی ڈالر)
خط وکتابت کا پتہ: آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ 800007
رابطہ: 9631629952/7903869122
مبصر: اقبال حسن آزاد

''چہرا سوال ہے'' خورشید اکبر کا تازہ شعری مجموعہ ہے، جو بظاہر اردو شاعری کے میدان میں ایک غیر معمولی تخلیقی تجربے اور فکری کاوش کی نمائندگی کرتا ہے۔

یہ ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جو غزلِ رزمیہ، قصیدۂ الفیہ سوالیہ اور شہر آشوب کے امتزاج پر مبنی ایک منفرد تجربہ ہے۔

اس کی اشاعت ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپوری، پٹنہ نے کی ہے۔

اس میں کل 200 صفحات پر مشتمل 1402 اشعار درج ہیں جو اسے دنیا کی طویل ترین اردو غزل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

''چہرہ سوال ہے'' کا عنوان بذاتِ خود ایک فلسفیانہ و علامتی تہہ داری رکھتا ہے۔

یہ عنوان انسان کے وجود، شناخت، احساس، اور شعور کی گہرائیوں سے پیدا ہونے والے سوالات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شاعر نے ''چہرے'' کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جو نہ صرف فرد کی پہچان بلکہ عہد کے سوالات کا مظہر بھی ہے۔

خورشید اکبر کا یہ کہنا ؎

حیرت فروش ریزہ ہے تازہ سوال ہے — آئینہ چور چور ہے چہرہ سوال ہے

یہ فلسفہ واضح کرتا ہے کہ ان کے نزدیک چہرہ محض ظاہری وجود نہیں بلکہ ایک عہد کا آئینہ ہے جو ٹوٹ چکا ہے، مگر اس کے ذرے ذرے میں سوالات کی چمک باقی ہے۔

کتاب کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے موضوعات کو ۱۸ ''شہروں'' میں تقسیم کیا ہے، جیسے:

1۔شہرِ آمد	2۔شہرِ تحیرات	3۔شہرِ جمال	4۔شہرِ شفقت
5۔شہرِ حافظہ	6۔شہرِ فطرت	7۔شہرِ معرفت	8۔شہرِ شہادت
9۔شہرِ احتجاج	10۔شہرِ جلال	11۔شہرِ آشوب	12۔شہرِ تفنن
13۔شہرِ پیشہ وراں	14۔شہرِ ارضیات	15۔شہرِ اندیشہ	16۔شہرِ وراثت
17شہرِ سکوت			

یہ تقسیم محض علامتی نہیں بلکہ فکری و تہذیبی معنویت رکھتی ہے۔ ہر ''شہر'' دراصل انسانی تجربے، روحانی سفر، اور سماجی المیے کے ایک پہلو کی نمائندگی کرتا ہے۔

خورشید اکبر کی شاعری میں فلسفیانہ سوالات، روحانی تجربات، اور تہذیبی زوال کا نوحہ ایک ساتھ مل کر جلوہ گر ہوتے ہیں۔

ان کا اسلوب کلاسیکی شعری روایت سے جڑا ہوا ہے مگر موضوعات جدید انسانی اضطراب سے مربوط ہیں۔

ان کی شاعری میں میر، اقبال، غالب، اور جدید شعری فکر کی بازگشت سنائی دیتی ہے، مگر زبان اور لہجہ انفرادی ہے۔

شاعر میر کی زبان میں کہتا ہے کہ

شعر میرے ہیں گو خواص پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

یہ اپنے فن کی سماجی ذمہ داری کا اظہار یہ ہے۔ وہ خواص کے ذوق کا خیال رکھتے ہوئے بھی عوامی درد کو مرکز میں رکھتے ہیں۔ کتاب کے مختلف ابواب یا ''شہروں'' میں درج مضامین اور غزلیات میں جن موضوعات پر اظہار ہوا ہے، ان میں درج ذیل شامل ہیں:

روحانیت و تصوف (شہرِ معرفت)

احتجاج و مزاحمت (شہرِ احتجاج)

محبت و جمال (شہرِ جمال)

علم و عرفان (شہرِ فطرت اور شہرِ اندیشہ)

سماجی زوال اور تہذیبی بحران (شہرِ آشوب اور شہرِ تفنن)

خاموشی اور تفکر (شہرِ سکوت)

یہ تمام ابواب مل کر شاعر کی فکری وسعت اور انسانی تجربے کی گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔

خورشید اکبر کے پاس کلاسیکی اور جدید اردو کے امتزاج سے پیدا ہونے والی ایک شستہ اور بامعنی زبان ہے۔
ردیف و قافیہ کی پابندی منظّم اور موسیقیت سے بھرپور ہے۔ان کی تصویر نگاری علامتی، بصری
اور فکری سطح پر دلکش ہے۔ان کی شاعری میں بحر اور وزن کی روانی تسلسل اور آہنگ کے ساتھ برقرار ہے۔
1402 اشعار جیسے طویل قالب میں یہ فنی پابندی قابل تعریف ہے۔
ان کا کلام تخلیقی سطح پر متنوع اور بعض اوقات صوفیانہ رنگ میں رنگا ہوا ہے۔
اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ اردو کی طویل ترین غزل ہے۔
یہ پہلو اس کتاب کو تاریخی حیثیت دیتا ہے۔
مزید برآں آں شاعر نے روایت کے مقابل سوال اٹھانے کا انداز اپنایا ہے۔
اس کتاب میں ''چہرہ''، ''آئینہ''، ''شہر''، ''سکوت'' وغیرہ بطور استعارہ بار بار آتے ہیں۔
خورشید اکبر کی شاعری روحانی اور سماجی شعور، مذہبی، صوفیانہ، اور انسانی قدروں کا گہرا امتزاج ہے۔
''چہرہ سوال ہے'' محض ایک شعری مجموعہ نہیں، بلکہ اردو غزل کی فنی و فکری وسعت کا اعلان ہے۔
خورشید اکبر نے اس کتاب کے ذریعے اردو ادب کو ایک نئی صنف "غزلِ رزمیہ" میں تجرباتی
وسعت دی ہے، جہاں غزل صرف عاشقانہ نہیں بلکہ فکری اور وجودی سوالات کا مرکز بن جاتی ہے۔
''چہرہ سوال ہے'' خورشید اکبر کی فکری گہرائی، فنی مہارت اور روحانی بصیرت کا آئینہ ہے۔
یہ کتاب اردو شاعری کے دامن میں ایک نایاب اضافہ ہے، جو آنے والے دنوں میں ناقدین
اور محققین کے لیے تحقیقی و تنقیدی مطالعے کا موضوع بن سکتی ہے۔
کتاب میں اٹھائے گئے سوالات ایک شاعر کے نہیں، ایک عہد کے سوالات ہیں اور ہر اس
قاری کو جو لفظوں میں فکر کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہے، اس کتاب کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

◄● ►

نام کتاب: ضیائے حنا
ترتیب و تدوین: ڈاکٹر عبدالودود قاسمی
صدر شعبۂ اردو، کنور سنگھ کالج، لہیریا سرائے، دربھنگہ
اشاعت: 2025
صفحات: 464 قیمت: 500
پتہ: محلّہ راج ٹولی، نزد شمع مسجد، دربھنگہ، بہار-846004:

فون نمبر:7979936725
مبصر: اقبال حسن آزاد
سابق پرنسپل اور صدر شعبہ اُردو، جے۔آر۔ایس کالج، جمالپور (مونگیر)
پتہ: شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر-811201
فون:8210498674

دیگر اصناف سخن کی طرح سہرا نگاری بھی ایک مستقل فن ہے لیکن افسوس کہ اہل قلم حضرات نے اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ پھر بھی بعض شعرائے کرام نے حتیٰ المقدور اس کی آبیاری کی اور اسے زندہ رکھا۔ اس کتاب میں شامل اساتذہ کے چند مشہور و معروف ''سہرے'' اس بات کی دلیل ہیں کہ اس صنف میں نہ صرف گیرائی اور گہرائی ہے بلکہ اس میں زندہ رہنے کی زبردست صلاحیت بھی موجود ہے۔ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوق سے لے کر حسان الہند حضرت مولانا شاہ امام احمد رضا خانؒ بریلوی تک اردو سہرے کی ایک مضبوط روایت رہی ہے۔ اس سلسلے میں بعد میں آنے والوں میں علامہ جمیل مظہری کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ دور حاضر میں پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق، رہبر چندن پٹوی، ڈاکٹر عطا عابدی، پروفیسر مشتاق احمد، مشتاق دربھنگوی، ڈاکٹر جمال اویسی، ثناء اللہ خاں دوگھروی، انور آفاقی، ڈاکٹر منور راہی، ، ڈاکٹر عبدالودود قاسمی، ڈاکٹر احسان عالم، ڈاکٹر منصور خوشتر اور کئی دوسرے شعراء گاہے گاہے سہرا لکھتے رہے ہیں اور اس سلسلے میں کچھ کتابیں بھی سامنے آئی ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے اس موضوع پر کسی یونیورسیٹی میں کوئی مقالہ پیش نہیں کیا گیا ہے اور ہی اس پر کوئی سیمینار ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبدالودود قاسمی کثیر التصانیف ہیں اور انہوں نے اپنی وقیع اور گرانقدر کتابوں سے اردو ادب کا دامن مالا مال کیا ہے۔ انہوں نے اپنے لائق فائق فرزند حافظ محمد ثاقب ضیاؔ سلّمۂ کے عقد مسنونہ کے مبارک موقع پر ''ضیائے حنا'' نام کی ایک ضخیم کتاب ترتیب ہے۔ ملحوظ رہے کہ حنا ان کی بہو کا نام ہے۔ یہ ان کی محنت، لگن اور اولاد سے بے پناہ محبت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس کتاب کو منظر عام پر لانے کے لیے انہوں نے ملک اور بیرون ملک میں مقیم اپنے دوستوں اور بہی خواہوں سے رابطہ قائم کیا اور ان سب نے نہایت اچھا ریسپانس دیا۔ نتیجتاً اس کتاب کے لیے کثیر تعداد میں شعری اور نثری تخلیقات یکجا ہو گئیں۔ اس سے صاحب کتاب کی مقبولیت اور شہرت کا بھی اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں کل 252 شعری اور نثری تخلیقات شامل ہیں جن میں مناجات، نعتیہ سہرا، سہرے کی تاریخی، تحقیقی، تنقیدی اور تحلیلی مختصر گفتگو، اردو شاعری میں سہرے کی روایت، اردو شاعری میں سہرا نگاری ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ اور قطعۂ تاریخ کے

علاوہ ڈیڑھ سو سے زائد سہرے، غالب کی زمین میں گیارہ سہرے، پانچ توشیحی نظمیں، دو غیر منقوط سہرے، چھ مزاحیہ سہرے، دس خواتین کے ذریعہ تحریر کیے گئے سہرے، رباعیات، قطعات و ماہیے، رخصتی کی نظمیں اور کلمات تبریک شامل ہیں۔

464 صفحات کی اس گرانقدر کتاب میں بہت کچھ شامل ہے اور یہ کسی پی ایچ ڈی کے مقالے سے کم نہیں ہے۔ فلیپ پر پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر دبیر احمد، ڈاکٹر امتیاز وحید اور ڈاکٹر کامران صبا جیسے مشاہیر کی قیمتی آرا شامل ہیں جبکہ بیک کور مشہور نقاد جناب حقانی القاسمی کی پُر مغز تحریر دل و دماغ کو جلا بخشتی نظر آتی ہے۔

پروفیسر علیم اللہ حالی کہتے ہیں کہ:

> ''سہرا نگاری کا فن یوں تو ہماری تہذیبی روایت کا ایک مضبوط حصہ ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ سہرے یا اسی نوعیت کے دوسرے منظومات بالعموم تقریبات کے بعد محفوظ نہیں رہتے۔ ڈاکٹر عبدالودود قاسمی کے وسیع تر تعلقات کا فیض اور ادبی دنیا میں مقبولیت کی علامت ہے کہ ''ضیائے حنا'' میں رباعیات، قطعات، ماہیے، مزاحیہ و غیر منقوط سہروں اور توشیحی نظموں کے علاوہ قطعۂ تاریخ وغیرہ کے مطالعے کا موقع میسر ہوا۔''

پروفیسر دبیر احمد رقم طراز ہیں:

> ''...... جہاں تک اردو میں سہرا کا تعلق ہے تو بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صنف اردو کی اپنی ایجاد ہے۔''

وہ آگے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر عبد الودود قاسمی، جو درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور کئی کتابوں کے خالق بھی ہیں۔ ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ قلم رواں دواں ہے۔ انہوں نے اپنے صاحبزادے حافظ محمد ثاقب ضیاء کی تقریب عقد مسنونہ پر تہنیتی نظموں (سہرا) کا ایک خوبصورت اور با معنی مجموعہ مرتب کیا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کی پُر خلوص محبت کا گلدستہ بہ عنوان ''ضیائے حنا'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔''

ڈاکٹر امتیاز وحید کا کہنا ہے کہ:

> ''محبی ڈاکٹر عبدالودود قاسمی خود فعال اہل قلم ہیں اور سہرائی ادب کے تار و پود پر نئی تحقیق کے ساتھ آیا چاہتے ہیں۔ مجھے پوری توقع ہے کہ ان کی تحقیقی کد و کاوش

بہت جلد منصہ شہود پر آئے گی اور سہرا نگاری پر ایک نئے ڈسکورس کا آغاز ہوگا۔''

حقانی القاسمی کی تحریر کا رنگ ہی الگ ہوتا ہے۔فرماتے ہیں:

''تجسس اور تفحص کا جذبہ اور جنون ہو تو کوئی بھی باشعور بیدار مغز فر اکتشافات اور امکانات کی نئی دنیا تلاش کرسکتا ہے مگر ہماری تحقیق و تنقید میں تساہل پسندی کی روش اس قدر عام ہو چکی ہے کہ بہت سی نئی راہیں اور منزلیں ہم سے دور ہوتی جاتی ہیں اور ہم چند موضوعاتی حصار میں ہی اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں ۔Lessor Known Topics کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں جاتا جبکہ اردو شعر وادب کا کینوس اتنا محدود نہیں ہے جتنا کہ تصور کرلیا گیا ہے۔اردو میں بھی موضوعات کی ایک وسیع تر کائنات ہے۔اس میں جو میخانۂ جنوں کی سی وسعت ہے اور جذبات و احساسات کی ایک ایسی کہکشاں بھی ہے جس میں زندگی کے سارے رنگ ہیں۔خوشی و غم ،رنج و ملال کی ساری کیفیات مگر ہم ایک نقطہ پر ٹھہر سے گئے ہیں اس لیے ہماری موضوعی کائنات مختصر سے مختصر ترین ہوتی جارہی ہے۔ایسے میں اگر کوئی ایسا زاویہ یا جہت سامنے آئے جو ذرا مختلف اور منفرد ہو تو طمانیت اور مسرت کا احساس ہوتا ہے یہ (ضیائے حنا) صرف ان کے فرزند حافظ محمد ثاقب ضیاء کو نکاح مسعود کے موقع پر پیش کیا گیا تبریک و تہنیت کا ایک مجموعہ نہیں ہے بلکہ تحقیق و تنقید کی ایک نئی رہ گزر بھی۔''

مشاہیر ادب کی درج بالا گرانقدر آراء کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زیر نظر تصنیف نہ صرف اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے بلکہ اس کی روشنی میں سہرا نگاری کو ایک نئی سمت و رفتار ملے گی۔

◀◀ ● ▶▶

''ارمغان رافق''......ایک دلچسپ اور انوکھی کتاب

مبصر: اقبال حسن آزاد

انشائیہ نگاری ایک نازک فن ہے۔اس میں تنقید کی ذہانت و بلاغت،افسانے کی حلاوت و لذت اور شاعری کی نزاکت و لطافت پائی جاتی ہے۔انشائیہ نگار کے لیے بیدار مغز، وسیع القلب اور وسیع المشرب ہونا ضروری ہے۔انشائیہ نگار کے اندر حس مزاح اور جمالیاتی حس کا ہونا بھی ضروری ہے۔کوئی خشک مزاج آدمی کبھی

بھی انشائیہ نگار نہیں بن سکتا۔ایک اچھا انشائیہ وہ ہے جو روح میں بیداری وسرشاری پیدا کردے اور ساتھ ہی ساتھ غور وفکر کے نئے در بھی وا کرے۔ایک ذہین انشائیہ نگار زیرلب مسکراتا ہے لیکن پڑھنے والے کے ہونٹوں پر تبسم کے پھول کھلا دیتا ہے۔کہیں کہیں اس کی تحریر قہقہہ بار بھی ہوجاتی ہے مگر دل ودماغ پر بار نہیں ہوتی۔

پروفیسر سید محمد رافق زماں صاحب سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔مگران کے لائق فرزند سید شمس الزماں عرف بزمی (ایم سی اے،سینیئر سوفٹ ویئر انجینیئر ،بنگلور) نے ''ارمغان رافق'' کے ذریعے ان سے آدھی ملاقات کروادی۔وہ اپنے اداریہ میں پروفیسر رافق زماں کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''......والد گرامی کی لکھی ڈائری،نوٹ پیڈس اور کاپی کو پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔جو قصے کہانیاں ان سے سنتے آئے تھے یہ اوراق ان کو دہرانے لگے۔ الگ الگ رنگ کے مضامین ملے جن میں مزاح بھی تھا،تنقید بھی اور نصیحت بھی۔ جب میں نے ان سب کو پڑھا تو یہی خواہش ہوئی کہ اسے منظر عام پر لایا جائے۔ کافی محنت سے اسے رومن اسکرپٹ میں تیار کیا۔چونکہ مجھے اردو میں مہارت تو ہے نہیں اس لیے ضرورت تھی کہ اس کے لکھنے میں مجھ سے جو غلطیاں ہوئی ہیں اسے اشاعت سے پہلے درست کرلیا جائے۔اس سلسلے میں مولانا احمد رضا عزیزی صاحب (خطیب وامام مسجد الصالحین محلّہ داؤد چک) سے ملاقات ہوئی اور ہم نے کریکشن کا کام پورا کیا تو ان کی خواہش ہوئی کہ اسے اردو ہی میں شائع کیا جائے تاکہ یہ کتاب اہل علم کے پاس پہنچ جائے۔ان کی محنت سے آخر کار یہ کتاب اپنی اصلی شکل میں اور آج آپ تک پہنچ رہی ہے۔''(صفحہ نمبر۔12)

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ سوچ کر افسوس ہوا کہ اتنے قریب رہ کر بھی ایسی باغ و بہار شخصیت سے میری کبھی بالمشافہ ملاقات نہ ہوسکی۔بہرکیف!214 صفحات پر محیط ''ارمغان رافق'' ادب کے سنجیدہ قارئین کے لئے ایک تحفۂ خاص کا درجہ رکھتا ہے۔

''ارمغان رافق'' پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے صدر شعبۂ اردو،مونگیر یونیورسیٹی ڈاکٹر شاہد رزمی لکھتے ہیں:

> ''کئی شخصیتیں کثیر الجہات ہوتی ہیں جو بیک وقت کئی علوم وفنون اور زبانوں پر قدرت رکھتی ہیں اور دوسروں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں ۔ایسی ہی ایک جاذب نظر شخصیت پروفیسر سید رافق زماں صاحب کی تھی (جن کا

تعلق قدیمی خانقاہ شہباز یہ ملا چک شریف بھاگلپور سے ہے جو ہمیشہ سے ایک علمی گھرانہ رہا ہے) جو بظاہر علم طبیعات کے پروفیسر تھے تاہم ان کی دسترس کئی شعبوں تک تھی خواہ انگریزی ہو، اردو ہو، یا کہ فارسی حتیٰ کہ علم موسیقی اور دیگر مروجہ علوم و فنون پر ان کی گرفت قابل تحسین ہے۔'' (صفحہ نمبر۔14)

ڈاکٹر شاہد رزمی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے میں اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ اردو انگریزی اور فارسی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندی اور عربی زبان میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جس کا ثبوت اس کتاب میں جا بجا ملتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''قرآن پاک کے اختتام پر دو سورتیں رکھ دی گئیں ہیں۔ انہیں ہمیشہ ورد کرتے رہنا چاہیے۔ پہلی سورۃ ہے سورۂ فلق اور دوسری ہے سورۂ ناس۔ اس میں اللہ کی پناہ چاہتا ہے اللہ کا ہر بندہ چونکہ اصل پناہ دینے والا صرف اور صرف اللہ ہے۔ سورۂ فلق میں کہا جاتا ہے اے نبی آپ فرما دیجئے '' **قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الفَلَقِ**'' فرمایئے یا کہتے رہیے کہ میں پناہ چاہتا ہوں فلق کے رب سے۔ فلق کیا ہے پو پھٹنا یعنی رات کے اندھیرے کا ختم ہونا اور صبح کے اُجالے کا آغاز۔ اسی سے فالق الاصباح بنا ہے۔ کن چیزوں سے میں پناہ چاہتا ہوں؟ **مِن شَرِّ مَا خَلَقَ** ''۔ جو چیزیں تو نے تخلیق کی ہیں اُنکے شر سے پناہ چاہتا ہوں۔ **وَ مِن شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ** اور اندھیروں کے شر سے جب وہ ڈوبے۔ **وَ مِن شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي العُقَد** اور جادوگروں کے پھونک کے شر سے جو وہ گرہوں میں پھونک کر باندھتے ہیں اور جادو ٹونا کرتے ہیں، **وَ مِن شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ** اور حاسدوں کے شر سے جو حسد کرتے ہیں۔

اسی طرح سورہ والنّاس میں بھی پناہ چاہتے۔'' **قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاس**'' فرمایئے یا کہتے رہیے میں پناہ چاہتا ہوں انسانوں کے رب سے'' **مَلِكِ النَّاس**'' انسانوں کے حقیقی بادشاہ یا مالک سے ''**اِلٰهِ النَّاسِ** ''۔ انسانوں کے اللہ! یعنی معبود سے " **مِن شَرِّ الوسواسِ الخَنَّاسِ** ''شیطان یعنی خناس کے وسوسہ کے شر سے۔ **الَّذی یُوسوِسُ صُدُورِ النَّاسِ**'' وہ شیطان جو وسوسہ کرتا ہے انسانوں کے دلوں میں'' **مِنَ الجِنَّةِ وَ النَّاس** ''، جن والے شیطان اور انسان والے شیطان سے یعنی شیطان جنوں میں بھی ہیں اور انسانوں میں بھی۔'' (ڈائری کا ایک ورق، تاریخ 28.07.2008، صفحہ نمبر۔187)

ایک عمدہ نثر نگار کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اس مجموعے میں ایک غزل بھی

شامل ہے۔اس غزل کا مطلع، مقطع اور ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

گرداب وقت سیل بلا کو لپیٹ کر　　رکھ دے تو آنچلوں میں خودی کو سمیٹ کر
آسودگی نہیں ہے تری منزل حیات　　کرنا ہے جو بھی کار جنوں خالی پیٹ کر
روزی ملے گی، روٹی ملے گی، مکان بھی　　لا تقنطو کو سینے میں رکھ لے سمیٹ کر

کسی کتاب کی کامیابی کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے قاری جب اسے ایک بار شروع کرے تو پڑھتا ہی چلا جائے اور ختم کر کے ہی دم لے۔اس کتاب میں پروفیسر سید رافق زماں نے قدم قدم پر انشاء کے پھول کھلائے ہیں جن کی رنگت سے آنکھیں خیرہ اور جن کی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہو جاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

''لفظ دادا بھی عجیب تماشا ہے۔ ہمارے یہاں بہار میں باپ کا باپ، بنگال میں بڑا عالی، اور ممبئی یا بمبئی میں سارے علاقے کا باپ!!! (جوشان سے کہہ سکے رشتے میں تو ہم تمہارے باپ لگتے ہیں) اب دادا کے بعد بھائی کی باری آتی ہے۔ ہندو میں بھائی وہ ہوتا ہے جس کے سر پہ بہنیں شادی میں اپنا آنچل اور رکشا بندھن میں کلائی پر راکھی باندھتی ہیں اور مسلمان بہنیں جائیداد کا اچھا خاصہ حصہ بٹوا کر لے جاتی ہیں اور ہر قسم کی تقریب میں بھائی سے نقد و زیور وصولتی رہتی ہیں!! مگر دنیائے مجرمین میں بھائی وہ ہوتا ہے جس کی کلائی پر پولیس ہتھکڑی کی راکھی باندھ کر رشتہ اُستوار کرنے میں عموماً ناکام رہتے رہتے بوڑھی ہو جاتی ہے کیونکہ یہ بھائی بہت سارے منسٹروں اور سیاسی لیڈروں کا باپ یا بیٹا ہوتا ہے۔ رشتے میں نہ سہی تو کاروبار میں۔'' (کریلا، صفحہ نمبر 19)

عصر حاضر کی بے پردگی اور بے حیائی پر وہ طنز کے تیر چلاتے ہوئے کہتے ہیں:

''چاند کتنا ہی حسین سہی وہ بے پردہ ہے۔اس لیے غیر آباد ہے۔ وہاں پانی نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتا ہے جہاں شرم و حیا نہیں وہاں پانی کہاں؟

رحیمن پانی راکھیے بن پانی سب سون
پانی نہیں تو کچھ نہیں موتی مانُس چون

یہ دونوں طرح کے پانی کا ذکر ہے۔ پانی، جل، واٹر جو زندگی کے لیے اہم ضرورت ہے۔

جل ہی جیون ہے۔اور دوسرے شرم وحیا،تلوار کی دھار،عصمت،عفت یہ بھی پانی ہے۔موتی کی چمک یہ بھی پانی ہے۔موتی سیپ کے پردے میں اور سمندر کے تہ میں رہتا ہے اور جب باہر آتا ہے تو بازار میں بکتا ہے۔تاجوں اور زیوروں میں جڑا جاتا ہے اور نمائش کی شے بن جاتا ہے۔خاتون خانہ سے سبھا کی پری بننے کا یہ عمل ہر بے پردہ پر لاگو ہوتا ہے۔اس کی حد متعین کرنا دوسروں کا نہیں خود اس کا کام ہے جس نے پردہ ہٹایا ہے پردہ اٹھایا ہے۔وہ بے پردگی کی کس حد تک جانا چاہتا ہے وہ خود سوچے!اسی سے اس کے مقام کا تعین ہوگا۔آج دنیا بے شرم ہو چکی ہے، بے حیا ہو چکی ہے۔پھر بھی اگر کوئی حسینہ جسم کی نمائش کرتی ہے،کوئی مسخرہ گر ایم ایم ایس کرتا ہے،کوئی آوارہ اگر نازیبا حرکت کرتا ہے تو اتنا واویلا کیوں!اتنی چیخ پکار کیوں؟ اتنا ہنگامہ کیوں؟ کیس اور مقدمہ کیوں؟ قانون سے فریاد کیوں جب سب جائز ہے تو اسے بھی جائز کردو معاملہ ختم۔''(حباب کی سی ہے،صفحہ نمبر 33)

اسی خیال کو ایک دوسری جگہ یوں لفظوں کا جامہ پہناتے ہیں:

''آپ ایک بھی ٹی وی سیریل ایسا دکھا دیجئے جس میں اچھائی،اخلاق و مروت،اتفاق واتحاد،شرم و حیا کا ماحول پروان چڑھتا ہوا دکھایا جاتا ہو۔ٹی وی سیریل والوں کا جب بے حیائی دکھانے کا جی کرتا ہے ایک جشن برپا کرتے ہیں۔کسی انعامات کے تقسیم کے نام پر،کسی تہوار کے نام پر،مقابلہ رقص کے نام پر، اور پھر جو چاہتے ہیں دکھاتے ہیں۔ہر سیریل میں سازش کی نئی نئی ترکیبیں سکھائی جارہی ہیں۔رسم و رواج کے ساتھ بھونڈا مذاق کیا جارہا ہے۔ہماری ہندوستانی تہذیب کے ساتھ دھڑلے سے مغربی تہذیب کی برائیوں کو ری مکس کیا جارہا ہے۔''(آتش گل،صفحہ نمبر 38-37)

اردو ہماری مادری زبان ہے مگر خود ہم ہی اس کی قدر نہیں کرتے ہیں۔اردو کی زبوں حالی کی تمام تر ذمہ دار خود اردو والے ہی ہیں۔ملاحظہ فرمائیے:

''بوڑھوں کی ایک کھیپ رہ گئی ہے جو اردو پڑھتی ہے،اور اردو سمجھتی ہے ،اردو بولتی ہے،اردو لکھتی ہے۔نوجوان،کم عمر بچے،نونہال،سب عموماً اردو سے نابلد ہیں سوائے انکے جو کسی مدرسہ،مکتب یا یتیم خانہ میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

اس لیے بڑے بڑے سیمیناروں، نوحہ گروں کی مجالس اور قصیدہ خوانوں کی بزموں کے باوجود اردو ہندوستان میں اپنی موت آپ مر رہی ہے۔ چونکہ شاخوں پر چھڑکاؤ ہو رہا ہے شاخوں کو زندہ اور ہرا بھرا رکھنے کی مصنوعی مشقیں نمائش کے طور پر کی جارہی ہے اور جڑوں میں زہر ڈال دیا گیا ہے۔ جڑوں میں گھن کی نسل بٹھادی گئی ہے۔ چوہوں کی فوج متعین کر دی گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بول چال کی حد تک اگر اردو زندہ ہے تو اسکے لیے فلموں کا اور ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں کا احسان مند ہونا چاہیے، مذہبی جلسوں کا، قوالیوں کا اور مشاعروں کا۔ اور لکھنے پڑھنے کی حد تک اگر اردو زندہ ہے تو اسکے لیے ہمیں ممنون ہونا چاہیے مدرسوں کا مکتبوں کا، یتیم خانوں کا، اردو میڈیم اسکولوں کا، جنہیں عموماً دانشوران قوم وملت نظر تحقیر سے دیکھتے ہیں۔'' (شہر بھاگلپور: گہوارۂ علم وادب، صفحہ نمبر 46-45)

سید رافق زماں ایک زندہ دل انسان تھے اور زندگی کو برتنے کا فن اچھی طرح جانتے تھے۔ ایک جانب تو وہ مبلغ اور مصلح قوم نظر آتے ہیں اور دوسری طرف آج کل کے مشہور و مقبول مشاغل سے بھی غایت درجے کا لگاؤ رکھتے تھے۔ فلموں اور ٹی وی سیریئلس سے ان کی دلچسپی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

'' آج کے دور میں منفیت کا زور ہے اور Negativity عموماً کرداروں کو زیادہ دلچسپ بنادیتی ہے اور غیر معمولی بھی۔ مثلاً ہیرو جب ولن کا کردار نبھانے لگے، ولن ہیرو جیسے کام کرنے لگے، کامیڈین سیریس ہو جائے اور sob sisters ہنسانے لگیں تو یہ کتنا عجیب ہوگا۔ ابھی اخبار میں ایسی ہی ایک خبر نظر آئی کہ ''شعلے'' فلم کو دوبارہ بار دیگر بنایا جارہا ہے اور اس میں Big B یعنی امیتابھ بچن گبر سنگھ کا رول نبھائیں گے۔ جو ڈاکو نہیں بلکہ ڈاؤن ہوگا کیونکہ اب ڈاکو کہلانا بھی کسر شان سمجھا جانے لگا ہے اب تو ڈاؤن ہی زیادہ باوقار لگتا ہے۔''
(ہر بات پہ رونا آیا، صفحہ نمبر-58)

ایک مثال اور ملاحظہ فرمائیے:

''کل گھر پر اتوار منایا، سوچا تھا کرکٹ کا فائنل دیکھوں گا۔ اتفاقاً ایک پرانی فلم 'جس دیش میں گنگا بہتی ہے' چل رہی تھی۔ تھوڑی دیکھی دوسری طرف ''شعلے'' چل رہی تھی، وہ بھی دیکھی۔ پھر انکم ٹیکس Return بھروانے کے لیے

ضروری کاغذات تلاشنے میں سارا وقت گزر گیا اور ساڑھے تین بجے اپنے دوست جناب دلدار ہاشمی کے یہاں جا کر کاغذات حوالے کیا جو انکم ٹیکس کے وکیل ہیں اور مجموعی میرا ریٹرن بغیر اجرت بھرتے ہیں۔ یہ اُن کی کرم فرمائی ہے۔'' (ڈائری کا ایک ورق، صفحہ نمبر 148)

پروفیسر رافق زماں نئی پرانی فلموں، ان کے کلاکاروں، نغمہ نگاروں، موسیقاروں اور گلوکاروں کے بارے میں بھی وسیع معلومات رکھتے ہیں اور ان کا ذکر نہایت بے تکلفی کے ساتھ کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں بہت سارے قصے اور بے شمار لطیفے بھی یاد ہیں جنہیں وہ اپنی تحریر میں نگینوں کی مانند جڑنے کا ہنر جانتے ہیں۔ غالبؔ ایک ایسا شاعر ہے جس کی باتیں سب سے زیادہ کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں غالب کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ایک لطیفہ سن لیجیے مگر اس کی صداقت کی گارنٹی میں نہیں لیتا۔ سنا ہے کہ ایک ایسا موقع آیا تھا کہ غالب کو قرض کی شراب بھی میسر نہ ہوئی:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالب نے سوچا آج چلو نماز ہی پڑھ لیں۔ مسجد پہنچ گئے اور وضو کرنے لگے۔ کہیں ایک مداح غالب کو یہ خبر پہنچ گئی اور وہ از راہ محبت نفیس شراب کی ایک بوتل لے کر خانہ غالب پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا غالب تو نماز پڑھنے مسجد چلے گئے ہیں۔ خیر مسجد پہنچے اور باہر ہی سے غالب کو بوتل دکھائی۔ غالب وضو ختم کیے بغیر ہی انکی جانب لپکے۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا حضرت کہاں چل دیئے؟ غالب نے کہا جس کمبخت کی دعا وضو ہی میں قبول ہو جائے تو پھر نماز کی کیا حاجت۔'' (آؤ ہنسیں اور ہنسائیں، صفحہ نمبر 92-91)

ہر عاشق اردو کی طرح پروفیسر رافق زماں بھی اردو کی بے حرمتی اور پامالی پر خون کے آنسو روتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف تو اردو کے وجود کو مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے اور دوسری جانب اسے مسخ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جارہا ہے۔ کہتے ہیں کہ اردو ایک میٹھی اور پیاری زبان ہے لیکن اس کی ساری مٹھاس اس کے تلفظ میں پوشیدہ ہے۔ اگر اس کا تلفظ بگاڑ دیا جائے تو اس سے زیادہ کریہہ اور کوئی زبان نہ ہوگی۔ کہتے ہیں:

''اردو کو آج کل ہندیایا جا رہا ہے اور اسے ہردو بنایا جا رہا ہے؟ اُسکے لیے حرفوں پر ستم کی بجلی کثرت سے گرائی جا رہی ہے۔ سب سے زیادہ ''خ'' کا قتل عام کیا جا رہا ہے یعنی کھواب، کھوبصورت، کھوشی، کھدا، کھد وغیرہ وغیرہ قصداً بولا جا رہا ہے۔ پرانی ہندی فلموں کے گائک اور اداکار بہت صحیح تلفظ ادا کرتے تھے مگر آج کل ایسا کیوں نہیں ہے۔ اب تو مسلمان اداکار بھی یہی مسخ شدہ تلفظ ادا کرنے لگے ہیں۔ دوسرا حرف ''ق'' ہے جس کی درگت بنی ہے۔'' (ڈائری کا ایک ورق، صفحہ نمبر-140)

پروفیسر سید رافق زماں نے ایسے بہت سارے الفاظ کی نشاندہی کی ہے جن کا تلفظ جان بوجھ کر بگاڑ دیا گیا اور سب سے زیادہ افسوسناک صورت حال میرے نزدیک یہ ہے کہ اردو میں اعزازی ڈگریاں لینے والے، اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کا تلفظ خراب ہی نہیں بہت زیادہ خراب ہے۔ فراق گورکھپوری کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''فراق گورکھپوری ہندو ہوتے ہوئے بھی ذخیرہ الفاظ اور اُن کے تلفظ کے بادشاہ تھے بہت نازک طبع۔ سنا ہے کسی مشاعرے میں اُن کے قبل کوئی ہندی کے شاعر کی باری آ گئی جو تلفظ کے معاملے میں افسوسناک حد تک برے تھے۔ اپنا کلام پیش کرنے کے بعد انہوں نے اپنے دوست فراق سے پوچھا کہ آپ کو کیسا لگا۔ فراق بہت منہ پھٹ تھے۔ انہوں نے کہا'' مجھے ایسا لگا کہ میرے کانوں میں کوئی پیشاب کر رہا ہے۔'' (ڈائری کا ایک ورق صفحہ نمبر 141-140)

تلفظ ہی سلسلے میں ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں۔

''مجھے ایک ماسٹر صاحب کا لطیفہ یاد آ رہا ہے جو حقیقت ہے۔ ان کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے، (جو انگریزی کے ٹیچر تھے) ان کی درخواست میں لکھے کسی لفظ کی غلط Spelling پر ان کا مذاق سب کے سامنے اُڑایا۔ انہوں نے برجستہ کہا کہ اگر میری انگریزی ہنسنے کے لائق ہے تو آپ کی انگریزی رونے کے لائق چونکہ آپ فش کو فس، واز کو باج، اور روز کو روج بولتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر شرمندہ ہوئے یا نہیں مگر سنا ہے کہ اسی غصہ میں مولوی صاحب نے پوری ڈکشنری یاد کر لی اور بعد میں یہ عالم ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب جب کسی لفظ پر اٹکتے تھے تو مولوی

صاحب سے اُس کا معنی پوچھتے تھے۔" (ڈائری کا ایک ورق، صفحہ نمبر 142)

ان باتوں کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تلفظ کو بگاڑنے کے ساتھ بہت سارے الفاظ کے معنی بھی بدل دیئے گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''انکار کو منع کہا جا رہا ہے۔ مجھے کی جگہ میں نے استعمال کیا جا رہا ہے۔ جبکہ منع ہمیشہ کسی دوسرے کو کیا جاتا ہے اور انکار خود کرتے ہیں۔ مخالفت کی جگہ خلافت بولا جا رہا ہے۔ وقت کی دھارا عموماً زبان کو شفاف بناتی ہے اور یہی عمل اردو میں سدا جاری رہا جس کی وجہ سے بہت سارے الفاظ متروک ہوتے چلے گئے اور زبان شستہ ہوتی چلی۔ مگر آج گنگا میلی ہوتی چلی جا رہی ہے اور آلودگی بڑھتی جا رہی ہے یا قصداً بڑھائی جا رہی ہے۔'' (ہر بات پہ رونا آیا، صفحہ نمبر 60-59)

کہتے ہیں کہ شاعر و ادیب اپنی دنیا میں اس قدر مگن رہتے ہیں کہ وہ اپنے گھر اور گھر والوں کی طرف سے لگ بھگ لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ مگر پروفیسر رافق زماں اس معاملے میں سب سے الگ ہیں۔ انہیں اپنے گھر اور گھر والوں سے بہت لگاؤ تھا جس کا ثبوت اس کتاب میں جا بجا ملتا ہے۔ اور ان کی ڈائری کے اوراق اس کے گواہ ہیں۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال پر اکتفا کر رہا ہوں۔ لکھتے ہیں:

''آج موسم خوشگوار ہے۔ ہلکا ترشح (پھوہار) ہو رہی ہے۔ بزمی سلمہ اپنی گرمی کی تعطیل گھر پر گذار کر آج برہم پتر میل سے صبح ۸ بجے الہ آباد روانہ ہو گئے ہیں۔ گھر میں انکے آنے سے جو چہل پہل تھی وہ ختم ہو گئی۔ سماں بابو تین چار دن قبل پٹنہ سے اپنے جانگھ کی ہڈی کا آپریشن کرا کے لوٹے ہیں، ابھی بستر پر ہی ہیں، دیکھیں کب تک کھڑے ہو کر چلنے پھرنے کے لائق ہوتے ہیں۔'' (ڈائری کا ایک ورق، صفحہ نمبر 148)

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر سید رافق زماں ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ باغ ادب میں مسکراہٹوں کے یہ پھول ہمیشہ کھلتے رہیں گے اور ان کے قلم نے صفحۂ قرطاس پر جو گل بوٹے پیدا کیے ہیں ان کی دلکشی اور دلنوازی تادیر قائم رہے گی۔

◀◀ ● ▶▶

نام رسالہ: استفسار، بیاد وزیر آغا (شمارہ نمبر 35-36، جنوری، جون 2025)
مدیران: شین کاف ن، نظام، عادل رضا منصوری

پتہ:413،مہیما ہیریٹیج،سنٹرل اسپائن،ودیادھر نگر، جے پور(راجستھان)
Mobile:+982908800191
www.istifsaar.com
صفحات:436
قیمت:700روپے
مبصر:اقبال حسن آزاد

یہ رسالہ ''استفسار'' (ISSN 2394-0778) اردو ادب کا ایک سنجیدہ اور معتبر جریدہ ہے جو جے پور (راجستھان، ہندوستان) سے شائع ہوتا ہے۔اس کے مدیرانِ اعلیٰ شین کاشف نظام اور عادل رضا منصوری ہیں۔دونوں ہی اردو ادب کے فعال اور فکری طور پر بیدار اہلِ قلم ہیں جنہوں نے اس رسالے کو نہ صرف ادبی وقار عطا کیا ہے بلکہ اسے تنقید، تحقیق، شاعری، اور فکشن کے متوازن امتزاج سے ایک جامع ادبی مجلّہ بنا دیا ہے۔

''استفسار'' محض ایک رسالہ نہیں بلکہ اردو ادب کے معاصر منظرنامے میں ایک فکری مکالمہ ہے۔اس کے ہر شمارے میں موضوعاتی ربط، فکری گہرائی، اور تخلیقی تنوع نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔

موجودہ شمارہ جنوری– جون 2025 (شمارہ 36–35) ایک خصوصی اور کتابی سلسلے کے طور پر (بیادوزیرآغا) شائع ہوا ہے، جس کی ترتیب واشاعت نہایت خوبصورت اور پیشہ ورانہ معیار کی حامل ہے۔

اداریہ میں شین کاشف نظام نے مشرقی و مغربی شعریات کے تقابلی مطالعے کے حوالے سے نہایت بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔ رائنر ماریا رلکے (Rilke) کے ایک اقتباس سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے وہ شاعری کے علم و وجدان کو ایک مخصوص عرفانی تجربہ قرار دیتے ہیں۔

یہ اداریہ اپنے فکری مواد کے اعتبار سے اردو کے سنجیدہ قارئین کے لیے ایک علمی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں شاعری کی روح، وجدان، اور تخلیقی عمل پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔

رسالے کا فہرستِ مضامین اس کی وسعتِ فکر کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔اس میں درج ذیل اہم حصے شامل ہیں:

شمارے کا پہلا حصے ''یاد کے جھروکے میں'' ہے جس میں وزیر آغا کی یاد میں مختلف اہلِ قلم کی تحریریں شامل ہیں۔یہ حصہ بیک وقت تحقیقی، تجزیاتی اور شخصی نوعیت کا ہے جس میں رشید امجد، انور سدید، سجاد نقوی، اقتدار جاوید اور رؤف خیر کے مضامین شامل ہیں۔

''جیسا سمجھا، جیسا جانا'' کے زیرِ عنوان وزیر آغا کے نظریات پر تفصیلی مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔تنقید،

ادبی نظریہ،اور فلسفۂ فن کے حوالے سے یہ حصہ علمی ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے قیمتی سرمایہ ہے۔اس حصّے میں شہناز نبی، رفیق سندیلوی، ناصر عباس نیر،شافع قدوائی، امین راحت چغتائی، رفیق سندیلوی،نند کشور آچاریہ،مصور سبزواری،خالد جاوید،شہزاد انجم،سرورالہدی،معراج رعنا،منور عثمانی،صوبیدار محمد رفیع اظہر،شبیر احمد،عابد خورشید،ایم۔خالد فیاض،سفینہ بیگم،عمر فرحت،معاذ احمد اور فیضان الحق کے خیالات شامل ہیں۔

''تخلیق اور تفہیم کے تحت''مختلف ناقدین و محققین نے اردو شاعری،تنقید،اور جمالیات پر مدلل مضامین تحریر کیے ہیں،جن میں بلراج کومل، کمار پاشی،شمس الرحمٰن فاروقی، مرزا حامد بیگ،قمر جمیل،عزیز پریہار پروین طاہر،مقصود دانش، نجمہ منصور، ذوالفقار احسن،نثار راہی،شہرام سرمدی اور عنبر کے نام نامی اسم گرامی شامل ہیں۔

ایم۔خالد فیاض، سفینہ بیگم، عمر فرحت، اور فیضان الحق کے مقالات خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ادبی رسائل میں انٹرویوز شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن استفسار کے زیر نظر شمارے میں اس سلسلے میں ایک نیا تجربہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وزیر آغا سے لیے گئے مختلف انٹرویوز کے اہم سوالات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے جس سے ندرت پیدا ہوگئی ہے۔یہ شمارہ دراصل وزیر آغا کی یاد میں ایک خصوصی نمبر ہے،جس میں ان کے فن،فکر،تنقید،اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔اردو ادب میں وزیر آغا کی حیثیت کسی دبستانِ فکر کے بانی کی سی ہے۔ان پر اس قدر جامع اور علمی انداز میں گفتگو اس سے قبل کسی اور رسالے میں کم ہی دیکھنے کو ملی۔ان کے نظریۂ جمالیات،شعریات،اور ''انسانی تجربے کی روحانی توسیع'' پر متعدد علمی مضامین اس شمارے کو تحقیقی وتنقیدی ادب کے لیے ایک مرجع بناتے ہیں۔طباعت اعلیٰ معیار کی ہے۔کاغذ اور سرورق کا ڈیزائن (جسے جمالیاتی ذوق سے آراستہ کیا گیا ہے) دیدہ زیب ہے۔ترسیلِ زر کی معلومات (بشمول ویب سائٹ اور ای میل) رسالے کی تنظیمی شفافیت کو ظاہر کرتی ہیں۔مدیران نے بین الاقوامی سطح پر قارئین کے لیے رابطہ آسان بنا دیا ہے، جو ایک مثبت پہلو ہے۔مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''استفسار'' (جنوری – جون 2025) اردو کے سنجیدہ ادب دوستوں کے لیے ایک علمی، تحقیقی، اور فکری مجلّہ ہے جو اپنے موضوع، ترتیب، اور معیارِ تحریر کے لحاظ سے اردو جرائد میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔یہ شمارہ وزیر آغا کے فکری ورثے کو نئی نسل کے ذہنوں تک منتقل کرنے کا قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔

استفسار اردو ادب کے مکالماتی شعور کا استعارہ ہے جہاں ادب صرف پڑھا نہیں جاتا، سمجھا بھی جاتا ہے۔رفیق سندیلوی، امین راحت چغتائی، خالد جاوید، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کی تحریریں اس شمارے کو غیر معمولی اہمیت دیتی ہیں۔

نام کتاب: جان عالم
صنف: ناول
ناول نگار: عرفانہ تزئین شبنم
ترتیب وتدوین: پروفیسر یم۔محمد سہیل
اشاعت اول: ماہنامہ بیسویں صدی، دہلی (بارہ قسطوں میں) اکتوبر 1997 تا ستمبر 1998
اشاعت دوم: بشکل مکمل ناول: 2021
صفحات: 261 قیمت: 250/ روپے
مبصر: اقبال حسن آزاد

عرفانہ تزئین شبنم کا تعلق تمل ناڈو کے وانمباڑی سے ہے۔وہی وانمباڑی جس نے حجاب امتیاز علی تاج جیسی نابغہ روزگار کو پیدا کیا تھا۔

ناول ''جانِ عالم'' عرفانہ تزئین شبنم کا ایک خوبصورت تخلیقی اظہار ہے جس میں جذبات، احساسات اور انسانی رشتوں کی نزاکتوں کو نہایت فنی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کی نثر سادہ مگر دل کو چھو لینے والی ہے، اور کردار زندگی کی حقیقتوں سے جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ پروفیسر ایم۔محمد سہیل کی ترتیب وتدوین نے اس تصنیف کو علمی وقار عطا کیا ہے۔مجموعی طور پر ''جانِ عالم'' اردو ناول نگاری میں ایک خوشگوار اضافہ ہے جو قاری کو غور وفکر پر آمادہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر شمع افروز زیدی، مدیرہ بیسویں صدی، دہلی اس ناول کے سلسلے میں لکھتی ہیں:

''عرفانہ کے اسلوب میں بے ساختگی، اور انداز گفتگو سادہ ہے۔زبان گھریلو اور حقیقت سے نزدیک ہونے کے سبب یہ ایک کامیاب ناول کے زمرے میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔میں عرفانہ تزئین شبنم کو اس کامیاب تخلیق کے لیے مبارک باد پیش کرتی ہوں، ساتھ دعا گو بھی۔اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔''

◀◀ ● ▶▶

کتاب کا نام: "حرفِ نقد"
مصنف: ڈاکٹر ارشد رضا
صنف: تنقید
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
سنِ اشاعت: 2024

قیمت:250روپے
صفحات:128
ISBN:978-93-6062-937-3
رابطہ:ڈاکٹرارشدرضا،بھیکن پور،اسلام نگر،بھاگلپور(بہار)
موبائل:9431090440
مبصر:اقبال حسن آزاد

ڈاکٹر ارشد رضا کی تصنیف ''حرفِ نقد'' ایک نہایت اہم اور جامع تنقیدی مجموعہ ہے جس میں اردو ادب، بالخصوص شاعری، تنقید اور ادبی رویّوں پر گہری بصیرت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مصنف کا اندازِ تحریر سنجیدہ، شائستہ اور علمی وقار سے معمور ہے۔ کتاب کا عنوان ہی اس کے مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ ''حرفِ نقد'' یعنی وہ لفظ جو فکری و تنقیدی بصیرت کے ساتھ کہا جائے۔

یہ کتاب ڈاکٹر ارشد رضا کے تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جو مختلف ادوار اور شخصیات کے حوالے سے اردو ادب کے فکری و فنی رجحانات کا احاطہ کرتی ہے۔

کتاب میں کل 16 مضامین شامل ہیں، جیسا کہ فہرستِ مضامین سے ظاہر ہے۔ ان میں مختلف شعرا، ناقدین اور ادبی تحریکات پر تحقیقی اور تنقیدی گفتگو کی گئی ہے۔

چند اہم مضامین درج ذیل ہیں:

نذیر احمد کی ناول نگاری: ابن الوقت کی روشنی میں......نذیر احمد کی فکری جہتوں اور ان کی سماجی بصیرت پر مبنی ایک عمدہ تنقیدی مضمون ہے۔

امراؤجان ادا......ایک تعارف

تخلیقی شعور کا اظہار......گئودان۔

شناخت کی بصارت اور نادید

اردو افسانہ: 1980 کے بعد......مابعد جدیدیت کے پس منظر میں اردو افسانے کے نئے رجحانات کا تجزیہ۔

ترجیحی تنقید اور ادبی شعور (اردو تنقید میں معیارات کی تبدیلیوں پر ایک فکری مضمون)

افسانوی روایت اور پریم چند کے افسانے

اکبر کی شاعرانہ انفرادیت (اکبر کی طنزیہ شاعری کے سماجی و تہذیبی پس منظر کا مدلل جائزہ)

ان مضامین سے ڈاکٹر ارشد رضا کی تحقیقی گہرائی، مطالعے کی وسعت اور زبان و بیان پر غیر معمولی دسترس کا ثبوت ملتا ہے۔

ان کے علاوہ پردہ غفلت، انارکلی، خانہ جنگی، فرحت اللہ بیگ، انجم مانپوری، مولانا ابوالکلام آزاد، موازنہ انیس و دبیر، سحر البیان اور نظیر اکبرآبادی پر بھی عمدہ مضامین قلم بند کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر ارشد رضا کا تنقیدی رویہ محض تاثر یا تکرار پر مبنی نہیں بلکہ علمی استدلال اور تحقیقی منہج پر استوار ہے۔

ان کے ہاں تنقید کا مقصد محض خامیوں کی نشاندہی نہیں بلکہ ادب کی فکری و جمالیاتی قدر کا تعین ہے۔ وہ ادب کو محض تفریح یا اظہارِ ذات نہیں بلکہ سماجی شعور کا آئینہ سمجھتے ہیں۔

ان کی تنقید میں جدیدیت اور روایت دونوں کے توازن کی جھلک نمایاں ہے......ایک ایسا توازن جو اردو تنقید کے لیے ناگزیر ہے۔

کتاب کی نثر نہایت رواں، شستہ اور علمی ہے۔ مصنف نے مشکل علمی اصطلاحات کے باوجود تحریر کو عام قاری کے لیے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ جملوں میں ایک ادبی چاشنی اور لسانی تہذیب پائی جاتی ہے۔

ان کے تنقیدی اسلوب میں استدلال، حوالہ اور تجزیہ تینوں کی خوبصورت آمیزش ہے۔

کتاب کے آغاز میں شامل ''سوانحی کوائف'' کے مطابق، ڈاکٹر ارشد رضا ایک سنجیدہ محقق اور صاحبِ مطالعہ ادیب ہیں۔ وہ تدریس، تحقیق اور تصنیف کے میدان میں سرگرم ہیں اور ان کی علمی تربیت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔

وہ سہ ماہی ''اندیشہ'' کے مدیر بھی ہیں۔

کتاب کے پسِ ورق پر اقبال حسن آزاد نے بھی مصنف کی تنقیدی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کے علمی رویے کی پختگی پر اظہارِ اطمینان کیا ہے۔

کتاب کی طباعت اور سرورق دونوں دیدہ زیب ہیں۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (نئی دہلی) کی طباعت ہمیشہ کی طرح عمدہ ہے۔ کاغذ اعلیٰ معیار کا ہے اور کتاب کی پیشکش دلکش ہے۔

سرورق پر ایک علامتی پینٹنگ ''نقد'' کے مفہوم کو فکری گہرائی کے ساتھ ظاہر کرتی ہے جیسے لفظ اور معنی کا باہمی رشتہ ایک تخلیقی اظہار میں ڈھل گیا ہو۔

''حرفِ نقد'' اردو تنقید کے جدید رجحانات کا نمائندہ مجموعہ ہے۔

یہ نہ صرف طلبہ و محققین کے لیے مفید ہے بلکہ عام ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے بھی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔

ڈاکٹر ارشد رضا کی یہ تصنیف اردو تنقید میں ایک سنجیدہ اضافہ ہے، جو قاری کو فکری مکالمے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

''حرفِ نقد'' اردو تنقید کی روایت میں ایک معتبر اور تازہ اضافہ ہے۔ ڈاکٹر ارشد رضا نے اس کتاب کے ذریعے نہ صرف اپنی علمی بصیرت کا ثبوت دیا ہے بلکہ اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کو ایک فکری تحفہ پیش کیا ہے۔

◀ ● ▶

نام کتاب: سنو فال
صنف: افسانہ
مصنف: اسلم سلازار
سال اشاعت: 2020
صفحات: 144
قیمت: 350 روپے
رابطہ: 9771083747
9830583747
مبصر: اقبال حسن آزاد

''سنو فال'' اسلم سلازار کا ایک خوبصورت افسانوی مجموعہ ہے جس میں زندگی، معاشرت، انسانی احساسات، رشتوں اور وقت کی تبدیلیوں کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں مصنف نے اپنے مشاہدات، تجربات اور تخیلات کو کہانیوں کی صورت میں اس طرح سمویا ہے کہ قاری حقیقت اور افسانے کے درمیانی باریک فرق کو بھول جاتا ہے۔

کتاب کا عنوان "Snow Fall" بظاہر برف باری کی طرف اشارہ کرتا ہے، لیکن علامتی طور پر یہ سرد مہری، خاموشی، یادوں کی سفیدی اور وقت کے جمود کی نمائندگی کرتا ہے۔ افسانوں میں یہ علامت کئی جگہ قاری کو محسوس ہوتی ہے — جہاں کرداروں کے اندرونی موسم بدلتے ہیں مگر باہر خاموش برف کی طرح سب کچھ ساکت دکھائی دیتا ہے۔

کتاب میں شامل افسانے جیسے ''سنو فال''، ''کشکول''، ''رکا ہوا موسم''، ''تیسری آنکھ کا خواب''، ''زرد مٹھی کا حادثہ'' اور ''لہولہو گلاب'' وغیرہ — انسان کی تنہائی، وجودی کشمکش، محبت کی ناپائیداری اور سماجی تضادات جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

اسلم سلازار کے افسانوں میں فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ بیانیے کی سادگی بھی ہے۔ وہ روزمرہ کے عام کرداروں کے ذریعے غیر معمولی احساسات کو بیان کرتے ہیں۔

اسلم سلازار کا اسلوب سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ جملے مختصر اور پراثر ہیں۔ مکالمات میں فطری روانی ہے اور منظر کشی میں ایک شاعرانہ لطافت محسوس ہوتی ہے۔ وہ جذبات کو براہِ راست بیان کرنے کے بجائے علامتوں اور اشارات کے ذریعے قاری تک پہنچاتے ہیں، جو ان کے فن کی خوبی ہے۔

''سنو فال'' کو اردو افسانے کی جدید روایت میں ایک قابلِ ذکر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ مصنف نے روایتی بیانیے کے ساتھ ساتھ عصری احساسات کو خوبصورتی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اس میں نہ صرف فن کی پختگی نظر آتی ہے بلکہ ایک نئی نسل کے افسانہ نگار کے طور پر اسلم سلازار کی ادبی بصیرت بھی واضح ہوتی ہے۔

''سنو فال'' ایک ایسا افسانوی مجموعہ ہے جو قاری کو سوچنے، محسوس کرنے اور خاموشی میں ڈوب جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اس میں دکھ، محبت، جدائی اور زندگی کے بدلتے رنگ سبھی کچھ موجود ہیں ...... اور یہی اس کی کامیابی ہے۔

''سنو فال'' احساسات کی برف باری ہے جو دل پر گرتی ہے، مگر اپنے اندر گرمیِ محبت، دکھ اور انسانیت کے رنگ چھپائے ہوئے ہے۔

◀◀ ● ▶▶

کتاب کا نام: شجرۃ الیقین فی جنت النعیم

موضوع: ملفوظاتِ شیخ الاسلام حضرت سید شاہ غلام نجف قادری قدس اللہ سرہ

جامع: حضرت مولانا شاہ رضا حسین ارزانی شاہی

ترتیبِ نو و تدوین: پروفیسر سید شاہ حسین احمد

سالِ اشاعت: 2025

قیمت: 150 روپے

مبصر: اقبال حسن آزاد

یہ کتاب دراصل حضرت شیخ الاسلام سید شاہ غلام نجف قادری قدس سرہ کے ملفوظات یعنی وعظ و ارشادات کا مجموعہ ہے۔

ان ملفوظات میں دینی علوم، روحانیت، تصوف، اصلاحِ باطن، محبتِ الٰہی، اتباعِ سنت اور

خدمتِ خلق جیسے موضوعات پر گہرے نکات موجود ہیں۔

یہ ملفوظات سادہ مگر پراثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں جو قاری کے دل پر براہِ راست اثر ڈالتے ہیں۔

کتاب کا عنوان ''شجرۃ الیقین'' خود اس کے مرکزی پیغام کی عکاسی کرتا ہے — یعنی ایمان و یقین کا درخت جو دلوں میں ثمراتِ معرفت پیدا کرتا ہے۔

حضرت شاہ غلام نجف قادریؒ کے کلام میں قرآن و سنت کی روشنی، تصوف کی لطافت، اور عملی اصلاح کا امتزاج نمایاں ہے۔

یہ کتاب سالکینِ طریقت اور روحانیت کے طلبگاروں کے لیے ایک قیمتی رہنمائی کا ذریعہ ہے۔

پروفیسر سید شاہ حسین احمد نے کتاب کو علمی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کتاب کے مواد کو نہایت مرتب، منظّم اور سہل فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے تاکہ عام قاری بھی آسانی سے استفادہ کر سکے۔

اس میں اردو و عربی کے امتزاج نے اس کی ادبی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔

کتاب کی اشاعت خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی، پٹنہ سے عمل میں آئی ہے، جو برصغیر کی ایک قدیم اور معتبر روحانی درسگاہ ہے۔ اس نسبت سے یہ کتاب نہ صرف ملفوظاتِ اولیاء بلکہ خانقاہی روایت کی تسلسل کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔

قیمت 150 روپے رکھی گئی ہے، جو اس درجے کی علمی و روحانی کتاب کے لحاظ سے بہت مناسب ہے۔

طباعت بھی معیاری ہے، اور کمپوزنگ و سرورق نہایت عمدہ ذوق کا مظہر ہیں۔

''شجرۃ الیقین فی جنت النعیم'' ایک ایسی کتاب ہے جو: قاری کے ایمان کو مضبوط کرتی ہے، روحانیت کے سفر میں روشنی فراہم کرتی ہے، اور تصوف کی صحیح فہم عطا کرتی ہے۔

یہ کتاب علماء، مشائخ، طلبہ، اور عام اہلِ دل حضرات کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نام رسالہ: دیوان پٹنہ

مبصر: اقبال حسن آزاد

یہ رسالہ ''دیوان، پٹنہ'' (Diwan Patna) ہے، جو خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانیؒ، پٹنہ کی جانب سے شائع کیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ ستمبر 2021 تا جون 2025 کے عرصے پر مشتمل ہے۔ اس

کا شمار بلاشبہ خانقاہی اور علمی روایت کے امتزاج کے ایک خوبصورت تسلسل کے طور پر کیا جا سکتا ہے۔

''دیوان'' ایک علمی، دینی اور ادبی مجلّہ ہے جو اپنے مندرجات اور اندازِ پیشکش کے لحاظ سے سنجیدہ قارئین کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے۔ اس کے صفحات میں روحانیت، تصوف، سیرت، اور اردو ادب کے رنگ جمیل امتزاج کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ مجلّے کی طباعت، ترتیب اور جلد بندی بھی نہایت خوبصورت اور معیاری ہے، جو اس کے مدیران کی سنجیدگی اور ذوقِ سلیم کی عکاسی کرتی ہے۔

یہ رسالہ خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانیؒ کی علمی و روحانی سرگرمیوں کا مظہر ہے۔ اس خانقاہ کا تاریخی پس منظر علم و عرفان سے وابستہ ہے، اور یہ رسالہ اسی روایت کو آگے بڑھانے کی ایک منظّم کوشش ہے۔ اس میں شامل مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادارہ نہ صرف روحانیت کی ترویج میں سرگرم ہے بلکہ علمی اور ادبی سطح پر بھی تحقیق و مطالعہ کی روایت کو فروغ دے رہا ہے۔

ادارتی ٹیم نے رسالے کے ہر گوشے میں توازن قائم رکھا ہے۔

اداریے میں جہاں ادارے کی پالیسی اور حالیہ علمی موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔ عرفانیات کے حصے میں تصوف، روحانیت اور سلوک کی باریکیاں بیان کی گئی ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع سید شاہ حسین احمد، زین رامش، پروفیسر محمد صادق حسین کے اہم مضامین، مشاہیر کی تحریریں اور تنقیدی مطالعے شامل ہیں۔

ادبیات کے ذیل میں پروفیسر سید شاہ حسین احمد، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر محمد سرور علی، اور ڈاکٹر اجے مالوی، مولانا طلحہ نعمت، ڈاکٹر نازنین فاطمہ اور محمد منہاج انصاری کے مضامین شامل ہیں۔

غزلوں اور نظموں کا انتخاب خاص طور پر نمایاں ہے، جن میں چندر بھان خیال، ڈاکٹر الطاف امجدی، فہیم اختر، اثر فریدی اور ڈاکٹر اطہر مبین قریشی جیسے اہلِ قلم شامل ہیں۔

یہ تنوع رسالے کو ایک ہمہ جہت مطالعہ بنا دیتا ہے۔

رسالے کی خاص خوبی اس کے تحقیقی مضامین ہیں۔ ہر تحریر میں استناد، علمی حوالہ اور صوفیانہ گہرائی نمایاں ہے۔ خاص طور پر وہ مضامین جو خانقاہی روایات اور روحانی سلاسل پر مبنی ہیں، قاری کے دل پر اثر کرتے ہیں۔

ادبی تحریروں میں زبان و بیان کی صفائی، فکری گہرائی اور جذبے کی شدت محسوس ہوتی ہے۔ شعری حصہ رسالے کو جمالیاتی توازن فراہم کرتا ہے۔ جدید و قدیم اسلوب کا حسین امتزاج اسے دیگر خانقاہی جرائد سے ممتاز بناتا ہے۔

''دیوان'' ایک ایسا علمی و روحانی جریدہ ہے جو نہ صرف خانقاہی دنیا کے لیے بلکہ عام قارئینِ ادب

وتحقیق کے لیے بھی مفید ہے۔اس میں علم،ادب،اورتصوف کے درمیان ایک زندہ ربط قائم کیا گیا ہے۔

یہ کہنا بجا ہوگا کہ ''دیوان'' خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانیؒ کی فکری و روحانی خدمت کا ایک روشن تسلسل ہے۔

اگر چہ یہ ایک خانقاہی اشاعت ہے،مگر اس کا دائرہ اثر بہت وسیع ہے۔اس رسالے کی ہر اشاعت اردوعلمی دنیا میں ایک تازگی کی لہر پیدا کرتی ہے۔

مدیرانِ دیوان خصوصاً سید شاہ حسین احمد الرشید شاہ تنویر احمد اوران کی ادبی ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے کہ انہوں نے اس روایت کو سنجیدگی،علمیت،اور خلوص کے ساتھ زندہ رکھا ہے۔

◄◄ ● ►►

نام کتب:

1۔قندزقند(تیسرا ایڈیشن 2024)

2۔قندمکرر(دوسرا ایڈیشن 2024)

3۔بال کی کھال(دوسرا ایڈیشن 2024)

مبصر:اقبال حسن آزاد

فیاض احمد فیضی کا شماراردو کے اُن معاصر مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے مزاح کو صرف ہنسی تک محدود نہیں رکھا بلکہ سماجی بصیرت،انسانی رویّوں کی تہہ داری اور عصرِ حاضر کے تضادات کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ان کی تحریروں میں ظرافت،دانش،اورزبان کی نفاست یکجا نظر آتی ہے۔

تینوں کتابیں......قندزقند،قندمکرراور بال کی کھال......ان کے مزاحیہ فن کے مختلف ادوار اور رنگوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

قندزقند فیاض احمد فیضی کی تخلیقی شوخی کا پہلا نمایاں مظہر ہے۔

عنوان ہی سے ایک لسانی کھیل جھلکتا ہے۔''قند'' کی تکرار میں طنز، ہلکی سی خودنوائی، اور معاشرتی تناسب کی کمی کی طرف اشارہ ہے۔

اس کتاب کے مضامین میں روزمرہ زندگی کے لطیف تجربات،سماجی توازن کی کمی،اورانسان کی خودساختہ عظمت کے پرہنسی اڑائی گئی ہے۔

فیضی کی زبان یہاں شگفتہ،رواں اورلطیف ہے۔وہ اردو کے کلاسیکی مزاح سے متاثر ضرور ہیں، مگراُن کا اسلوب جدید شہری حسِ مزاح کا مظہر ہے۔

یہ کتاب فیاض احمد فیضی کی فکری اور فنی بلوغت کی نمائندہ ہے۔

لفظ ''زقند'' (یعنی چھلانگ) مزاح کے اس مرحلے کی طرف اشارہ ہے جہاں فیضی کا قلم ہنسی کے ساتھ ساتھ تنقید کی چھلانگ بھی لگاتا ہے۔

یہاں ان کے موضوعات میں سیاست، معاشرت، تعلیمی نظام، اور سماجی نفاق جیسے پہلو نمایاں ہیں۔

فیضی اپنے قاری کو صرف ہنساتے نہیں، سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ طنز کی کاٹ نرم ہے، مگر اس میں فکر کی تیزی چھپی ہوئی ہے۔

کتاب کا مزاج مزاحیہ ضرور ہے مگر اس میں فیضی کا تجزیاتی ذہن اور ادبی پختگی جھلکتی ہے۔ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے مضامین نے اس کتاب کو وقار عطا کیا ہے جبکہ ڈاکٹر لطف الرحمٰن اور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے شذرات نے اس کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔

کتاب ''قندِ مکرر'' از فیاض احمد فیضی ایک فکرانگیز اور متنوع تخلیقی مجموعہ ہے جس میں ادبی، تنقیدی اور شخصی تحریروں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ کتاب کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے نہ صرف ادبی شخصیات اور شاعری کے فکری پہلوؤں پر گفتگو کی ہے بلکہ اپنے تاثرات، یادداشتوں اور تجزیاتی مطالعوں کے ذریعے اردو ادب کے قاری کو ایک سنجیدہ فکری فضا میں داخل کیا ہے۔

کتاب کا عنوان ''قندِ مکرر'' خود اس بات کی علامت ہے کہ فیاض احمد فیضی ادب کی مٹھاس کو بار بار چکھنے اور چکھانے کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر لطف الرحمٰن اور پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی جیسے اہلِ علم کی آراء سے کتاب کی علمی وقعت مزید بڑھ گئی ہے۔ ساتھ ہی یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، سلمیٰ صدیقی، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور اسیم کاویانی نے بھی مجموعے پر اظہار خیال کیا ہے۔

اسلوب رواں، زبان شستہ اور خیال سنجیدہ ہے۔ مجموعی طور پر ''قندِ مکرر'' ایک ایسی تحریری کاوش ہے جو اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے نہ صرف لذتِ مطالعہ بلکہ فکری اثاثہ بھی ہے۔

''بال کی کھال'' فیاض احمد فیضی کے طنزیہ شعور کی انتہا کو چھوتی ہے۔ خود عنوان سے ظاہر ہے کہ وہ یہاں زندگی کی باریکیوں، تضادات اور چھوٹی باتوں میں چھپے بڑے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔

''بال کی کھال'' میں مزاح صرف تفریح نہیں بلکہ سماجی نفسیات کا مطالعہ بن جاتا ہے۔

فیضی کا انداز یہاں کہیں کہیں اشفاق احمد یا پطرس بخاری کی یاد دلاتا ہے، مگر وہ اپنے مخصوص طنزیہ آہنگ سے الگ پہچان بناتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں محاوراتی چستی، دلکش جملے، اور طنز کی تہذیبی نرمی

نمایاں ہے۔فیاض احمد فیضی کی زبان سادہ مگر پراثر ہے۔جملے مختصر مگر طنزیہ چمک کے ساتھ موجود ہیں۔مزاح کبھی تلخ نہیں ہوتا، ہمیشہ انسانی ہمدردی کے پردے میں لپٹا ہوا ہے۔فیضی کا قاری مسکراتا بھی ہے اور جھنجھلاتا بھی، کیونکہ وہ سچائی کو ہنسی کے آئینے میں دکھاتے ہیں۔

فیاض احمد فیضی کے یہ تینوں مجموعے اردو طنز ومزاح کی جدید روایت کے اہم سنگِ میل ہیں۔قند زقند میں شگفتگی، قند مکرر میں شعور، اور بال کی کھال میں باریک بینی......تینوں مل کر ایک ایسے مزاح نگار کا پورا خاکہ پیش کرتے ہیں جو قلم سے نہیں، آئینے سے طنز کرتا ہے۔

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فیاض احمد فیضی کی تحریر کے نمایاں پہلو سادہ زندگی کے لطیف تجربوں، سماجی طنز اور فکری کی گہرائی، متوازن مزاح، شگفتگی اور مشاہدہ حیات ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

نام کتاب: نثری اصناف ادب اور طنز ومزاح کی روایت
مصنف: اقبال حسن آزاد
صنف: تحقیق وتنقید
صفحات: 264 قیمت: 500
ناشر: میٹرلنک پبلیکیشنز، لکھنؤ
مبصر: ڈاکٹر مشتاق احمد (پرنسپل، سی، ایم کالج، دربھنگہ)

پروفیسر اقبال حسن آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔وہ بہ یک وقت ایک تخلیقی فنکار یعنی ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر کے ساتھ ساتھ محقق وناقد اور ادبی صحافی ہیں۔عصر حاضر میں سوشل میڈیا پر اپنی تخلیقی بصیرت وبصارت کو پیش کرنے میں جس قدر فعال ہیں وہ بھی قابل رشک ہے۔پروفیسر آزاد پیشہ درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں۔بہ حیثیت اردو زبان وادب کے پروفیسر اور بطور پرنسپل درس و تدریس کے ساتھ ساتھ انتظامی امور کو انجام دیتے رہے ہیں۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی ان کی علمی وادبی فعالیت برقرار ہے۔موصوف ''ثالث'' جیسے مؤقر ادبی رسالہ کے مدیر ہیں۔ان کے تنقیدی وتحقیقی مضامین کے ساتھ ساتھ تخلیقی شہ پارے ملکی اور بین الاقوامی رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

پیش نظر کتاب ''نثری اصناف ادب اور طنز ومزاح کی روایت'' ان کی ایک تحقیقی وتنقیدی کاوش ہے۔زیر تبصرہ دوسرا ایڈیشن مع ترمیم واضافہ ہے۔واضح ہو کہ اس کا پہلا ایڈیشن 2014ء میں شائع ہوا تھا اور زیر نظر ایڈیشن 2025ء ہے۔غرض کہ ایک دہائی میں انہوں نے اپنی اس تحقیقی وتنقیدی کتاب میں خاطر

خواہ ترمیم واضافے کئے ہیں جس کا اعتراف انہوں نے حرف آغاز میں بھی کیا ہے۔

اردو زبان وادب میں طنز ومزاح کی روایت بہت مستحکم ہے۔ اس کے آغاز وارتقا پر فاضل مصنف نے نہ صرف تحقیقی وتنقیدی نگاہ ڈالی ہے بلکہ طنز ومزاح کی ادبی حیثیت بھی متعین کی ہے۔ دنیا کی دیگر زبانوں میں اس صنف کی کیا اہمیت اور افادیت ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے اردو میں طنز ومزاح کی تاریخ اور سمت ورفتار کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور اصناف ادب میں طنز ومزاح کی پیشکش پر نہ صرف تبصرہ کیا ہے بلکہ اردو نثر نظم دونوں میں طنز ومزاح کی تاریخی اہمیت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ بقول مصنف:

> ''طنز ومزاح کا سرمایہ نہ صرف کسی زبان کی نشوونما کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اہل زبان کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد بھی دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لازم ہے کہ اس سرمایے کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تاکہ نہ صرف اس سرمایے کی ادبی اہمیت واضح ہو سکے بلکہ مختلف ادوار کی سماجی اور سیاسی تحریکات کی طرف اس عہد کے عام لوگوں کے ردعمل کی تصویر بھی صاف طور پر نظر آ سکے۔'' (ص:13)

بلاشبہ عالمی ادب میں طنز ومزاح کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور اردو میں بھی اس صنف کو دور آغاز سے ہی غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ فاضل مصنف نے انشاء اللہ خاں انشاء، حیدر بخش حیدری، میر امن دہلوی، رجب علی بیگ سرور، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پریم چند، امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی، کرشن چندر، آغا حشر کاشمیری محمد عمرالحی، خواجہ حسن نظامی، پطرس بخاری، سرسید احمد خاں، مرزا غالب، مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر مشتاق احمد یوسفی، فکر تونسوی اور احمد جمال پاشا تک طنز ومزاح کے سمت ورفتار کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو زبان میں بھی اس کی علمی وادبی اہمیت مسلم ہے۔ ظاہر ہے کہ طنز اور مزاح ہر ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی بلکہ ایک ذہین وفطین اور حساس قلم کار ہی طنز ومزاح کے صحرا میں گل کھلا سکتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو کے طنز ومزاح نگاروں نے انسانی زندگی اور انسانی معاشرے کی تمام تر ناہمواریوں کو اپنی تخلیقیت کے ذریعہ فن طنز وظرافت کو معیار و وقار بخشا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو زبان وادب کے سنجیدہ قارئین پروفیسر اقبال حسن آزاد کی اس تحقیقی کتاب کو قبولیت کا درجہ بخشیں گے۔ چوں کہ ملک کی تمام جامعات میں صنف طنز ومزاح نصاب میں شامل ہے اس لئے یہ کتاب اساتذہ کے ساتھ ساتھ ریسرچ اسکالروں اور طلبا کے لئے بھی معاون ومفید ہے۔ 264 صفحات پر مشتمل یہ کتاب میٹرلنک لکھنو سے شائع ہوئی ہے اور اس کی قیمت 500 روپے ہے۔

قطرہ قطرہ احساس: ایک تاثر

(اقبال حسن آزاد کا افسانوی مجموعہ)

مبصر: ڈاکٹر منصور خوشتر
ایڈیٹر سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' دربھنگہ

''قطرہ قطرہ احساس''، اقبال حسن آزاد کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے ساتھ ۲۰۲۴ء میں منظر عام پر آیا ہے۔

''قطرۂ احساس میں دریائے محسوسات'' کے عنوان معروف فکشن نگار غضنفر لکھتے ہیں کہ اقبال حسن آزاد کی افسانوی شخصیت میں جس قدر افسانوی وفور، تخلیقی شعور اور سب سے بڑھ کر والہانہ پن محسوس ہوتا ہے اس قدر یہ اوصاف ان کی دوسری حیثیتوں میں محسوس نہیں ہوتے۔ ان کے ابتدائی دور کے مختصر ترین افسانے ہوں، یا بعد کے زمانے کے مختصر افسانے سب میں ان افسانوی وفور، تخلیقی شعور اور والہا پن موجود ہے۔ جن خوبیوں کو مولانا حالی پنی پتی نے شاعری کے لیے ضروری قرار دیا تھا وہ اقبال حسن آزاد کی افسانوی تحریروں میں موجود ہیں۔

''قطرہ قطرہ احساس'' افسانوی مجموعہ کا پہلا افسانہ بھی اسی عنوان سے ہے۔ اس افسانے میں ایک خوشحال زندگی کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ایسا خاندان جہاں ہر طرح کی عیش و آرائشیں موجود ہیں۔ لیکن دھیرے دھیرے اس خاندان کے سارے نوجوان غیر ممالک چلے جاتے ہیں۔ ان کا مقصد روزی روٹی کی تلاش کرنا اور کمانا ہوتا ہے۔ بڑا بننے کا خواب انہیں اپنے بڑے بزرگوں سے اس قدر دور کر دیتا ہے کہ نہیں گھر کے در و دیوار ڈسنے لگتے ہیں۔ وہ دن بھی خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ ان سارے حالات کی منظر کشی کرتا اقبال حسن آزاد کی اس کہانی کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''انہوں نے دیکھا۔ ان کا بڑا لڑکا رشید بستروں کو روند رہا ہے۔ پھر انہوں نے دیکھا رشید اسکول سے پڑھ کر آرہا ہے۔ اور پھر رشید بڑا ہوتا گیا۔ اور بڑا ہوتا گیا۔ اس کی شادی ہوئی، بچے ہوئے اور پھر........
>
> انہوں نے ایک ٹھنڈی طویل سانس بھری۔
>
> ''ابا! ابا! دیکھئے میرا پاسپورٹ بن کر آ گیا۔'' رشید ان کے سامنے ہاتھوں میں اپنا پاسپورٹ لیے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

''دیکھئے اب ویزا کب تک ملتا ہے۔امید ہے کہ جلد ہی مل جائے گا۔''
کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو ان کی آنکھوں کے سامنے سے ماضی کا پردہ ہٹ گیا۔ پھر وہ آہٹیں سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اوپر کہیں گم ہوگئیں۔ ان کے دل میں آیا، اوپر چل کر کرایہ داروں سے بات کریں۔ مگر وہ آدھے دھڑ سے اٹھ کر پھر بیٹھ گئے۔ آجکل کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ ایک بوڑھے اور بیکار شخص سے گفتگو کرے۔

''انقلاب'' افسانہ کا ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ کریں اور غور کریں کہ سیاسی رہنما کس طرح نوجوانوں کے مستقبل کر خراب کرتے ہیں اور اسے اپنا مہرہ بنا کر استعمال کرتے ہیں:

''انقلاب زندہ باد!'' ''انقلاب زندہ باد!'' انقلاب زندہ باد!''
ساری فضا عوام کے پر جوش نعروں سے گونج رہی تھی۔ان کے زور دار اور بلند آہنگ نعرے اس بات کی دلیل تھے کہ وہ سب کے سب شکم سیر بھی تھے اور مطمئن بھی۔ان کے ہاتھوں میں لال جھنڈے تھے اور زبان پر انقلاب کے نعرے۔

افسانہ نگار نے اپنے اس افسانہ کے ذریعہ سماج کو یہ پیغام دیا ہے کہ سیاسی لیڈروں کے چکر میں اپنی زندگی برباد مت کرو۔ وہ نوجوانوں کو اس وقت برباد کر کے اپنا مہرہ بناتے ہیں جو وقت اسے پڑھنے لکھنے اور کسی کسی کام کرنے کا ہوتا ہے۔سب کچھ برباد ہوجانے کے باد جب وہ پیچھے لوٹنا چاہتا ہے تب تک کافی دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

''کھوئے ہوئے سال'' میں ایک ایسی کہانی بیان کی گئی ہے جس کے مرکزی کردار ایک بوڑھا مرد اور ایک بوڑھی عورت ہے۔ یہ پچاس سال قبل کی کہانی ہے جب دونوں جوان ہوا کرتے تھے۔ دونوں پانی کے کنارے بیٹھے ہوئے قدرت کے خوبصورت مناظر کو دیکھ رہے تھے لیکن دیکھتے دیکھتے دونوں پیار کر بیٹھے ۔ایک دوسرے کے لئے جان دینے کے وعدے کئے گئے ۔لیکن کچھ لوگوں کا قول ہے کہ وعدہ تو توڑنے کے لئے ہی کیا جاتا ہے۔عہد و پیماں ٹوٹ جاتے ہیں۔ان کے درمیان امیری اور غریبی کی دیوار حائل ہوجاتی ہے۔لڑکی کے ماں باپ اس کی شادی کسی امیر گھرانے کے آفیسر کلاس نوجوان سے کر دیتے ہیں۔لڑکی بھی ہنسی خوشی راضی ہو جاتی ہے۔

پچاس سال پھر دونوں کہیں ملتے ہیں دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی ہے:

''تو ان برسوں میں تمہیں کیا ملا؟''

''ایک خوبصورت بنگلہ......خوبصورت کار...... حسین زیورات......
مگر......''

''مگر کیا؟

''ایک چیز نہیں مل سکی۔''

''پیار......تمہاری جیسی محبت۔''

پھر وہ دونوں چپ ہو گئے۔

ان کے افسانے یقیناً دل کو چھو لیتے ہیں۔تبھی تو معروف فکشن نگار غضنفر ان کے سلسلے میں کہتے ہیں:

''اقبال حسن آزاد کی شخصیت کو جن لوگوں نے قریب سے دیکھا ہے جنھوں نے ان کے اداریوں کو پڑھا ہے اور جو لوگ فیس بک پر ان کے کمنٹس اور پوسٹ پر نظر رکھتے ہیں انہیں اندازہ ہوگا کہ اقبال حسن آزاد کس قدر رنڈر انسان ہیں اور اپنے ہم نام علامہ اقبال ہی کی کسی طرح کے بھی سامنے ان کی کمزوریوں، خامیوں اور ناہمواریوں پر چپ نہیں رہ پاتے۔ان کی یہی بے خوفی سچ کو سچ کہنے کی ہمت ان میں پیدا کرتی ہے۔''(ص:۱۶)

''الیوژن''ایک عمدہ اور اور سبق آموز افسانہ ہے۔ایک خاص طبقہ کے لئے ذہن میں کتنا زہر بھر دیا گیا ہے اس کی ایک داستان ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''او سامنے والا گاؤں میاں لوگ کا ہے؟''

''ہاں! بڑا بھاری گاؤں ہے۔''

اوہی تو! کل سام کو بس سے اترا تو میاں جی اللہ اللہ پکار رہا تھا۔''

''کیا کریں، سالا روج پانچ وکھت کا یہی دھندا ہے۔اورا بھیو تھوڑی دیر میں پکارے گا۔''

''تم لوگ کو ڈر نہیں لگتا؟''

''ڈر، کاہے کا ڈر؟''

''ارے سب سالے آتنگ وادی ہوتے ہیں۔''دیکھا نہیں، کبھی دلی، کبھی ممبئی۔

اس طرح اقبال حسن آزاد نے اپنے افسانوں کے ذریعہ سماجی اور سیاسی حالات کی بہترین عکاسی کی ہے۔اپنے افسانوں کے ذریعہ موصوف نے لوگوں کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان

کے افسانے یقیناً دلچسپی کے سبب ہیں۔

◆ ● ◆

کتاب کا نام: رانگ نمبر
صنف: افسانہ
مصنفہ: نشاط پروین
سال اشاعت: 2025 (دوسرا ایڈیشن)
صفحات: 144
قیمت: 250
ناشر: ثالث پبلیکیشنز، مونگیر
مبصر: ڈاکٹر مشتاق احمد (پرنسپل، سی، ایم کالج، دربھنگہ)

دنیائے ادب میں نشاط پروین کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں کہ ان کے افسانے اور مضامین ان کی شناخت کے ضامن ہیں۔ انہوں نے بہت کم وقت میں اپنی افسانہ نگاری سے اردو ادب کے سنجیدہ علمی وادبی حلقے کو متوجہ کیا ہے۔ زیرنظر کتاب ''رانگ نمبر'' کے مشمولہ 32 افسانوں کے مطالعے سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نشاط پروین فن افسانہ نگاری سے بخوبی واقف ہیں اور ان کے یہاں موضوعاتی تنوع بھی ہے اور کردار نگاری کا اعلیٰ نمونہ بھی۔ ظاہر ہے کہ افسانہ نگاری میں کردار نگاری کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے، اور اگر کوئی افسانہ نگار اپنے کردار کو آغاز تا انجام متحرک رکھتا ہے تو قاری کے ذہن پر خود بخود کردار کا نقش بن جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں کردار نگاری کے اس وصف کو اولیت دی ہے جس کی وجہ سے ان کے بیشتر کردار لافانی بن گئے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ''حرف اعجاز'' کے تحت اردو کے نامور ناقد ڈاکٹر منظر اعجاز مرحوم نے درست ہی لکھا ہے کہ

''نشاط پروین نے فنی لوازم کے برتاؤ میں ایجاز اور اشارہ اور علامت و استعارہ سے بالعموم اور بالقصد کام بھی نہیں لیا ہے۔ انہوں نے فقرے اور جملے بھی ایسے نہیں تراشے ہیں جو دوران مطالعہ یا دوران قرآت پائے نگاہ کی زنجیر بن جائیں لیکن ان کے افسانے دلچسپی سے خالی نہیں۔ تجسس اور تحیر کے عناصر کے ساتھ ساتھ ایسے نکات بھی ہوتے ہیں جو دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتے ہیں اور یہ سلسلہ اس افسانوی مجموعہ کے عنوان سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔'' (ص: 14)

بلاشبہ ''رانگ نمبر'' کے افسانوں کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ افسانہ نگار نے

انسانی معاشرے کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ہمارے معاشرے میں جس طرح کے مسائل ہیں اس پر مبنی افسانے کے تانے بانے بنے گئے ہیں۔ تہذیبی اقتدار کی پامالی، انسانی رشتوں کے شیرازے کا بکھرنا سماجی سروکار کی ناہمواریاں اور سماجی برائیوں کے پھیلتے دائروں کو موضوع بنانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ کیوں کہ آج کا ہر ایک انسان خود شناسی کا شکار ہے، خود احتسابی کسی کو پسند نہیں، ایسے وقت میں اگر کوئی فنکار اپنے سماج کی تصویر پیش کرتا ہے تو اس کے حوصلے کی داد دیجئے۔ نشاط پروین نے بھی اپنے افسانوں میں انسانی جبلت کی تمام تر تصویریں پیش کی ہیں اور انسانی زندگی کے نشیب وفراز کی ترجمانی کی ہے۔ ان کا اصلاحی نظریہ اور فلسفہ حیات انسانی ان کی افسانہ نگاری کی انفرادیت ہے۔ ''رانگ نمبر''، ''بڑے گھر کی بہو''، ''کرچیاں''، ''ماں''، ''نئے راستوں کی تلاش''، ''چودھویں کا چاند''، ''ساون کی یادیں''، ''نئی روشنی'' اور ''سہیلی'' جیسے افسانے موضوعی اعتبار سے متاثر کن اور فنی اعتبار سے پختہ ہیں۔ فضا بندی بھی خوب ہے اور طرز اظہار بھی۔ منظر کشی مختصر افسانہ نگاری میں فنکار کے لئے ایک آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے کہ وہ تھیں الفاظ کا پاسدار رہے کیوں کہ الفاظ کی گھن گرج اگر زیادہ ہوئی تو پھر مختصر افسانے کی روح مجروح ہونے لگتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ نشاط پروین نے فن مختصر افسانہ نگاری کے اس فنی اصول کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ان کا انداز بیان فلسفیانہ ہے جو افسانے کی کڑی کو مضبوط تو ضرور کرتا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی افسانہ نہیں بلکہ کوئی درسی کتاب پڑھ رہے ہوں۔ مثلاً افسانہ ''پیار'' کا یہ اقتباس دیکھئے۔

''پیار ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو کمزور کر دیتا ہے۔ اسے بے بس اور مجبور کر دیتا ہے۔ جب انسان کسی کے پیار میں دیوانہ ہو جاتا ہے تو اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ اسے اچھے برے اور صحیح غلط کی تمیز نہیں ہوئی وہ اپنا آپا کھو دیتا پھر اسے اپنا خیال رہتا ہے نہ اپنے گھر والے کا۔ اسے کسی بات کی فکر نہیں رہتی اسے ایک ہی فکر ستاتی ہے کہ وہ جس سے پیار کرتا ہے وہ اس کا ہو جائے۔'' (ص 21)

البتہ افسانہ ''فیس بک کے سائیڈ افیکٹ'' نہ صرف موضوعی اعتبار سے بلکہ فنی اعتبار سے بھی افسانہ نگار کے پختہ ذہن کا غماز ہے کہ انہوں نے عصر حاضر کے ایک اہم مسئلہ کو فکشن کا روپ دیا ہے۔ مختصر یہ کہ افسانوی مجموعہ ''رانگ نمبر'' مختصر افسانے کی تمام تر فنی خوبیوں سے بھرپور ہے اور موضوعی اعتبار سے بھی دلچسپ وفکر انگیز ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو افسانہ نگاری کے باب میں ''رانگ نمبر'' کے چند افسانے حوالہ جاتی حیثیت اختیار کریں گے اور ہمارے ناقدین ادب نے اگر منصفانہ رویہ اپنایا تو نشاط پروین کی افسانہ نگاری پر اپنی ایماندارانہ رائے ضرور دیں گے کہ ان کے افسانے اس کے حقدار ہیں۔

ثالث پبلی کیشنز، مونگیر بہار سے 2025ء میں شائع ہونے والا یہ افسانوی مجموعہ 144 صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت 250 روپے ہے۔ میرے پیش نظر دوسرا ایڈیشن ہے، پہلا ایڈیشن 15 دسمبر 2024 کو شائع ہوا تھا کہ عرض ناشر میں اس کی اطلاع دی گئی ہے۔

◄◄ ● ►►

نام کتاب	:	غزالِ درد
شاعر	:	طارق متین
قیمت	:	۲۰۰/روپے
ناشر	:	ارم پبلیکیشنز، پٹنہ
مبصر	:	ڈاکٹر رونق شہری

طارق متین کا شعری مجموعہ ''غزال درد'' میرے مطالعے کی زینت ہے۔ اسے گاہے گاہے نکال کر پڑھتا رہتا ہوں اور شعریت سے مملو وجدان کو متحرک کرنے کا سامان فراہم کرتا ہوں۔ طارق متین نے شعری مجموعے کی پیشکش سے قبل سنجیدہ مزاج انڈو پاک کے رسائل میں تواتر سے اپنی موجودگی کا احساس کرایا ہے۔ ان کی غزل کے مزاج ومعیار کو غزل کی روایتی تدریس کی خدمات انجام دینے والے ناقد نما غزل گونہیں پرکھ سکتے۔ اس لئے کہ غزل آج جدید سے جدید تر کا راستہ طئے کر کے مابعد جدید کی ادبی اصطلاح سے متصف ہو چکی ہے۔ طارق متین کو جدید تر غزل گو بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں انہوں نے آنکھیں کھولی ہیں اس کے باوجود یہ دیکھ کر طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ یہ ساختیات پس ساختیات یا پوسٹ ماڈرن ازم کے حوالے سے نئی تشکیلات کے جھمیلے میں اعلانیہ نہیں پڑتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہے کہ طارق متین کی طبیعت میں غیر محسوس طریقے سے فقیرانہ شان بے نیازی موجود رہی ہے۔ ان کے کلام کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ سوز وگداز والی شاعری کے یہ اسیر نہیں بلکہ اس کے رسیا رہے ہیں۔ انسانی زندگی میں Pathos کی کئی شکلیں ہیں۔ ''غزال درد'' اسی لازوال اشعار کا ایک روشن حصہ ماہتاب درد ہے جو اساڑھ کی چاندنی کا تقدس رکھتا ہے۔ ''غزال درد'' پر چشم باطن مرکوز ہے۔ مشک نافے سے نکلتی خوشبو کے تحیر میں مبتلا ہونے کا سوانگ نہ رچ کر ''غزال درد'' کی مضطرب وجود کی سالم اکائی جُز میں کل کا امیج رکھتی ہے۔

''غزال درد'' سے پہلے مشک سخن (1997)، قندیل ہنر (2008) ایوان غزل میں اپنی موجودگی کا احساس بہت پہلے ہی کرا چکے ہیں۔ ان شعری مجموعوں کے اشعار بھی ششدر کر دینے والی

کیفیات سے الگ رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ طارق متین نے غزل کے تہذیبی انسلاک کو اپنے اندر مدغم کرتے ہوئے Sub Concious پر زیادہ انحصار کرتے ہوئے شعری عمل کو فروغ دینے والے شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔

اسی بات کو ''ریاضت'' کے حوالے سے طارق متین خود کہہ چکے ہیں ۔

یونہی نہیں ملا مجھے طارق یہ امتیاز　　　یہ فنِ شعرگوئی ریاضت سے آیا ہے

طارق متین کا یہ دعویٰ ان کی شعر گوئی کے حوالے سے پختہ ہو جاتا ہے کہ مشکِ سخن سے قندیلِ ہنر تک ان کے کلام مؤثر کی خوشبو انتہائی سرعت سے پیچھا کرتی کراتی ہوئی ''غزالِ درد'' تک پہنچتی ہے۔ طارق متین کی شاعری کی ترفع آمیز پیش رفت کو مظفر حنفی، علیم اللہ حالی جیسے اعلیٰ مرتبت شاعر و ناقد بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ فرحت احساس، خورشید اکرم، فرد الحسن، راشد طراز، خالد عبادی، کامران غنی صبا، محمد رضوان خان کے مضامین میں ان کی شاعری کی سائیکی کو کئی زاویے سے دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان میں بعض مضامین جذباتی انداز میں لکھے گئے ہیں اور چند جملوں پر غلو کا الزام لگ سکتا ہے۔ فرحت احساس اپنے مضمون کے دوسرے پیرائے میں لکھتے ہیں ''طارق متین کی نمایاں ترین صفت خودگزینی ہے ایک خاص طرح کی تقویٰ جیسی کیفیت جوان کے باہر اور اندر کے ماحول میں جاری و ساری معلوم ہوتی ہے۔'' بھائی یہ تقویٰ جیسی کیفیت کیا ہے؟ شغلِ شاعری کے حوالے سے ان کی طبیعت کا ڈانڈا متقی ہونے کی منزل سے ملانا چہ معنی دارد؟ ارسطو نے جب کہ پہلے ہی کہا ہے کہ شاعری مخربِ اخلاق ہے۔ میرے نزدیک تو شاعری ادبی اخلاق کو سنوارنے کا نام ہے۔

اسے سنوارنے میں ہماری خوش تہذیبی اہم رول ادا کرتی ہے۔ طارق متین فکری و لسانی اعتبار سے زیادہ بہکنے والے شاعر نہیں ہیں لیکن رمز و کنایے میں یہ فریضہ اس طرح بھی ادا کرتے ہیں ۔

میری تنہائی کے مونس ہیں میرے غم کے رفیق　　　سارے آنسو جو مرے دیدۂ تر کے لئے ہیں
بڑی مشکل میں ہوں طارق کہ یہ میرا ضمیر اکثر　　　مجھے چپکے سے کہتا ہے اگر کہئے تو مر جاؤں

خود صحبتی، خودگزیں، اپنی پناہ میں رہنے کا نام ہے لیکن اس سے مفتی سادھو ہو جانا نہیں ہے۔ ہاں ان کے یہاں غیر رسمی قسم کا اضطراب ''غزالِ درد'' کی صورت میں ضرور ابھرتا ہے۔ جو کبھی کبھی طنز کی صورت میں ابھرتا ہے اور دل نشیں ہو کر قارئین کو بھی بے قرار ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

اس زاویے سے ہم دیکھتے ہیں تو طارق متین اپنے ہی آنسوؤں میں چمکنے والے شاعر نظر آتے ہیں۔ فرد الحسن نے طارق متین کا محاسبہ ان کی شاعری کے کلیدی رجحان تصوف پر منطبق کیا ہے۔ لیکن ان

سے بھی چوک ہوئی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ ''طارق متین کی غزل گوئی کا مطالعہ یہ باور کراتا ہے کہ انہوں نے خالصتاً تصوف پر اپنے فن کی اساس استوار کی ہے اور اپنا ایک نیا لہجہ تراشنے کی کوشش بھی۔''

مجھے ان کی رائے سے اختلاف ہے۔ اوّل یہ کہ انہوں نے اپنی شاعری کی اساس تصوفانہ فکر پر رکھی ہے۔ نہ کہ فن پر فنی تراکیب میں طارق متین نے جابہ جا اپنی مہارت کے ثبوت فراہم کئے ہیں۔ طارق متین کی شاعری راست شاعری کی عمدہ مثال کہی جاسکتی ہے اس کے باوجود انہوں نے نادر اضافتی ترکیب اور استعارے سے جو پیکر شعر بنایا ہے وہ اچھی شاعری کے سرمایے میں اضافے کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ عین تابش کی شعری حس کے شاعر نہیں قرار دیئے جاسکتے۔

عین تابش کی شاعری غیر استعمال شدہ لسانی خوش آہنگی کی شاعری ہے جو راست نہ ہو کر تہہ شعر رواں دواں نظر آتی ہے۔ اب میں طارق متین کے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جن میں مجھے بھرپور تخلیقیت نظر آتی ہے اور شعور ذات کا بھی عرفان ہوتا ہے۔

گو ہم چراغِ وقت کو روشن نہ کر سکے — پر اپنی ذات سے تو اندھیرا نہیں کیا
اب نہ جینے کی تمنا ہے نہ مرنے کا ملال — سانس باقی ہے سو کچھ اور جئے لیتے ہیں
جانے کس کام کے ہیں کیا ہے ہمارا مصرف — ہم کسی گھر کے لیے ہیں نہ سفر کے لیے ہیں
ہماری چارہ گری بھی ہے سادہ لوح محبت — جہان بھر کے غموں کا علاج چاہتی ہے
بدل لیا ہے فقیری نے بھی لباس اپنا — یہ بوریا نہیں اب تخت و تاج چاہتی ہے

ان اشعار میں زمان و مکاں کے متبدل صورت حال پر طنز لطیف کا عنصر موجود ہے بلکہ رائیگانی کے احساس کو بھی طریقۂ طارق متین سے پیش کیا گیا ہے۔ فکر و شعور کا متوازن تناسب شعر میں بہکنے کا موقع نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اشعار میں بے ساختہ پن ابھر کر سامنے نہیں آیا ہے۔ اسے حرف و لفظ کی تہذیب کاری پر محمول کرنا چاہیئے۔

◀ ● ▶

غضنفر کی ''صورتیں'' اور اسلوبیاتی بوقلمونی

مبصر: نسترن احسن فتیحی

''صورتیں'' غضنفر کے خاکوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے خاکوں کے تین مجموعے ''سرخ رو''، ''روئے خوش رنگ'' اور ''خوش رنگ چہرے'' ادبی دنیا میں مقبول ہو چکے ہیں۔ اس لیے یہ

وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ غضنفر نے اردو خاکہ نگاری کے میدان میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

غضنفر نے ادب کی مختلف صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔مگر خاکہ نگاری میں انھوں نے اپنے منفرد اسلوب سے اپنی ایک مختلف پہچان بنا لی ہے۔ان کی خاکہ نگاری کے طرف آنے کے اسباب پر غور کرتے ہوئے صفدر امام قادری ''صورتیں'' میں شامل اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''انہیں بھی کسی نئی زمین اور ایسے نئے سانچے کی تلاش تھی جہاں وہ اپنے ادب کی روح یا جسم اور لباس کے طور پر قصہ گوئی اور انشاپردازی کو کامیابی سے اور بے خوف و خطر آزمائیں۔غضنفر کو معلوم تھا کہ اس کے لئے انہیں غیر افسانوی نثر کے میدان میں اترنا ہوگا۔اس میدان میں ان کے انشاپردازانہ جوہر کی پرورش ممکن ہے......اپنے تخلیقی فن کے ارتقاء کے اس موڑ پر غضنفر نے خاکہ نگاری شروع کی۔اپنے ناولوں کے لکھنے کے بعد فکشن کے بھرپور تجربے کے ساتھ خاکہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔'' (صورتیں۔صفحہ۔21-22)

بہرحال اردو ادب میں خاکہ نگاری کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔غضنفر کی خاکہ نگاری میں ان کی اسلوبیاتی جدت، مزاح اور سسپنس کے انوکھے امتزاج نے ان کی خاکہ نگاری کو مقبولیت بخشی ہے، جو قارئین کو ایک تازگی اور دلکش ادبی تجربہ فراہم کرتا ہے۔ یہ خاص طور پر زیر نظر مجموعے ''صورتیں'' میں واضح ہے جو فاروقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شارب ردولوی، عبدالصمد، اقبال حسن آزاد، مشتاق احمد نوری، اختر الایمان، پیغام آفاقی، قاضی افضال حسین، ظفر کمالی، حسین الحق اور اقبال مجید جیسی قابل ذکر شخصیات کے ساتھ ساتھ کل اٹھائیس اہم شخصیتوں کے خاکوں پر مشتمل ہے۔

اسلوبیاتی تنوع غضنفر کی خاکہ نگاری کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے جو ان کی اسلوبیاتی اختراع ہے۔ وہ اپنے خاکے ایک مخصوص مزاج کے ساتھ تیار کرتے ہیں اور اکثر اپنے اسلوبیاتی جوہر کو حاصل کرنے کے لیے اختصار اور نفاست کا استعمال کرتے ہیں۔ان کے خاکوں کے عنوانات خاص طور پر اپنے جامع اور متجسسانہ نوعیت کے لیے قابل ذکر ہیں، جو قارئین کو اپنے دلچسپ اسلوب، اختصار اور پر تجسس بیانیکے ساتھ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ان خاکوں کے عنوانات (اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا، اس آباد خرابے میں، اردو باغ کا باغباں، خوشبو وغیرہ) کا اسلوبیاتی اظہار نہ صرف قاری کو متوجہ کرتا ہے بلکہ اس کی دلچسپی کو بھی متاثر کرتا ہے اور خاکے میں آنے والی تفصیلات کے لیے لہجہ بھی متعین کرتا ہے۔

غضنفر کی نثر میں روانی اور درستگی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ مہارت سے وضاحتی زبان کو گفتگو کے لہجے کے ساتھ جوڑتے ہیں، ایسے خاکے تخلیق کرتے ہیں جو ادبی ذوق کی تسکین کے ساتھ ادب کی تفہیم کے لیے بھی قابل رسائی ہوتے ہیں۔ان کے یہاں استعارہ اور تشبیہات کا استعمال ان کردار کی تصویر کشی میں

گہرائی کا اضافہ کرتا ہے، جس سے قارئین کو ان شخصی خاکوں کا تصور کرنے اور ان سے جڑنے کا موقع ملتا ہے۔

غضنفر کی خاکہ نگاری مزاح کے گونا گوں پہلوؤں سے آراستہ ہے، جس میں مذہب کے لیے تقدس، دنیا کی لذتیں، زندگی کو بھر پور طور پر حاصل کرنے کی امنگ کے ساتھ ساتھ قوم کا درد ان کے فکر و خیال کا حصہ ہے۔ سادگی، اختصار، سنجیدگی، شگفتگی، وقار، متانت، رنگینی، غضنفر کی خاکہ نگاری کیا سلوب کی نمایاں صفات ہیں۔ مزاح غضنفر کی خاکہ نگاری کا ایک متعین عنصر ہے۔ مزاح کی چاشنی ان کے خاکوں کی کشش کو بڑھاتی ہے اور انہیں پر لطف اور متعلقہ بناتی ہے۔ مزاح کے ذریعے وہ اپنے مضامین کے نرالے پن اور تازگی کو قائم رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں، اکثر معاشرتی اصولوں اور انسانی رویوں پر تنقید کرنے کے لیے طنز کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ مزاحیہ انداز نہ صرف احساس لطافت پیش کرتا ہے بلکہ طنز کی دھار کو کند کرتا ہے اور سوچ کو بھی اکساتا ہے۔ ساتھ ہی قارئین کو اس کے مشاہدات کے گہرے مضمرات پر غور کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن کسی شخصیت کے تاریک پہلو کو کھول کر دکھانے کے وہ قائل نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں غضنفر خود رقم طراز ہیں:

> ''کسی بھی آدمی میں یوں تو سفید اور سیاہ دونوں رنگ ہوتے ہیں، مگر ہماری نگاہ کبھی اس میں پوری کی پوری سفیدی دیکھتی ہے اور کبھی ساری کی ساری سیاہی......میری آنکھیں بیک وقت دونوں رنگ دیکھتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سیاہ رنگ کو خود تک محدود رکھتا ہوں۔ اسے دوسروں کو نہیں دکھاتا کہ اس سے تاریکی پھیلتی ہے۔ تاریکی جو راہ سے بھٹکاتی ہے۔ بیمار کرتی ہے۔ دل اور دماغ کا چین چھین لیتی ہے اور سفید رنگ کو میں دوسروں کو بھی دکھاتا ہوں کہ اس سے روشنی ملتی ہے۔ روشنی سے سفیدی کی چمک اور بڑھجاتی ہے۔ اس سے رنگینیاں بھی پھوٹ پڑتی ہیں۔ حن سے دل اور دماغ رنگین اور روشن ہوتے ہیں۔ (میرے خاکوں کا رنگ) ''صورتیں'' صفحہ۔ 11

''صورتیں'' میں غضنفر کا مزاح لطیف بھی ہے اور بلند بانگ بھی۔ وہ جن شخصیات کے خاکے بنتے ہیں ان کی منفی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لیے کہیں لطیف طنز تو کہیں مبالغہ آرائی کا استعمال کرتے ہیں، اس طرح یادگار اور دل چسپ کرداروں کے پورٹریٹ بناتے ہیں۔ روزمرہ کے حالات اور انسانی تعاملات میں مزاح تلاش کرنے کی ان کی صلاحیت ان کی تحریر میں دلنشینی پیدا کرتی ہے، جس سے ان کے خاکے پڑھنے میں دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔

تشکیک اور تجسس غضنفر کی خاکہ نگاری کی ایک اور پہچان ہے جسے وہ اپنے تمام خاکوں میں

برقرار رکھتے ہیں۔ ''صورتیں'' میں وہ مہارت کے ساتھ شخصیات کی شناخت کو آخر تک روکتے ہیں، جس سے توقع اور تجسس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ بیانیہ کی یہ تکنیک قارئین کو جس طرح تشکیک اور تجسس میں مبتلا رکھتی ہے، وہ منظر عام پر آنے والی شخصیت کی کہانی میں کھنچے چلے جاتے ہیں، اور اس طرح جس شخص کی تصویر کشی کی جا رہی ہے اس کی شناخت دریافت کرنے کے لیے قاری بے چین رہتے ہیں۔

غضنفر کے یہاں سسپنس کا استعمال محض ایک ادبی آلہ کار نہیں ہے بلکہ ان کے خاکوں کے اثرات کو گہرا کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ موضوع کی شناخت کے انکشاف میں تاخیر کر کے، وہ قارئین کو کردار کی خصلتوں، افعال اور ماحول پر توجہ مرکوز کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، جس سے گہرے تعلق اور تفہیم کو فروغ ملتا ہے۔ شناخت کا حتمی انکشاف اکثر حیران کن ہوتا ہے، جس سے خاکے کی مجموعی تاثیر اور لطف میں اضافہ ہوتا ہے۔

''صورتیں'' کی خاکہ نگاری غضنفر صاحب کی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ یہ مجموعہ ان کی اسلوبیاتی جدت، مزاح اور سسپنس کو اس انداز میں ملانے کی صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے جو اس کی اثر آفرینی میں اضافے کا سبب بنتا ہے اور تفریح کا سامان پیش کرتا ہے۔ اٹھائیس خاکوں میں سے ہر ایک خاکہ احتیاط سے تیار کیا گیا بیانیہ ہے جو معروف شخصیات کی شخصیت کے بارے میں بصیرت پیش کرتا ہے، جبکہ وسیع تر سماجی اور ثقافتی موضوعات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

''صورتیں'' میں نمایاں شخصیات جیسے کہ عبدالصمد، اقبال حسن آزاد، مشتاق احمد نوری، اختر الایمان، اور حسین الحق، غضنفر کی گہری مشاہداتی صلاحیتوں اور ادبی اظہار کے ذریعے زندہ ہوتے ہیں۔ ان کے خاکے نہ صرف ان افراد کی کامیابیوں اور شراکتوں کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ ان کی ذاتی خوبیوں اور خصوصیات کا بھی جائزہ لیتے ہیں، جس سے ایک اچھی اور دلکش تصویر ابھر آتی ہے۔

''صورتیں'' میں غضنفر کی خاکہ نگاری اسلوبیاتی جدت، مزاح اور سسپنس سے نمایاں ہے، جس کی وجہ سے ان کی خاکہ نگاری کو اردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کے خاکوں کا یہ مجموعہ ان خوبیوں سے متصف ہے جو قارئین کے لیے دل چسپ اور فکر انگیز کرداروں کے خاکوں کا ایک سلسلہ پیش کرتا ہے۔ غضنفر نے اپنے منفرد اندازِ فکر کے ذریعے خاکہ نگاری کی صنف کو زندہ کیا ہے، جس سے قارئین اور ادبی برادری دونوں پر دیرپا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اپنے خاکوں کے جوہر کو عقل اور سسپنس کے ساتھ گرفت میں لینے کی ان کی صلاحیت اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ان کے خاکے یادگار اور اثر انگیز رہیں اور اس صنف کے لیے ایک روشن راہ متعیّن کریں۔

کتاب ''یادیں'' ناچیز کی نگاہ میں

مبصر: بینام گیلانی

فی زمانہ ناچیز کے ہم دست جناب پروفیسر ڈاکٹر مسعود الرحمٰن صدر شعبہء نفسیات، اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی، پٹنہ کی کتاب ''یادیں'' کا حصہ اول ہے۔ مذکورہ کتاب کا دوسرا حصہ بھی عنقریب منصۂ شہود پر آنے ہی والا ہے۔ یہ کتاب شخصیات کے تعارفات پر مشتمل ہے۔ الغرض جناب پروفیسر ڈاکٹر مسعود الرحمٰن صاحب ایک باذوق صاحب فکر اہل قلم ہیں۔ یہ دیگر امر ہے کہ آپ موصوف نے تخلیق کے لئے صنف تذکرہ کو منتخب فرمایا۔ اس میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ موصوف نے تذکرے میں ہی اکابرین کی مختصر سوانح کو بھی پرونے کی سعیٔ بلیغ فرمائی ہیں۔ اپ موصوف کی یہ تخلیق ''یادیں'' کے مطالعے کے بعد دفعتاً جناب محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' کی یاد تازہ ہوگئی۔ مختصر طور پر ہی سہی آپ جناب نے اپنی یادوں کے اوراق کو جو پسارا ہے۔ وہ واقعی مستحسن و قابل داد عمل ہے۔ ایک قدیم کہاوت مشہور ہے کہ وقت بہت ہی بیوفا ہے۔ اس کے تغیرات نے کتنے ہی گمناموں کو نامور کر ڈالا اور کتنے ہی ناموروں کو گمنامی کے قعر تاریک میں دفن کر دیا۔ یا پھر یوں کہ لیا جائے کہ انسانوں کا حافظہ واقعی بہت کمزور ہوا ہے۔ یہ کسی بھی شخص یا شخصیت کو بہت دنوں تک یاد نہیں رکھ سکتا ہے۔ عام انسان یا عام اہل قلم کی بات تو درکنار حضرت انسان کتنی اعلیٰ قدر اور بلند و بالا شخصیات کو بھی فراموش کر جاتے ہیں۔ یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ لوگ ایسی شخصیات کو بھی فراموش کر دیتے ہیں جنہوں نے واقعی ناقابل فراموش کارہائے نمایاں عمل انجام دے کر اس جہان فانی سے رخصت سفر باندھا۔ اب ذرا غور فرمانے کی زحمت گوارہ کریں۔ غالب میر داغ، اقبال وذوق وغیرہم کو تو آج تک کسی طرح یاد رکھا گیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ تمام اکابرین نصابوں کی کتابوں میں شامل رہے۔ لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے کٹیلوگ لوگوں کو یاد ہیں خصوصاً نئی نسل کے ادباء وشعراء تو خود میں اس قدر الجھے پڑے ہیں کہ انہیں اکابرین کو یاد کرنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ اگر کچھ فرصت ملتی بھی ہے تو انہیں علم ہی نہیں ہے کہ حضرت مولوی عبدالحق کون تھے۔ کہنے کی غرض غایت یہ ہے کہ لوگوں نے مطالعہ کو قریب قریب ترک کر دیا ہے۔ جب مطالعہ نہیں ہوگا تو ان کی علمیت کو فروغ کیونکر میسر ہوگا۔ جب کسی شخصیت کی خدمات وحیات کا علم ہی نہیں ہوگا تو اس کی قدردانی کیونکر ممکن ہے۔ چنانچہ اہل اردو کے بڑے بڑے اکابرین فراموش کر دئے گئے۔ کیسی کیسی گراں قدر شخصیات سے یہ نسل نو ناواقف ہے۔ نتیجہ کے طور پر وہ شخصیات نہ تاریخ میں زندہ ہیں اور نہ ہی تذکروں میں۔ انہیں کون زندہ کرے۔ جسے کرنا ہے وہ تو خود ہی ناآشنا ہے و نابلد ہے۔ اج نوبت تو یہ ہے کہ

ان کی محض اسماء شماری بھی کرانے والا کوئی نہیں ہے۔ جو بزرگان تجربات ومشاہدات وملاقات کی بنیاد پر کچھ بتانے کے اہل ہیں۔ وہ یا تو حجرہ نشیں ہوکر منظر سے غائب ہو چکے ہیں۔ یا پھر گویائی ترک کر چکے ہیں۔ ایسی ماضی کی بیشمار شخصیات ہیں جنہیں ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ رکھنا ناگزیر تھا۔ لیکن خود اہل اردو ان سے اجتناب برتتے رہے اور بالآخر آج بالکل ہی فراموش کر گئے۔ ان میں کئی ایسی شخصیات بھی شامل فہرست ہیں جنہوں نے کئی کئی کتابیں خلق کی ہیں۔ لیکن نہ وہ آج خود ذہنوں میں محفوظ ہیں اور نہ ہی ان کی کتابیں ذہنوں اور کتب فروشوں کی دکانوں میں محفوظ ہیں۔ جب نسل نو پر کتابوں، رسالوں حتیٰ کہ اخباروں کا مطالعہ ہی گراں گزرتا ہے تو وہ ضخیم کتابوں کا مطالعہ کیا خاک کریں گے۔

یہ اردو زبان وادب کا ایک زبردست المیہ ہے کہ اس اکیسویں صدی میں خود اردو کے محافظ ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہی اردو کے اخبارات ورسائل وکتب اور کتب بینی سے اغماز برت رہے ہیں۔ اردو کی اس زبوں حالی میں اہل اردو کے تمام طبقات کا یکساں منفی کردار رہا ہے۔ جو اعلیٰ قدر اہل قلم ہیں وہ خود اردو کے اخبارات ورسائل وکتب کے مطالعہ کو باعث ننگ تصور کرتے ہیں عین اسی طرح جس طرح حضرت غالب اردو کی اپنی شاعری کو اپنے لئے باعث ننگ تصور کرتے تھے۔ غالب نے اس امر کا اعتراف بزبان خود کیا بھی ہے۔ لیکن دیگر زبانوں مثلاً ہندی اور انگریزی کے اخبارات ورسائل وکتب کا مطالعہ ترجیحی اور فخریہ طور پر فرماتے ہیں۔ اردو داں کا جو نچلا طبقہ ہے۔ اس کی حالت تو بالکل ہی ناگفتہ بہ ہے۔ اس طبقہ کے افراد اردو اخبارات و رسائل خرید کر مطالعہ کرنے کے حق میں نظر نہیں آتے ہیں یا پھر اس اہل ہی نہیں ہیں۔ جب یہ پچاس روپیہ خرچ کر کے ایک رسالہ خریدنے کے حق میں یا اہل نہیں ہیں تو ۲۰۰۔۳۰۰ رپئے کی کتابیں خرید کر مطالعہ کرنے کے حق میں یا اہل کیا خاک ہوں گے۔ جہاں خود اردو معاشرے میں اردو زبان وادب کی یہ صورت حال ہے۔ وہاں اردو کا فروغ کیونکر ممکن ہو۔ اس کی فہم سے ناچیز قاصر ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آندھیوں میں بھی چراغ روشن ہوتے ہیں۔ یہ جملہ کہ دینا جس قدر سہل ہے اسی قدر اس پر عمل کرنا دشوار گزار ہے۔

ناچیز نے محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' کا ذکر خیر یوں ہی نہیں کیا ہے۔ آپ موصوف نے جس دور میں یہ کارنمایاں انجام دیا۔ وہ اردو کتابوں کے مطالعے کا سنہری دور تھا۔ لوگ اہل ذوق تھے۔ وہ نہ صرف مطالعہ فرماتے تھے بلکہ فہم وفہمائش کا کام بھی بڑے شوق سے کیا کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس قدر اہل ذوق تھے اس کے مطابق اس دور میں کتابوں کی اشاعت عمل پزیر نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اہل ذوق میں مطالعے کی تشنگی باقی رہ جاتی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اولاً اس دور میں تخلیقی عمل کثرت سے عمل پزیر ہوتا تھا اور اشاعتی عمل سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس دور کے

اہل قلم نام ونمود کے خواہش مند نہیں تھے۔مزید برآں ایک امر یہ بھی ہے کہ اس دور میں خالص تخلیقی ادب کی کتابیں دستیاب تھیں یا پھر دینی و مذہبی و اصلاحی کتب۔ تحقیق کا رواج نہیں تھا اور اردو میں تنقیدی سلسلہ جاری ہی نہیں ہوا تھا۔محمد حسین آزاد کی یہ کتاب آب حیات خود تذکرے پر مشتمل ہے۔اب ناچیز جس کتاب کے تعلق سے خامہ فرسائی کو بیٹھا ہے۔ یہ کتاب عہد حاضر کی ہے اور اس کے خالق بھی معاصر ہی ہیں۔یعنی اس دور کی کتاب ہے جب اہل شعروادب بھی مطالعات سے اغماز برت رہے ہیں۔اس دور میں کتابیں کثرت سے شائع ہورہی ہیں۔تخلیقی عمل اپنے پورے شباب پر ہے۔لیکن مطالعاتی عمل صفر۔جس کا شاخسانہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں معیار کی تلاش ممنوع ہے۔افکار کی گہرائی اور تخیلات کی بلند پرواز بھی تلاش کرنا نادانی ہی پر مشتمل ہوگا۔کیوں کہ بیشتر معاصر اہل قلم مطالعات سے فاصلے بنائے ہیں تو ان کے افکار و خیالات میں کشادگی کہاں سے آئیگی۔ یہ لوگ اکابرین اور ان کی تخالیق سے بالکل ہی نا بلد ہیں۔قدما اور ان کی تخالیق کا تو ذکر ہی بیکار ہے۔ یہ ماضی قریب یعنی حال کے دس بیس سال قبل فوت شدہ اہل قلم کو بھی فراموش کر چکے ہیں۔اس ناگفتہ بہ حالت میں اگر کوئی ایسی تذکرے پر مشتمل کتاب منصۂ شہود پر لاتا ہے تو وہ کتاب واقعی سرمایۂ ادب میں زبردستی اضافہ کا سبب ہوتا ہے اور اس کتاب کی حیثیت ایک دستاویز کی ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسی کتاب بہت ہی قابل قدر ہوتی ہے۔ کیونکہ جو بھی چند معدودے باذوق قاری اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔کم ازکم ان کے ذہن میں ں تو وہ صاحبان قلم زندہ وتابندہ رہیں گے جو قبل میں فوت ہوچکے ہیں اور جو قریب قریب فراموش کردئے گئے ہیں۔ایسی ہی ایک کتاب پروفیسر ڈاکٹر مسعود الرحمان نے شائع کر کے واقی اردو زبان و ادب اور اردو کے باذوق قارئین پر احسان عظیم کیا ہے۔مذکورہ کتاب کے متعلق خود خالق کتاب جناب پروفیسر ڈاکٹر مسعودالرحمٰن کچھ یوں رقمطراز ہیں۔

’’تقریباً چار دہائی کے دوران کتنی خانقاہوں کے سجادگان، بزدگان دین، مشائخ وعلماء، حفاظ، مذہبی و سماجی رہنما، سائنس داں اور مورخ، تعلیم وآگہی کی شمعیں جلا کر رخصت ہوگئے۔ساتھ ہی نسلوں کو ملک وقوم کے لائق بنانے والے اساتذہ، ججز، وکلا، صحافی اور سیاسی لیڈران، شعراء، ڈاکٹر وحکماء افسران وغیرہ ہمارے درمیان سے پردہ فرماگئے۔ہم نے دبستان شہر وگاؤں قصبہ کے ان بزرگوں کو کھودیا جن کی نصیحتیں ہمارے لئے مشعل راہ ہوا کرتی تھیں۔جن لوگوں نے اپنے قلم کی طاقت سے لوگوں کے منفی نظریہ کو مثبت میں بدلنے میں اپنی زندگی وقف کردی۔ملت کو زبان کے ساتھ ساتھ قانونی طور پر بیدار کرنے کے لئے اور حکومت وقت کو اپنے وجود سے روشناس کرانے کے لئے قانونی جواز پیدا کردیا تھا وہ سبھی اب ہمارے بیچ نہیں رہے۔اب تو ان کی یادیں بھی ہمارے درمیان نہیں۔تو زرا بتایئے ہم کیونکر اپنے ماضی پر فخر کر سکتے ہیں۔، اپنے آپ کو پہچان سکتے ہیں۔اسی فکر

نے ہمیں متحرک کیا کہ کیوں نہ ان آنکھوں نے جن گوہر نایاب کو دیکھا۔ان کی شخصیت سے متاثر ہوا مختصراً ان شخصیتوں کا اجتماعی خاکہ ترتیب دے کر حال اور مستقبل تک پہنچادیں تا کہ اسے پڑھ کر لوگوں کو علم ہو سکے کہ کیسی کیسی شخصیتیں اپنے اپنے انداز مذہب،سماج،تہذیب و معاشرہ اور زبان کی پاسبان بن کر رہیں اور تا حیات ثابت قدمی کے ساتھ زندگی کے ہر نشیب و فراز کا مقابلہ کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔‘‘

یہ کتاب کل ۱۲/ابواب پر مشتمل ہے۔جو شخصیات کی علمیت و پیشے کے لحاظ سے منقسم ہیں۔ان ۱۲/ ابواب میں پہلا باب ’’سجادگان‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں کل ۱۸/سجادگان حضرات کے مختصر تعارفات ہیں۔دوسرا باب ’’علمائے کرام‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں کل ۸ علمائے کرام کی مختصر سوانح ہے۔تیسرا باب ’’بزرگان دین‘‘ پر مشتمل ہے۔اس باب میں کل ۸ بزرگان دین کا ذکر خیر ہے۔چوتھا باب ’’حفاظ‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں کل ۹ حفاظ کرام کی مختصر داستان حیات ہے۔پانچواں باب ’’سماجی رہنما و معززین‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔اس میں کل ۴۵ شخصیات کا ذکر خیر ہے۔چھٹا باب ’’شعراء‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔اس میں کل ۲۸ مختلف ادوار کے شعراء کرام کے حیات فن پر خالق کتاب کی گراں قدر آرا ہے۔ساتواں باب ’’محقق دانشور اور افسانہ نگار‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں ۴۵ اصحاب فکر و فن کے تعارفات و خدمات کا ذکر خیر ہے۔آٹھواں باب ’’خواتین معزز‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں کل ۸ معزز خواتین کو مذکر ہیں۔نواں باب ’’ڈاکٹرس‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔جس میں کل ۲۰ ڈاکٹرس کے مختصر تعارفات ہیں۔دسواں باب ’’حکماء‘‘ عنوان کے تحت ہے۔اس میں کل ۶ حکمائے وقت کا ذکر خیر ہے۔گیارہواں باب ’’ججز‘‘ عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں کل ۸ ججز کے مختصر تعارفات ہیں۔بارہواں باب ’’وکلاء‘‘ عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں کل ۱۲ وکلاء کا ذکر خیر ہے۔

یہ کمال نہیں تو اور کیا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں اعلی قدر شخصیات کے مختصراً ہی تعارفات،کمالات و جمالات،حصولیابیاں،کاوشیں،ادبی و شعری و تحقیقی و تنقیدی و تخلیقی اثاثے کو جناب پروفیسر ڈاکٹر مسعود الرحمٰن صاحب نے اپنی یا داشت اور علم و ادراک پر مشتمل ایک ہی کتاب میں محفوظ کر لیا۔بلا شبہ اس کتاب ’’یادیں‘‘ میں محمد حسین آزاد کی کتاب ’’آب حیات‘‘ سے زیادہ ہی شخصیات کے تذکرے دستیاب ہیں۔ناچیز کے کہنے کی غرض یہاں کسی قسم کا موازنہ نہیں ہے۔اور نہ ہی کسی کے معیار و اقدار کا تعین ہے۔لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس کتاب میں مذکور کی تعداد زیادہ ہے اور اس کتاب میں خالق نے اپنے موضوعات سے وفا کی ہے نیز زبان و بیان کا پورا پورا خیال رکھا ہو۔اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔جس کتاب میں موضوع کے لحاظ سے جس قدر زیادہ مواد ہوگا اس کی اسی قدر افادیت ہوگی۔چنانچہ

اس کتاب کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔اگر حق بیانی سے کام لیا جائے تو یہ کتاب تشنۂ تحقیق کے لئے بہت ہی کارگر وافادیت ہے۔لیکن یہاں یہ بھی کہنا ناگزیر ہے کہ یہ کتاب ابھی بھی تفاصیل کی متقاضی ہے۔ناچیز کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ یہ ایک تعارفاتی کتاب ہے۔اسے سوانحی نہیں کہا جا سکتا ہے۔کیونکہ اس میں جو بھی ہے وہ بہت مختصر ہے۔جبکہ سوانحی مضامین تفاصیل کے متقاضی ہوتے ہیں۔ویسے 256 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اس گرانی کے دور میں مبلغ 300 روپئے میں گراں قطعی نہیں ہے۔اس کی قدر قدر دان ہی کر سکتے ہیں۔یا جنہیں تاریخ سے شغف ہے۔

◀ ● ▶

نام مجلّہ: گلستان ادب (اردو فورم، مونگیر)

مبصر: عبدالصمد

''اردو فورم'' مونگیر کی طرف سے شائع مجلّہ ''گلستان ادب'' موصول ہوا۔ دیکھ کر تقریباً بیس سال قبل 'فورم' کی ایک نشست میں اپنی شرکت یاد آ گئی۔ وہ نشست اتنی خوبصورت اور یادگار تھی کہ وہ میری یادوں میں ہمیشہ کے لیے بس گئی ہے۔شاید اردو کا یہ واحد فورم ہے جو چون (۵۴) برسوں سے زندہ وتابندہ ہے اور اس کی ابھی تک چھ سو چوہتر نشستیں منعقد ہو چکی ہیں۔ پورے برصغیر میں تو کیا، ساری دنیا میں اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ پتہ نہیں، وہ کون سی مبارک ساعت رہی ہوگی جب اس فورم کا قیام عمل میں آیا ہوگا۔

اس مجلّہ کو بھی آپ لوگوں نے باقاعدہ ایک رسالہ ہی بنا دیا ہے۔ معیاری نگارشات شامل کی گئی ہیں۔''ثالث'' کا مقابلہ تو نہیں پھر بھی آج کل جیسے رسالے نکل رہے ہیں اور بہت کم نکل رہے ہیں ان میں اس کی حیثیت خاصی نمایاں ہے۔کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کی اشاعت کو مستقل کر دیا جائے............؟

ایک غلطی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ڈاکٹر ایم۔اے۔او۔ جوہر کے مضمون میں سرفروشی کی تمنا......والے شعر میں شاعر کا نام رام پرشاد بسمل لکھا گیا ہے اور یہی مشہور بھی ہے جب کہ یہ شعر جناب بسمل عظیم آبادی کا ہے۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے اور اسے تسلیم بھی کر لیا گیا ہے۔

یہ بھی ایک مثال ہی ہے کہ کسی ادبی انجمن نے نسل در نسل نوجوانوں کی باقاعدہ تربیت کی ہے۔ ان میں اکثر لوگ اب عمر ضعیفی کو پہنچ چکے ہیں اور بہت فخر سے اپنے نقش قدم کی تابندگی کو دیکھ رہے ہیں۔اردو فورم کے سارے پرانے اور نئے وابستگان کو بہت بہت مبارک باد۔

☆☆☆

''گلستانِ ادب'' میری نظر میں

مبصر: مرغوب اثر فاطمی

زندگی مسرت وغم کے امتزاج کا نام ہے۔غم تو بن چاہے مل جاتے ہیں لیکن خوشی کے مواقع ذرا مشکل سے پکڑ میں آتے ہیں۔ کچھ کوشش کرنی پڑتی ہے تو کچھ ویسا دل پیدا کرنا پڑتا ہے جو خوشی کے لمحات کا رس نچوڑ کر شریانوں میں دوڑا دے جس سے کہ سرشاری کی لہر جسم وجاں کو تروتازہ کر دے، استعجاب سے بھر دے۔ جب بھی کوئی متوقع کتاب یا رسالہ کی دستیابی ہوتی ہے، پڑھنے لکھنے والا ہر شخص ایک عجیب مسرت محسوس کرتا ہے۔اگر کوئی فن پارہ نعمتِ غیر مترقبہ کی طرح موصول ہو تو پھر کہنا ہی کیا۔'' گلستانِ ادب'' مجھے 25.10.25 کی ڈاک میں ملا۔ ظاہر ہے کہ اس کا ہم دست ہونا میرے لیے ایک خوشگوار حیرت (Pleasant surprise) سے کم نہیں تھا۔ میں شکر گزار ہوں جناب اقبال حسن آزاد کا جنہوں نے مجھے یاد رکھا۔

میں نے جستہ جستہ اس کا مطالعہ کیا اور لطف اندوز ہوا۔شہرِ مونگیر تاریخی اور روحانی طور پر اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے، یہ تو مجھے معلوم تھا لیکن ادبی طور پر بھی اتنا زرخیز رہا ہے اس کا علم مجھے کم کم ہی تھا۔عصری تناظر میں یہ شہر اقبال حسن آزاد، طارق متین، راشد طراز، فیاض رشک اور رخشاں ہاشمی وغیرہم کے حوالے سے اپنی پہچان رکھتا ہے۔ میں نے جن کے نام درج کیے ہیں ان سے میرے ذاتی مراسم رہے ہیں اور ہیں۔ اس کتاب نے مجھ پر وا کیا کہ کیسے کیسے نابغۂ روزگار ماضی قریب میں گزرے ہیں جن کے دم سے گلشنِ ادب لہکتا مہکتا رہا ہے اور جن کی خوشبو سے آج بھی ادبی ماحول عطر بیز ہے۔اداریہ میں بہت اختصار میں پورے پس منظر کی عمدہ نشاندھی کی گئی ہے۔ڈاکٹر ایم۔اے۔اوجوہر کی مفصل تحریر سے ادارے کی پوری تاریخ کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ مذکورہ فنکار چلتے پھرتے کردار نظر آتے ہیں۔ پروفیسر مہدی صاحب کے بعد ڈاکٹر سہیل صاحب اور اب ڈاکٹر محمد ابوعبید جوہر صاحب کی دیوانگی قابلِ رشک ہی نہیں لائقِ تقلید بھی ہے۔اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ رفتہ رفتہ ایسی تنظیمیں کم یاب ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ صورت کما حقہ ہر ادبی گہوارے کی ہے۔صورتِ حال تشویش ناک ہے۔ایسے میں اقبال صاحب نے اسلاف کے کارناموں کو کتابی شکل میں لا کر بڑا کام کیا ہے۔ فنکاروں کی سعی احسن کو وسیع حلقوں تک پہنچا کر اقبال صاحب نے ان شخصیات کو قعرِ گمنامی میں جانے سے بچانے کی بہترین کوشش کی ہے۔

شعری حصے میں جو تخلیقات شاملِ اشاعت ہیں، سب کی سب چنیدہ ودرخشندہ ہیں، ذہن ودل کو سرشار کرتی ہیں اور فکر کو مہمیز کرتی ہیں۔ ہر تخلیق پر تفصیلی گفتگو کا محل نہیں ہے۔کل 13 افسانوں کا انتخاب شائع کیا گیا

ہے۔سارے افسانے جدید و مابعد جدید تیور لیے ہوے ہیں۔مضامین متنوع ہیں اور جس مضوع کو بھی لیا گیا ہے،اسے خوبصورتی سے برتا گیا ہے۔ان مسائل سے آج کا ہر شخص نبرد آزما ہے اس لیے ہر کہانی اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔یہی فنکاری ہے۔ڈاکٹر آفتاب احمد کا انشائیہ ''ایسا بھی کیا ہوا کہ خدا یاد آ گیا'' پر لطف اور معیاری ہے۔

اقبال صاحب ہمیشہ کچھ الگ کہنے اور نیا کرنے کے لیے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔اس کتاب کو میں ان کے اسی جنون کی ایک کڑی مانتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ مزید کڑیاں جوڑتے رہیں گے۔تعداد اشاعت صرف 200 ہے۔اسے اور زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا ہدف ہونا چاہئے تھا۔ممکن ہے دوسرے شہروں کے لوگوں میں بھی اس کا شوق جاگ اٹھے۔

مجھے امید قوی ہے کہ یہ کوشش رنگ لائے گی۔بلا قیمت کتاب نکالنے اور تبرک کی طرح تقسیم کرنے کے لیے دل گردہ کی ضرورت ہے۔صرف اور صرف محبتِ اردو ہے جس نے اتنا بڑا کام کروایا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ بزم روز افزوں پھلے پھولے اور اسم بامسمیٰ ثابت ہو۔

◀◀ ● ▶▶

تنقیدی کتابیں

نام کتاب: منظر کلیم: فن اور شخصیت
مصنف: ڈاکٹر اختر آزاد
سن اشاعت: ۲۰۲۴
صفحات: ۲۴۰
قیمت: ۴۰۰/روپئے
ملنے کا پتہ: عائشہ مرلین، نیو لکچھ اپارٹمنٹ، جمشید پور، جھارکھنڈ

نام کتاب: نثری اصناف ادب اور طنز و مزاح کی روایت
مصنف: اقبال حسن آزاد
سن اشاعت: ۲۰۲۵ (دوسرا ایڈیشن)
صفحات: ۲۶۳
قیمت: ۵۰۰/روپئے
ملنے کا پتہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، مونگیر

نام کتاب: غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے

مصنف: فخر الدین عارفی سن اشاعت: ۲۰۲۴ صفحات: ۲۰۸ قیمت: ۳۰۰/روپئے

ملنے کا پتہ: دربھنگہ ٹائمز پبلیکیشنز، پرانی منصفی دربھنگہ، بہار

''ثالث'' پر تبصرے

● غضنفر (علی گڑھ)

ثالث کا ''غضنفر نمبر'' ملا۔ خوشی ہوئی کہ اقبال حسن آزاد نے مجھے ظاہر اور باطن دونوں جانب سے خوبصورت بنا کر پیش کیا۔

میں سمجھ سکتا ہوں کہ تقریباً تین درجن قلم کاروں کی تحریروں کو یک جا کرنے اور لگ بھگ اتنی ہی میری نگارشات کو مختلف کتابوں اور رسالوں سے منتخب کرنے میں مدیر جریدہ کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی اور پھر ان سب کی پروف ریڈنگ، اور اڈٹنگ میں کتنا سر کھپانا پڑا ہوگا۔

فہرست میں شامل عنوانات اور عنوانات کے آگے درج لکھنے والوں کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجھ پر کیا کیا لکھا گیا ہے اور لکھنے والوں میں کیسے کیسے اہم اور ممتاز قلم کار اور اہلِ علم و دانش شامل ہیں۔ بعض تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ لوگ مجھے مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہیں اور مجھے کس حد تک پسند کرتے ہیں۔ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ مجھے تینوں نسلوں اور مختلف مسلکوں کے ادیب پسند کرتے ہیں۔ بعض دانشوروں اور نقادوں کے اس بیان سے بڑا اطمینان ہوا کہ میں اپنا ایک منفرد اسلوب بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

اقبال حسن آزاد نے اس نمبر میں مجھ پر اچھی اور معیاری تحریریں تو جمع کی ہی ہیں میری تخلیقی، تنقیدی، افسانوی غیر افسانوی تخلیقات و نگارشات کا انتخاب بھی عمدہ کیا ہے اور میری تقریباً تمام تر اصناف کے اچھے نمونے یکجا کر دیے ہیں۔ انتخاب کرتے وقت انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ طویل تحریروں سے کتاب کی طوالت بڑھ سکتی ہے اور طوالت بڑھنے سے اخراجات بھی زیادہ ہو سکتے ہیں مگر چوں کہ محبت کے سودا میں خسارے پر نظر نہیں جاتی اس لیے بنا کسی بات کی پروا کیے ان کی چاہت آگے بڑھتی چلی گئی۔ یہاں رک کر ان کی چاہت کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں تو ان کے اس جذبے کو سلام کر ہی رہا ہوں، آپ بھی کیجیے کہ یہ کام واقعی لائقِ ستائش اور قابلِ داد و مبارکباد ہے۔ خدا انہیں نیک اجر دے۔

◄● ►

● **علی رفاد فتیحی (علی گڑھ)**

''ثالث''،غضنفر نمبر

غضنفر ہمارے دور کے ایک ایسے ادیب ہیں جو متعدد اصنافِ ادب میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے فکشن، شاعری، خاکہ نگاری، اور ناول نگاری کو خاص طور پر سراہا جاتا ہے۔ ان کی تخلیقات کے حوالے سے مختلف نقادوں نے متنوع زاویے اختیار کیے ہیں۔ مثال کے طور پر، غضنفر کی تحریروں میں ایک خاص توازن اور زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ موضوعات کے انتخاب میں اپنے وژن، تجربات، اور مشاہدات پر بھروسہ کرتے ہیں اور ان کے یہاں طبقاتی تعصب یا تنگ نظری کی گنجائش نہیں ہے۔

اس شمارے میں غضنفر کے مختلف ادبی کاموں پر مبنی کئی مضامین شامل ہیں جو ان کے ادبی سفر، تخلیقی عمل، اور ادب میں ان کی انفرادیت کو بیان کرتے ہیں۔ مختلف مضامین میں ان کے ناولوں، کہانیوں، اور خاکوں کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر صفدر امام قادری اور ڈاکٹر افشاں بانو کے مضامین غضنفر کے خاکوں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے اسلوب اور انفرادیت کو بیان کرتے ہیں۔

غضنفر کی تخلیقی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ محض سطحی یا روایتی موضوعات پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ گہرے اور پیچیدہ موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے کام میں زبان و بیان کی ندرت، جدت، اور لسانی تشکیلات کا انوکھا استعمال ملتا ہے، جو ان کے ادب کو منفرد اور معیاری بناتا ہے۔ اس خصوصی شمارے میں ان کے فکشن، شاعری، اور دیگر تخلیقی اصناف پر متعدد نقادوں کی آراء شامل ہیں، جو ان کے کام کو ایک جامع تناظر میں پیش کرتی ہیں۔

یہ خصوصی شمارہ نہ صرف غضنفر کی ادبی خدمات کا اعتراف ہے بلکہ اردو ادب کے قارئین کے لیے ان کی شخصیت اور تخلیقی عمل کو سمجھنے کا ایک بہترین ذریعہ بھی ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے اس شمارے کو جس تفصیل اور گہرائی سے مرتب کیا ہے، وہ بلاشبہ اردو ادب کی خدمت میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

● **سلیم انصاری**

''ثالث'' کا شمارہ نمبر ۳۰۔۲۹۔۲۸ پیشِ نظر ہے۔ اس بار تاثرات قلمبند کرنے میں قدرے تاخیر بلکہ خاصی تاخیر ہوگئی جس کا واحد سبب میری ذاتی بلکہ ذہنی مصروفیات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ''ثالث'' کا یہ ضخیم شمارہ ''غضنفر نمبر'' کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اردو کے سنجیدہ قلمکاروں اور قارئین کے لئے باعثِ

اطمینان ہی نہیں بلکہ باعثِ فخر بھی ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد(مدیر ثالث) رسالے کے گوشے اور نمبر صرف اور صرف اپنی ادبی اور تخلیقی ترجیحات کی بنیاد پر ہی شائع کرتے ہیں نہ کہ کسی ذاتی تعلقات اور مالی منفعت کے پیشِ نظر۔اپنے اداریہ میں مدیر نے غضنفر نمبر کی اشاعت کے محرکات اور جواز کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غضنفر ہمارے عہد کے ان معدودے چند قابلِ قدر قلمکاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جو بیک وقت ادب کی متعدد اصناف میں مہارت رکھتے ہیں بلکہ بے حد فعال اور تخلیقی نمو سے سرشار بھی ہیں۔ مجھے مدیر کی یہ ادا بھی پسند آئی کہ انہوں نے ثالث کے زیرِ نظر شمارے کا آغاز غضنفر کی ہی دعائیہ نظم اور نعتِ پاک سے کیا ہے۔

زیرِ نظر شمارے کا سب سے پہلا مضمون جنوبی ہند کی نوجوان اور فعال قلم کار ڈاکٹر ریشما قمر کا ہے جس کا عنوان ''ہمہ رنگ غضنفر'' ہے۔اپنے اس مضمون میں غضنفر کی شخصیت کے کئی رنگوں اور جہتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اس کے علاوہ قارئین اور ریسرچ اسکالرس کی سہولت کے لئے ان کی شائع شدہ کتب کی فہرست مع سنِ اشاعت بھی پیش کی گئی ہے۔ان کے مطابق غضنفر کی شخصیت کا ایک بڑا وصف توازن ہے جسے انہوں نے زندگی کے ہر دور میں برقرار رکھا ہے۔ جب کہ پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی کے نوکِ قلم سے حدِ نگاہ تک میں وہ ایک ایسے انسان کے طور پر نظر آتے ہیں جو دوستوں کو بھولنا نہیں جانتا مگر نتیجے میں یہ بھی چاہتا ہے کہ اسے یاد رکھا جائے۔اپنے مختصر مضمون ''الفاظ کا جادوگر'' میں مشتاق احمد نوری نے غضنفر کے فکشن پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ وہ اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے اور خاصے مقبول بھی ان کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ لوگ انہیں کہانی انکل کے نام سے یاد کرنے لگے ہیں۔یہی نہیں فکشن کے حوالے سے وہ موجودہ وقت میں بھی صد فی صد relevant ہیں۔انہیں زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے ان کے لکھے خاکے تو بے مثال ہیں۔طیب فرقانی کے ذریعہ غضنفر سے کیا گیا ایک تحریری مصاحبہ بھی شاملِ اشاعت ہے، جس میں ان کے تخلیقی محرکات اور عصری ادب کی سمت و رفتار کے حوالے سے کار آمد گفتگو کی گئی ہے۔

اسی شمارے میں ''میرا تخلیقی عمل'' کے عنوان سے غضنفر کا ایک تفصیلی مضمون بھی شامل ہے جس میں انہوں نے اپنی بعض تخلیقات کے محرکات و اسباب کی نشاندہی کی ہے۔اپنی تحریر میں انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تخلیق کار اپنی تخلیق کے تمام تر رموز و اسرار اور محرکات و عوامل سے واقف ہوتا ہے مگر یہ بات ہمیشہ سچ نہیں ہوتی۔کئی بار کسی تخلیق کے حوالے سے قاری یا ناقد مختلف جواز و مفاہیم دریافت کرتے ہیں۔جن سے تخلیق کار بالکل واقف نہیں ہوتا۔انہوں نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ کئی بار تخلیق کا پروسیس فوراً مکمل ہو جاتا ہے جب کہ بعض اوقات تخلیقی عمل مہینوں بلکہ غیر معینہ

مدت تک جاری رہتا ہے۔غضنفر نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ان کی بعض کہانیوں کے بارے میں ناقدین نے ایسے نکتے بیان کیے ہیں جوان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھے۔

شارب ردولوی نے غضنفر کی تخلیق کردہ مثنوی کربِ جاں کے حوالے سے گفتگو کی ہے ، جسے انہوں نے موجودہ عہد کی مہابھارت سے تعبیر کی ہے،جس کا سنجے خود تخلیق کار ہے۔انہوں نے اپنے مضمون میں یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ گزشتہ بیس پچیس برسوں میں ’’کربِ جاں‘‘ سے بہتر مثنوی وجود میں نہیں آئی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ غضنفر واقعہ یا موقع کے ہر ممکن گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے بات اتنی طویل ہوجاتی ہے کہ ذہن پر دباؤ بن جاتا ہے۔پیغام آفاقی کا مضمون ’’اردو ناول کی تجدید اور غضنفر‘‘ ایک اہم مضمون ہے جس میں مضمون نگار نے مم، پانی، کینچلی، دویہ بانی اور کہانی انکل سمیت ان کے کئی ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب رہے ہیں کہ غضنفر اپنے ہم عصر ناول نگاروں کے مقابلے ایک بالکل نئے روپ میں سامنے آئے ہیں وہ اپنے ناولوں میں روایتی اور سامنے کے مسائل کو بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں بلکہ موضوعات کے انتخاب میں اپنے وژن اور تجربات و مشاہدات پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔یہی نہیں ان کے یہاں طبقاتی عصبیت اور تنگ ذہنی نہیں ہے۔ناول کی زبان اور ٹریٹمنٹ کے حوالے سے بھی ان کے یہاں انفرادیت پائی جاتی ہے۔

اسی شمارے میں پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے بھی اپنے مضمون میں غضنفر کے ناولوں کا مطالعہ پیش کیا ہے ان کے مطابق دویہ بانی سب سے عمدہ اور مضمون نگار کا سب سے پسندیدہ ناول ہے جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مذکورہ ناول دلت ادب کا نیا ڈسکورس پیش کرتا ہے۔پروفیسر شہاب ظفر اعظمی کی رائے میں ناول نگار کی انفرادیت یہ ہے کہ بڑی مہارت سے وہ قاری کو ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں منتقل کر دیتا ہے۔اس کے علاوہ یہ بات بھی فاضل مضمون نگار نے بڑی خصوصیت سے لکھی ہے کہ غضنفر کے ناول کے سارے موضوعات زمینی ہیں اور ان کے یہاں تکنیک کا استعمال بھی بڑی ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے بھی غضنفر کے ناولوں پر مبنی اپنا ایک مضمون شامل کیا ہے جس کا عنوان ’’ غضنفر: ایک مختلف رنگ وآہنگ کا ناول نگار‘‘ ہے۔ان کے نزدیک موجودہ عہد میں سب سے زیادہ رنگا رنگ اور متنوع ناول غضنفر کے قلم سے ہی نکلے ہیں۔اگر چہ ان کے کئی ناول ضخامت کے اعتبار سے کم ہیں مگر ان کے باطنی کینوس میں بڑی وسعت ہے۔ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے بھی پانی، کینچلی، کہانی انکل، دویہ بانی، مم اور مانجھی وغیرہ کے حوالے سے ہی تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ان کے مضمون سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہوں نے غضنفر کے تقریباً تمام ناولوں کا گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے یہاں

نئے نکات فراہم کیے ہیں۔انہوں نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ دو یہ بانی دراصل ایک دلت ناول ہےاوراس میں موضوع کی مناسبت سے سنسکرت آمیز زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔فکشن کے بعض ناقدین کے مطابق دو یہ بانی اردو ادب میں دلت ادب کا پہلا نمونہ ہے۔

تسلیم عارف نے اپنا مضمون شوراب کے حوالے سے تحریر کیا ہے اور یہ انکشاف بھی کیا ے کہ غضنفر نے اس ناول میں سماج کے اس نظام پر گہری چوٹ کی ہے جس کے تحت لڑکی کی شادی اس کے والدین مال و دولت کی بنیاد پر کرتے ہیں اس حقیقت کے باوجود کہ زن وشوہر کے درمیان مزاج کی ہم آہنگی نہیں ہے۔

مہدی جعفر نے اپنے مضمون غضنفر کی کہانیاں اور عصرِ رواں کی شناخت میں ان کی کئی کہانیوں کا تجزیہ پیش کیا ہے اوران کہانیوں کے تخلیقی عوامل اور جواز و مضمرات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔غضنفر کی کہانیوں کے مطالعے سے ادب کا کوئی بھی قاری اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ ان کے یہاں جہاں ایک طرف موضوعات کا تنوع ہے وہیں تکنیک اور زبان و بیان کی سطح پر بھی رنگا رنگی نظر آتی ہے۔ان کے یہاں کہانیوں کے اظہار کا اسلوب بیانیہ سے علامت نگاری تک پھیلا ہوا ہے۔ان کا منفرد اسلوب شعوری نہیں بلکہ وہبی ہے۔وہ اپنی کہانیوں میں سماج کی دکھتی رگ پر بھی انگلی رکھ دیتے ہیں۔پروفیسر علی رفاد فتیحی کا مضمون ''غضنفر کا بیانیہ''اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں فاضل مضمون نگار نے غضنفر کے ناولوں اور کہانیوں کے لسانی نظام پر گفتگو کی ہے۔اور یہ بتایا ہے کہ غضنفر نے اپنی تحریروں میں انحرافی آہنگ کا استعمال کیا ہے جس کے سبب زبان کے مروجہ نارم کی نفی ہوتی ہے۔ان کے اسی اسلوب کی وجہ سے ان کے یہاں کئی تحریروں میں انفرادیت اور انوکھے پن کا احساس ہوتا ہے۔مضمون نگار نے غضنفر کے ناولوں کے حوالے سے بڑی بات یہ لکھی ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں ایک نئی زبان خلق کرتے نظر آتے ہیں جس میں جدت،ندرت،تنوع اور انوکھے پن کے علاوہ نئے لسانی سانچے،نئی لسانی تشکیلات اور تلازمات وانسلاکات سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

ثالث کے اس خاص شمارے میں غضنفر کے فکشن کے حوالے سے پروفیسر اسلم جمشید پوری کا ایک مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ غضنفر ہر طرح کی زبان لکھنے پر قادر ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں اسلوب کی سطح پر بھی مختلف رنگ ملتے ہیں۔غضنفر کے کئی افسانوں میں قدیم وجدید،نئی اور پرانی نسلوں کے درمیان ٹکراؤ ملتا ہے۔سمیرہ رفیق نے اپنے مضمون میں غضنفر کے کئی افسانوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے اوران کے تخلیقی مضمرات کی نشاندہی کی ہے۔ڈاکٹر محمد فرقان سنبھلی نے کہانی انکل پر مختلف زاویوں سے اپنی رائے پیش کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ناول نگار کی نظر اپنے وقت پر ہے۔وہ پوری شدت کے ساتھ ملک کے تبدیل ہوتے سیاسی اور سماجی حالات کو محسوس کرتے ہیں اور انہیں اپنے ناول اور

افسانوں میں بیان کرنے پر بھی قادر ہیں۔ڈاکٹر ذاکر حسین کا جو مضمون اس شمارے میں شامل ہے وہ غضنفر کی ڈرامہ نگاری سے متعلق ہے۔ان کے مطابق ''کوئلے سے ہیرا'' ان کا پہلا ڈرامہ ہے جو ان کے زمانۂ طالب علمی میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔اس ڈرامے کا مرکزی تھیم یہ ہے کہ وہ نوجوان جو جوانی میں بھٹک جاتے ہیں اگر والدین ان پر سختی کریں تو وہ گھر سے بھاگ نکلتے ہیں۔اور اس طرح معاشرے میں بکھراؤ اور بھٹکاؤ کا سبب بنتے ہیں۔

سید محمد اشرف نے غضنفر کی خودنوشت یعنی ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' کے متعلق مختصراً اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی خودنوشت پر وفیسر ظفر کمالی نے قدرے تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان کی ذاتی زندگی کے متعلق کئی اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔مضمون نگار کو ان سے یہ شکایت بھی ہے کہ انہوں نے اپنی خودنوشت میں اپنے تخلیقی سفر کی داستان کو بیان نہیں کیا ہے اور نہ ہی انہوں نے اپنے باطن کی سیر کرائی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے پوری کتاب میں اپنی ظاہری زندگی کے پہلوؤں پر ہی توجہ صرف کی ہے۔پروفیسر صفدر امام قادری کا مضمون ''غضنفر:ایک انشا پرداز قصہ'' گو اہم اور قبلِ مطالعہ اس لئے بھی ہے کہ مضمون نگار نے اس میں غضنفر کے خاکوں کے متعلق تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ان کے مطابق غضنفر کے تحریر کردہ خاکوں کی تعداد ۲۰ سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔غضنفر نے صرف اپنے پسندیدہ قلم کرداروں کے خاکے نہیں لکھے بلکہ ان لوگوں پر بھی توجہ دی ہے جن سے ان کی محض چند ملاقاتیں اور رسمی تعلقات ہی رہے۔غضنفر کے خاکوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے صفدر امام قادری نے لکھا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کو حاضر سے غائب اور قریب سے دور لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے صاحبِ خاکہ کی شخصیت کے کئی پوشیدہ گوشے بھی روشن ہو جاتے ہیں۔وہ اپنے خاکوں میں انشا پردازی کے ہنر کو آزمانے میں بھی پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔صفدر امام قادری نے اپنے مضمون میں خاکہ نگاری کی مختصر تاریخ اور سمت و رفتار پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے نئی نسل کے قلم کاروں کو یقینی طور پر مدد ملے گی۔ڈاکٹر افشاں بانو کا مضمون بھی غضنفر کے خاکوں پر ہی مشتمل ہے۔ان کے نزدیک غضنفر کے بعد کے خاکے بڑی حد تک تقریباتی اور فرمائشی معلوم ہوتے ہیں۔یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ظرافت کی آمیزش کے بغیر بہت کم خاکے لکھے گئے ہیں مگر غضنفر کے یہاں صورتِ حال یکسر مختلف ہے ان کے یہاں خاکوں میں ایک طرح کی سنجیدگی ہے بلکہ کہیں کہیں افسانوی رنگ بھی غالب آ گیا ہے۔سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ان کے خاکے مختصر اور دلچسپ ہوتے ہیں نیز اپنے قاری کو باندھے رکھنے کی صلاحیت سے بھی معمور ہوتے ہیں۔

محمد ابو رافع نے ۲۰۰۷ میں شائع غضنفر کی کتاب لسانی کھیل کے حوالے سے مضمون لکھا ہے جو

اردو سیکھنے والوں کے لئے تو مفید ہے ہی عام قاری بھی اس کتاب سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ان کے مطابق اس کتاب کے مشمولات میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے جو پرائمری درجات سے لے کر اعلیٰ درجات کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ایک اور بات اس کتاب کو اہم بناتی ہے وہ یہ کہ طلبہ کی تعلیمی استعداد کو بڑھانے اور اس کی جانچ کرنے کے مرحلے میں عنوان سازی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔نہاں رباب نے غضنفر کے تدریسی زاویۂ نظر کے حوالے سے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے انہوں نے غضنفر کی ان کتابوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے جو درس و تدریس کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ان کے مطابق غضنفر نے ایک ایسا قاعدہ بھی تیار کیا ہے جو سائنٹیفک طریقے سے اردو سکھانے کا کام کرتا ہے۔اس کے علاوہ واحد نظیر کا ایک مضمون بھی اس خاص شمارے میں شامل ہے جو ان کی شعری کتاب ''آنکھ میں لکنت'' کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔پروفیسر منظر حسین کا مضمون بھی غضنفر کی شاعری کے حوالے سے ہی لکھا گیا ہے جس میں ان کی شاعری کے فکر و احساس نیز اظہار و بیان کے مختلف رنگ و آہنگ کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس طرح دیکھیں تو غضنفر کی شاعری کے حوالے سے کئی مضامین اس خصوصی شمارے کی زینت ہیں جن میں ان کے شعری تجربات کی کئی جہتیں دریافت کی گئی ہیں۔

محمد مرجان علی کا مضمون قدرے مختلف ہے، ان کے مضمون کا عنوان ''بچوں سے متعلق غضنفر کی شاعری: ایک مطالعہ'' ہے۔یہ مضمون اس لئے بھی دلچسپی سے پڑھے جانے کے لائق ہے کیونکہ غضنفر کی شناخت بچوں کے شاعر کی حیثیت سے کبھی نہیں رہی۔میں نے بھی انہیں بچوں کے شاعر کے روپ میں نہ کے برابر ہی دیکھا ہے۔اپنے مضمون میں محمد مرجان علی نے یہ معلومات بہم پہنچائی ہے کہ غضنفر نے ادبِ اطفال کے تعلق سے چھ سے زائد نظمیں لکھی ہیں۔انہوں نے کئی مثالوں کی مدد سے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ غضنفر نے بچوں کے لئے نظمیں لکھتے وقت اصلاحی اور تبلیغی پیرایہ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے ان نظموں میں امن و آشتی اور مساوات و اخلاق کا پیغام دیا ہے۔مجموعی طور پر سہ ماہی ثالث کے اس خصوصی نمبر میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے غضنفر کی ادبی اور تخلیقی شخصیت کے تمام تر پہلوؤں کا نہ صرف احاطہ کیا ہے بلکہ رسالے کے روایتی معیار و مزاج کا بھی بھرپور خیال رکھا ہے۔غضنفر کی ادبی شناخت مستحکم ہے وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، محقق، نقاد، خاکہ نگار، انشائیہ نگار اور سوانح نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں لہٰذا مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ثالث نے اس خاص شمارے کے لئے غضنفر کی شخصیت کا انتخاب کر کے دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے اور اس طرح اپنے ہر شمارے کے ساتھ یہ رسالہ ادب میں قابلِ تقلید مزاج و معیار کی نئی تاریخ مرتب کرنے میں کامیاب ہے جس کے لئے مدیر رسالہ قابلِ مبارک باد ہیں۔غضنفر کے فکر و فن پر

مشتمل اس شمارے میں غضنفر کی تخلیق وتحریر کے نمونے بھی شامل کیے گئے ہیں۔

غضنفر نے اپنے مضمون ''آئینۂ اردو'' میں دوسری زبانوں کا عکس میں انہوں نے اردو اور دوسری زبانوں کے مابین رابطوں کی تلاش کی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اردو زبان اپنے تشکیلی دور سے گزرتے ہوئے کن کن زبانوں کی مقروض رہی ہے ان کے مطابق ہماری زبان کو شناخت زبانِ ترکی سے ملی۔ترکی اگر اس زبان کا نام اردو نہ رکھتی تو یہ اب بھی ہندی، ہندوی، ہندوستانی اور دکنی وغیرہ کے چکر میں ہی پڑی رہتی۔غضنفر نے مثل کی تعریف ایک جملے میں یوں بیان کی ہے کہ ایسے عملی اصول جو بہت سے لوگوں کے تجربے میں آکر زبان زد خلائق ہو جاتے ہوں، ضرب المثل کہلاتے ہیں۔ثالث کے اس شمارے میں جہاں غضنفر کے بہت سارے رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں ان کا نمونۂ داستان بھی شامل ہے جو داستان ایک مردِ جنوں پسند کی کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ان کی داستان تصورات کی ایک حیرت انگیز اور پراسرار دنیا کی سیر کراتی ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ اس میں قافیوں کی طرز پر لفظوں کی تکرار سے جملوں کو مزید دلچسپ بنایا گیا ہے یعنی داستان گو قاری کو اپنے سحر سے آزاد ہی نہیں ہونے دیتا۔میرے نزدیک یہی خصوصیت داستان گو کو معتبر اور منفرد بناتی ہے۔

غضنفر کے نئے ناول ''بے گھری'' کا ایک باب بھی شامل کیا گیا ہے اب مجھے نہیں معلوم کے ان کا یہ ناول تخلیق شدہ ہے یا پھر اب بھی تخلیق کے مراحل میں ہے۔مگر ناول کا جتنا کچھ حصہ اس میں شامل کیا گیا ہے وہ دلچسپ ہے اور اس باب میں انسانی رشتوں، بڑے شہروں کے مسائل اور تنگ فلیٹس میں رہائش اور زندگی کرنے کی نفسیاتی الجھنوں کے علاوہ نئی اور پرانی نسلوں کے درمیان تہذیبی تصادم کو نہایت ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے جو قاری کو ناول کے مرکزی تھیم تک آسانی سے پہنچا دیتا ہے۔ویسے بھی غضنفر کے ناولوں کے مختلف ابواب کو اگر علاحدہ سے بھی پڑھیں تو وہ مکمل کہانیاں ہی معلوم ہوتے ہیں اور ناول کی کہانی کی تفہیم و تعبیر میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔یہ ایک ایسا آرٹ ہے جو بہت کم ناول نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔غضنفر کا افسانہ ''کڑوا تیل'' بھی ثالث کے اس شمارے کی زینت ہے۔فکشن کے ناقدین اس افسانے کو ان کے چند بہت عمدہ افسانوں میں شمار کرتے ہیں۔یہ افسانہ اپنی تھیم، ٹریٹمنٹ اور تکنیک کے اعتبار سے واقعی ایک بہترین افسانہ ہے جس کی تفہیم وتعبیر فکشن کے ناقدین نے کئی مختلف زاویوں اور جہتوں سے کی ہے اسی شمارے میں کڑوا تیل کے حوالے سے فکشن کے ممتاز ناقد شافع قدوائی کی ایک تجزیاتی تحریر بھی شامل ہے جس میں انہوں نے افسانے میں موضوعاتی سطح پر ظلم واستحصال کے خلاف صدائے احتجاج کی نشاندہی ہے ان کے مطابق کولہو میں جتے ہوئے بیل کی طرح معاشرے کا ایک حصہ استحصال کا شکار ہے۔اور یہ سلسلہ شاید کبھی ختم

نہ ہو کیوں کہ کولہو کے بیل کی جگہ ایک بچھڑے کو تیار کیا جا رہا ہے۔ دراصل ہمارے معاشرے کی اساس ہی استحصال پر قائم ہے اور اس طرح جبر و استحصال کا یہ سلسلہ نسل در نسل جاری وساری رہتا ہے۔انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ غضنفر کا یہ افسانہ معنویت کی کئی جہتوں میں روشن ہوتا ہے۔اپنی تحریر میں شافع قدوائی نے کڑوا تیل کا ردِ تشکیلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور اس سے خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد کیا ہے۔

غضنفر کا دوسرا افسانہ جو اس شمارے کی زینت ہے اس کا عنوان ہے ''سرسوتی اسنان'' جس کا تجزیہ ڈاکٹر ریشا قمر نے کیا ہے وہ نئی نسل کی ہونہار، ذہین اور باصلاحیت قلم کار ہیں شاعری کے علاوہ فکشن سے ان کے سنجیدہ سروکار نے انہیں بہت کم عرصہ میں ہی شناخت عطا کی ہے۔سرسوتی اسنان قدرے طویل افسانہ ہے مگر ریشا قمر نے بڑی خوش اسلوبی سے افسانے کے مرکزی خیال، تکنیک اور اسلوب پر تبصرہ کیا ہے۔ان کے مطابق سرسوتی اسنان ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ہندو عقائد و نظریات کے علاوہ عصری حسیت بھی موجود ہے۔کیونکہ ندیاں ہمارے ملک کے باشندوں کے لئے لائف لائن تصور کی جاتی ہیں اور پھر گنگا، جمنا اور سرسوتی تو ہندوستان میں بسنے والی ایک بڑی آبادی کے لئے مقدس ہیں اور دیوی کا درجہ رکھتی ہیں۔ان ندیوں میں اسنان کرنا ہندوازم کے عقیدے کے مطابق باعثِ ثواب ہے اور ان میں نہانے سے پاپ دھلتے ہیں مگر کہانی کا مرکزی خیال ہمیں اس سے آگے لے جاتا ہے کیونکہ یہ کہانی ہماری تہذیب و ثقافت کا نوحہ بن گئی ہے۔حالانکہ اپنی تہذیبی وراثت کو سنبھال کر رکھنا ہر قوم کا فرض ہے یعنی ہم پر فرض ہے کہ اپنی ندیوں کو صاف ستھرا رکھیں اور ندیوں کو ہی کیوں ہمیں اپنے ماحول کو بھی آلودگی سے پاک رکھنا چاہیے۔تبھی ہماری ثقافت کو مٹنے سے بچا پانا ممکن ہو سکے گا۔جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ غضنفر کی یہ کہانی نسبتاً طویل ہے مگر بقول ریشا قمر طوالت کے باوجود اس کہانی میں کہیں کوئی جھول یا ڈھیلا پن دکھائی نہیں دیتا۔اس کہانی میں بھی غضنفر نے مکالموں پر بڑی محنت کی ہے۔افسانہ نگار نے مکالمے تخلیق کرتے وقت کرداروں کی نفسیات، ان کے معاشی اور معاشرتی اسٹیٹس کے علاوہ ان کی علمی حیثیت، لیاقت اور آس پاس کے ماحول کا بھی خاص التزام رکھا ہے۔اور یہ سب کچھ غضنفر کی تخلیقی اور تخیلی صلاحیتوں کے سبب ہی ممکن ہو سکا ہے۔

ثالث کے اس خاص شمارے میں غضنفر کا ایک ڈرامہ ''پاپا میاں'' بھی شامل ہے اس میں مختلف مناظر اور ایکٹ کی مدد سے کہانی کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے جسے پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ ڈرامہ اسٹیج پلے کے لئے ہی تخلیق کیا گیا ہوگا۔ان کا یعنی غضنفر کا ایک خاکہ جس کا رنگ رنگِ بہار ہے بھی اس شمارے کی زینت ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے خاکے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں اور قاری ایک بار پڑھنا شروع کر دے تو پھر ختم کئے بغیر رکتا نہیں ہے اور شاید یہی ایک کامیاب خاکے کا وصف

بھی ہے۔اس خاکے میں انہوں نے بعض ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جن کا اطلاق کسی بھی تنقیدی تحریر پر کیا جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر انہوں نے لکھا ہے کہ اچھے اور بڑے نقاد کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ جس زبان کا نقاد ہے اس زبان میں چھپنے والی ہر ادبی تحریر پر اس کی نگاہ پڑے اور اس پر وہ اپنا ردِعمل بھی ظاہر کرے۔مگر انہوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ یہ کام مشکل ہے۔ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ بڑے بن جانے کے بعد آدمی نہیں رہ پاتے۔یا تو وہ آدمی کے زون سے نکل جاتے ہیں یا اپنے آدمی کو دبا دبا کر مار ڈالتے ہیں مگر اس شخص نے بڑے ہو جانے کے بعد بھی اپنے اندر کے آدمی کو زندہ رکھا۔اسے مرنے نہیں دیا۔

''شہر نامہ'' کے عنوان کے تحت ان کی تحریر کلکتے کا جو ذکر کیا بھی اس شمارے کی زینت ہے۔ انہوں نے اپنی اس تحریر میں شہر کلکتہ اب کولکاتا کی کئی خوبیوں اور خامیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ کلکتہ میں رہنے والے لوگوں کے سیاسی اور سماجی شعور کو بھی اپنی یادداشت کا حصہ بنایا ہے۔انہوں نے تحریر کیا ہے کہ یہ شہر اس لئے بھی دامنِ دل کو کھینچتا ہے کیونکہ یہاں مظلوم ظالم کے جبر پر چپ نہیں رہتا بلکہ ٹکر لینے اور ٹکرانے کے لئے گھر سے نکل کر جانبِ میدان چل پڑتا ہے۔ان کے مطابق اس شہر کی زندگی پر کوئی ملمع نہیں ہے۔آخر میں انہوں نے اس شہر کے حوالے سے بڑی قیمتی بات کہی ہے کہ وہ اس شہر کی تعظیم اس لئے بھی کرتے ہیں کیونکہ اس شہر نے دنیا کو گیتا نجلی جیسا گرنتھ دیا۔

غضنفر کے فکر وفن پر مرکوز ثالث کے اس خاص شمارے کے آخر میں ان کی شاعری کے نمونے بھی شامل کیے گئے ہیں جن پر علاحدہ سے اظہارِ رائے سے گریز کرتا ہوں۔مثنوی کربِ جاں، مثنوی قمر نامہ اور مثنوی حرزِ جاں سے شاعری کے نمونوں کے علاوہ ان کی چند غزلوں اور نظموں کی شمولیت کو بھی یقینی بنایا گیا ہے۔اس کے علاوہ مستقل کالم کے تحت ثالث کے گزشتہ شمارے پر جن اہلِ قلم کے تبصرے اور تاثرات شامل کیے گئے ہیں ان میں پروفیسر خالد حسین، ڈاکٹر شاہد جمیل، عشرت ظہیر، ڈاکٹر فخر الدین عارفی اور ڈاکٹر سرور حسین وغیرہ کے تبصرے دلچسپی سے پڑھے جانے لائق ہیں اور ثالث کو قابلِ قدر بناتے ہیں۔راقم الحروف (سلیم انصاری) کے تبصرے کو بھی مدیر ثالث نے اس شمارے میں جگہ عنایت کی ہے جس کے لئے ممنون ہوں۔مکتوبات کے کالم ڈاکٹر احسان تابش، غضنفر اور ریشا قمر کی شمولیت سے ثالث کے مزاج و معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر ثالث کا زیرِ نظر شمارہ جو غضنفر کے فکر وفن کے تقریباً تمام تر پہلوؤں پر محیط ہے، بے حد خاص اور قابلِ قدر ہے، جس کی جتنی بھی پزیرائی کی جائے، کم ہے۔مجھے اندازہ ہے کہ اس ضخیم شمارے کی ترتیب میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد (مدیر ثالث) نے کتنی عرق ریزی اور محنت کی ہوگی۔میں ذاتی طور پر

انہیں اس شمارے کے لئے مبارک باد پیش کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ ثالث آئندہ بھی ایسی ہی نا قابلِ فراموش ادبی تاریخ رقم کرتا رہے گا۔

◄ ● ►

● **ڈاکٹر احسان عالم**

کتابی سلسلہ ''ثالث'' کا غضنفر نمبر: ایک تنقیدی مطالعہ

سرزمین بہار سے کئی رسائل و جرائد شائع ہوتے رہے ہیں۔ کئی رسائل بند ہو گئے اور کئی تواتر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان رسالہ ''ثالث'' اقبال حسن آزاد کی ادارت میں اشاعت کا گیارہواں سال مکمل کرنے جا رہا ہے۔ ''ثالث'' کے زیادہ تر شمارے دستاویزی حیثیت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ زیر مطالعہ شمارہ معروف فکشن نگار غضنفر نمبر ہے۔ اس شمارہ کو طویل عرصے تک یاد کیا جائے گا اور لوگ اپنی لائبریریوں میں محفوظ رکھیں گے۔

معروف فکشن نگار غضنفر ۹؍مارچ ۱۹۵۳ کو بہار کے ضلع گوپال گنج کے ایک گاؤں چوراؤں میں پیدا ہوئے۔ گھریلو رواج کے مطابق غضنفر کی تعلیمی سلسلے کا آغاز مدرسہ سے ہوا۔ غضنفر کے ادبی سفر میں نام کی تبدیلی کا بڑا دخل رہا۔ بچپن میں غضنفر اشفاق احمد ہوا کرتے تھے لیکن عقیقہ کے موقع پر ان کے ماموں جان نے ان کا نام غضنفر علی رکھ دیا۔

غضنفر علی غضنفر کی غزلیں جب شمس الرحمٰن فاروقی کے جریدے ''شب خون'' میں شائع ہوئیں تو شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ کہتے ہوئے کہ ایک نام میں دو دو غضنفروں کا کیا کام ہے، غضنفر علی غضنفر کو صرف غضنفر تک محدود کر دیا۔ اس کے بعد وہ لگاتار صرف غضنفر کے نام سے لکھتے رہے۔

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد کے اداریہ کے بعد غضنفر کے حمد اور نعت سے رسالہ کا آغاز ہوا ہے۔ جب ہم مضامین کے سلسلے پر نظر دوڑاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ رسالہ میں شامل سب سے پہلا مضمون ''ہمہ رنگ غضنفر'' کے عنوان سے ہے جسے ڈاکٹر ریشا قمر نے تحریر کیا ہے۔ ان کے مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غضنفر کی شخصیت کا ایک بڑا وصف توازن ہے۔ ان کی خودنوشت ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے پورے سفر میں توازن کو برقرار رکھا۔ ان کی زندگی میں بڑے دن بھی آئے اور اچھے دن بھی۔ بُرے دنوں میں بھی انہوں نے خود کو ٹوٹ کر بکھرنے نہیں دیا اور اچھے دنوں میں اپنے مزاج پر مکمل کنٹرول رکھا۔

پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی اپنے مضمون ''نوک قلم سے حد نگاہ تک'' میں لکھتے ہیں کہ غضنفر بھولنا نہیں

جانتے، دوستوں کو یادرکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں بھی یادرکھا جائے۔ جن دنوں وہ سی آئی ایل کے لکھنؤ سینٹر میں پرنسپل تھے، کسی نہ کسی پروجیکٹ کے تحت دہلی، علی گڑھ، الہٰ آباد، پٹنہ، گیا اور لکھنؤ کے احباب کو اکٹھا کرلیا کرتے تھے۔ دن میں کام ہوتا اور رات میں ادبی محفلیں منعقد ہوتیں۔ دعوت اور اصرار کے باوجود بیرون علی گڑھ ان کی ایسی کسی بزم میں شریک نہیں ہوسکا۔ البتہ ان محفلوں میں سنائے گئے افسانوں اور پڑھے گئے مضامین کی روداد گوش گزار ہوتی رہی۔

''الفاظ کا جادوگر: غضنفر'' مشتاق احمد نوری کے افکار قلم سے وجود میں آیا ہے۔ واقعی غضنفر الفاظ کے جادوگر ہیں۔ مشتاق احمد نوری اس معروف فکشن نگار کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ غضنفر کا تعلق بہار سے ہے لیکن ان کی ذہنی پرورش یوپی میں ہوئی۔ علی گڑھ میں تعلیمی قیام رہا۔ اساتذہ سے قربت نصیب رہی۔ وہاں کی تہذیب ان کی شرست میں داخل ہوتی رہی۔ پھر ایک لمبا عرصہ لکھنؤ میں بھی گزرا۔ لکھنوی تہذیب کے بھی امین رہے۔ گلابی زبان لکھتے ہی نہیں بولتے بھی ہیں۔ ان کا سمر پن اور ان کی منکسر المز اجی کی مثال کم ملتی ہے۔

ممتاز اور بلند پایہ قلمکار شارب ردولوی ''ایک قصہ زندگی کا (کرب جاں کے حوالے سے)'' میں لکھتے ہیں کہ غضنفر کی ایک خوبی یا کمزوری یہ ہے کہ کسی بھی واقعے یا موقع کے ہر ممکن گوشے کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں بات اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ذہن پر دباؤ بن جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جس روانی سے غضنفر نے شعر کہے ہیں، انہیں پڑھتے وقت نگاہیں کسی جگہ پر رک نہیں پاتی ہیں۔ یہ صرف شعری اظہار پر ان کی قدرت کی بات نہیں ہے بلکہ تاریخ، جغرافیہ، تہذیب، تمدن، ثقافت، سیاست پر گرفت کی بات ہے۔

پیغام آفاقی ادبی حلقوں میں اپنی شہرۂ آفاق حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے غضنفر کے ناولوں کے حوالہ سے پُر مغز گفتگو کی ہے۔ غضنفر کی ادبی حیثیت کس قدر مسلم ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی فکشن نگاری کے مختلف پہلوؤں پر ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے درجنوں اردو اسکالرز نے تحقیقی مقالے تحریر کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ غضنفر کی ناول نگاری سے بحث کرتے ہوئے پیغام آفاقی لکھتے ہیں کہ غضنفر بحیثیت ایک ہم عصر ناول نگار ایک الگ ہی انداز میں سامنے آئے ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کو نئے زاویوں سے دیکھنے پر اصرار کیا ہے۔ وہ ان ادیبوں سے مختلف ہیں جو صرف اپنے عصر کے جانے مانے مسائل اور حقائق کو پیش کرتے ہیں۔ فسادات، تقسیم ہند اور کرپشن جیسے موضوعات جن کی شناخت ہو چکی ہے۔ اس کو ناول کا موضوع بنانا ایک بات ہے اور زندگی کی تہہ در تہہ گہرائیوں سے غیر محسوس طریقے سے سماج کو متاثر کرنے والی سوچ کی نشان دہی کرنا اور اس کو ناول کا موضوع بنانا اور بات ہے۔

پروفیسر شہاب ظفر اعظمی کا تعلق شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسیٹی سے ہے۔ وہ صدر شعبۂ اردو ہیں۔ فکشن تنقید

میں مہارت رکھتے ہیں۔ ''غضنفر کی ناول نگاری'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ غضنفر نے مترادفات کا استعمال خوب کیا ہے۔ان کے مترادفات الفاظ بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے جملے بھی، جو آہستہ آہستہ واقعے کو بڑھانے میں مدد پہنچاتے ہیں اور نثر میں شاعرانہ نغمگی پیدا کرتے ہیں۔مگر کہیں کہیں شاعرانہ تک بندی کی طرح استعمال کئے گئے مترادف جملے نثر کی سلاست کو نقصان بھی پہنچا گئے ہیں مصنف کو ایسے جملوں سے احتراز کرنا چاہئے تھا۔

رسالہ ''ثالث'' کے مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد ''غضنفر: ایک مختلف رنگ و آہنگ کا ناول نگار'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ غضنفر ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔کبھی کبھی تو یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ کسی ایک شخص میں اتنی ساری خوبیاں کہاں سے سما گئی ہیں۔وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار ،محقق، غزل گو، نظم گو اور خاکہ نگار تو ہیں ہی ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی خودنوشت ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' بھی تحریر کی ہے جس نے ادبی دنیا میں ہلچل مچا رکھی ہے۔غضنفر نے اب تک کل نو ناول لکھے ہیں۔

''ہم عصر مسلم خواتین کی کردار نگاری اور 'شوراب'' کے عنوان سے تسلیم عارف لکھتے ہیں کہ غضنفر اپنے ناولوں اور افسانوں میں ہم عصر تانیثی مسائل پر اپنے گہرے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر روشنی ڈالتے ہیں۔ہم عصر عہد اور گلوبلائزیشن کے تناظر میں مسلم معاشرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے انہوں نے ''شوراب'' کے نام سے چند برس قبل ایک مختصر ناول تحریر کیا تھا۔ہم عصر عہد کے متوسط مسلم معاشرے میں اب یہ رواج زور پکڑ رہا ہے کہ ان کے گھروں سے ایک یا دو افراد عرب ممالک میں ذریعۂ معاش کے لیے ہجرت کر جاتے ہیں۔

غضنفر علامت کو سہولت کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ پروفیسر علی رفاد فتیحی ''غضنفر کا بیانیہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ غضنفر ان چند فکشن نگاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اردو فکشن کے ساختی نظام کے ساتھ مسلسل تجربہ کرنے کے روایت کی وجہ سے شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے ناول موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ ساخت کے نئے تجربات کی وجہ سے بھی منفرد نظر آتے ہیں۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری اردو ادب کا ایک نمایاں نام ہے۔ ''غضنفر کا فکشن: ایک مختصر جائزہ'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ غضنفر کے ناولوں میں داستانوی رنگ بہت نمایاں ہے۔اسے آپ انتظار حسین کے رنگ کا عکس کہہ سکتے ہیں۔لیکن انتظار حسین کی زبان میں اساطیری عناصر زیادہ ملتے ہیں جبکہ غضنفر کے لب و لہجے میں جدید رنگ جھلکتا ہے۔وہ حسن کا بیان کرتے ہیں تو موجودہ عہد کی لفظیات کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ان کا داستانوی رنگ ان کا اپنا ہے۔

مجتبیٰ حسین غضنفر کی تحریروں میں انوکھا پن ڈھونڈتے ہوئے اپنے منفرد انداز میں لکھتے ہیں کہ غضنفر کی تحریروں میں ایک عجیب طرح کا انوکھا پن ہے۔انوکھا پن ان کے نام میں بھی ہے۔ ہر ادیب یا

شاعر کو اس کے چاہنے والے اس کے نام کے کسی جز سے ہی یاد رکھتے ہیں لیکن کتابوں پر شعرا اور ادیبوں کے پورے نام لکھے ہوتے ہیں۔غضنفر کے نام کا اختصار ادب میں ان کی قامت کو مختصر نہیں کرتا بلکہ اس کو مزید بلند کرتا ہے۔غضنفر کی خاکہ نگاری سے بحث کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں کہ غضنفر کی انفرادیت یہ بھی ہے وہ جس شخصیت کا نقشہ کھینچتے ہیں اکثر اس کا نام نہیں بتلاتے۔ پڑھنے والا خوبصورت طرز تحریر کا لطف بھی اٹھاتا ہے اور پہیلی بوجھنے کی کش مکش میں بھی گرفتار رہتا ہے۔

سمیرہ رفیق غضنفر کے چند افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ عالمی افسانہ فورم پر افسانوں کے سالانہ میلے ۲۰۲۰ میں شریک ہوئی تو ہمیشہ کی طرح رنگا رنگ افسانے پڑھنے کو ملے۔انہی افسانوں میں محترم جناب غضنفر صاحب کا ایک منفرد افسانہ کڑوا تیل بھی شامل تھا جس پر میرا تبصرہ بھی فورم کا حصہ بن چکا ہے۔اسی افسانے سے متاثر ہو کر میں نے ان کے دیگر چار افسانوں سرسوتی اسنان، خالد کا ختنہ، مسنگ مین اور مسیج الرٹ ٹون کو پڑھ کر اپنے تجربات قلم بند کیے ہیں۔

ڈاکٹر محمد فرقان سنبھلی غضنفر کے ''کہانی انکل'' کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غضنفر کے ''کہانی انکل'' کا آغاز زندگی کی اسی جدو جہد کی داستان ہے۔ ہوٹل اور کتاب کی دکان کے ذریعہ بہتر روزی روزگار کی امیدیں مذہب کی نذر ہو گئیں۔ آگ کی لپٹوں نے سب کچھ جلا کر راکھ کر دیا۔ناول نگار غضنفر کی نظر اپنے وقت پر ہے۔وہ پوری شدت کے ساتھ ملک کے بدلتے سیاسی اور سماجی حالات کو محسوس کرتے ہیں۔

غضنفر نے بہت سے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔محمد ذاکر حسین نے موصوف کی ڈرامہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ غضنفر مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ اپنے قاری کو ڈرامے کی ڈرامائیت سے لطف اندوزی کا شرف بھی بخشتے ہیں۔ جہاں ان کی تحریروں میں اسلامی تہذیب کے نادر نمونوں کی بھرمار ہے وہیں دیدہ پر ان سے پھوٹنے والی شعاؤں کی طومار بھی ہے۔ان کی تحریریں جہاں لوگوں کو اشک بار کرتی ہیں دلوں کو گدگداتی بھی ہیں۔

غضفر نے اپنی جو زندگی اپنے خودنوشت میں پیش کی ہے وہ بالعموم سادہ ہے۔ان کے مزاج میں پیچیدگیاں کم سے کم ہیں۔انہوں نے اپنی خودنوشت کو اپنی شخصیت کی طرح سادہ زبان و بیان میں پیش کیا ہے۔سید محمد اشرف نے غضنفر کی خودنوشت پر اپنے تاثرات قائم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غضنفر نے آپ بیتی میں ابواب قائم کرنے کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ یہ کتاب ایک درمیان حجم کی مسلسل ناول کی شکل میں ہے اور اس میں صرف غضنفر ہی ہیرو نہیں ہیں۔ کتاب کے ایک حصے میں ہیرو غضنفر کے والد اور ایک چچا ہیں۔

غضنفر کی خودنوشت ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' کے عنوان سے ہے۔اس خودنوشت پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے پروفیسر ظفر کمالی لکھتے ہیں کہ غضنفر گوپال گنج اور مظفر پور ہوتے ہوئے اپنے محبوب دوست

ڈاکٹر نسیم کی مہربانی سے علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کے طالب علم ہوئے۔علی گڑھ میں پڑھنا ان کا خواب بھی تھا۔غضنفر نے یہاں کی طالب علمی کی زندگی کی جو تفصیلات پیش کی ہیں اور اپنے اساتذہ کو جس محبت سے یاد کیا ہے وہ اس خودنوشت کا سب سے اہم اور خوبصورت حصہ ہے۔اپنی خودنوشت میں غضنفر نے سب سے زیادہ اپنی خاکہ نویسی کے ہنر کو آزمایا ہے۔انہوں نے اپنے اساتذہ اور دوستوں کی خوبیوں کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ خودنوشت کا باطنی منظر نامہ جگمگا اٹھا ہے۔

پروفیسر صفدر امام قادری بھی ایک ماہر تنقید نگار ہیں۔''غضنفر:ایک انشا پرداز قصہ گو'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غضنفر کی ادبی روح حقیقتاً قصہ گوئی کے آس پاس بستی ہے۔آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ نو ناول، دو افسانوی مجموعے، ایک ڈراما اور ایک سوانحی ناول ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا نتیجہ ہیں۔یہ ان کے مکمل ادبی سرمایے کا نصف سے زیادہ حصہ ہے۔غضنفر نے اچھی خاصی شاعری کی ہے اور غزلوں کے ساتھ نظموں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔

غضنفر کی خاکہ نگاری کے امتیازی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر افشاں بانو لکھتی ہیں کہ غضنفر کے خاکے اگر چہ پہلے مطالعے میں ہمیں خوب چونکاتے ہیں اور لطف بھی دیتے ہیں مگر دوسری اور تیسری قرأت میں ایک قاری کو وہ شئے نہیں مل پاتی جس کے لیے پڑھنے والا کسی خاکہ نگار کے قدموں میں بیٹھنا چاہتا ہے۔تعداد کے اعتبار سے غضنفر نے کم خاکے نہیں لکھے مگر خاکہ نگاری کے فن کو نگاہ میں رکھیں تو ان کے خاکے ادبی معیار پر اس طرح سے درجۂ امتیاز پاتے ہوئے نظر نہیں آتے جیسا ان کے دوسرے شہہ کار اور بالخصوص افسانے اور ناول تسلیم شدہ ہیں۔

محمد ابورافع ''لسانی کھیل'' کی تدریسی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''لسانی کھیل'' ایک طرح کا طریقۂ تدریس ہے جس سے زبان وادب کی تدریس آسان، رواں دواں اور دلچسپ ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے کھیل کو اپنا کر بچوں کی بنیادی تعلیم کو مضبوط کیا جا سکتا ہے اور انہیں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کئے جا سکتے ہیں۔اس کتاب کے بارے میں یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ اس کتاب میں ایسے چھوٹے بڑے تمام کھیلوں کو اس طرح یکجا کیا گیا ہے جو پرائمری درجات سے لے کر اعلی درجات کی ضرورت کو پوری کر سکیں۔

''غضنفر:ایک فکری فن کار'' کے عنوان سے ڈاکٹر واحد نظیر نے ایک جامع مضمون قلمبند کیا ہے۔ ان کی فنکاری پر قلم فرسائی کرتے ہوئے واحد نظیر لکھتے ہیں کہ غضنفر کی تحریریں کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے یہ اعتراف کراتی ہیں کہ تخلیق کار بے پناہ تخلیقی صلاحیت کا مالک ہے۔فکشن میں ناول، افسانہ اور شاعری کی کئی صنفوں میں طبع آزمائی اور مسلسل اشاعت اس مکرر تخلیقی عمل کو بھی ظاہر کرتی ہے جس کی خو جبر نہیں لذت سے پیدا ہوتی ہے۔

غضنفر نے شاعری بھی کی ہے۔ان کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے پروفیسر منظر حسین لکھتے ہیں کہ غضنفر کی غزلوں کی تہہ میں جائیں تو ایک ایسے شخص کی آواز سنائی دے گی جس نے محسوسات کو فکر کا رتبہ عطا کیا ہے۔وہ محض واردات قلبی کے شاعر نہیں ہیں۔ان کی فطانت غزل کے سانچے میں اپنی اظہاریت کو پہنچتی ہے۔ان کی شاعری میں کلاسیکی بانکپن بھی ہے اور مہذیب لب ولہجہ بھی اور سب سے بڑھ کر وہ عصر بھی ہے جسے ہم صدائے دروں سے موسوم کرسکتے ہیں۔ان کی غزلیہ شاعری سے دو اشعار ملاحظہ کریں اور محظوظ ہوں:

عدالتوں کی ہماری عجیب حکمت ہے　　کہیں بھی جائیں سزائیں ہمیں ہی ملتی ہیں
کہ جس کے خواب میں بھی عکس غاصبیت ہے　　اسی کو سونپ دیا ہم نے منصفی کی زمام

غضنفر نے بچوں کے لئے بھی شاعری کی ہے۔بچوں کے حوالے سے ان کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے محمد مرجان علی لکھتے ہیں کہ غضنفر نے ادب اطفال کے تعلق سے چھ درجن سے زائد نظمیں اور کہانیاں لکھی ہیں۔''سخن غنچہ'' کے عنوان سے ایک مجموعہ بچوں کے ادب کے تعلق سے 2016 میں منظر عام پر آیا جس میں 54 نظمیں اور 9 کہانیاں ہیں۔بچوں کی دلچسپی کے لئے غضنفر کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

دیکھو تتلی رانی آئی
کیسی مست جوانی آئی
اٹھلاتی شرماتی آئی
لہراتی بل کھاتی آئی
پھولوں کی دیوانی آئی
دیکھو تتلی رانی آئی

ان مضامین کے علاوہ ''ثالث'' کے غضنفر نمبر میں غضنفر کے چند مضامین، داستان، ناول کا باب، افسانے، ڈرامہ، خاکہ، شہر نامہ، غزلیں، نظمیں شامل ہیں۔

''ثالث'' پر کئی اہل قلم کے تبصرے شامل ہیں۔پروفیسر خالد حسین، سلیم انصاری، ڈاکٹر شاہد جمیل، عشرت ظہیر، انوارالحسن وسطوی، مرغوب اثر فاطمی، فخر الدین عارفی، ڈاکٹر سرور حسین، جرنلسٹ اقبال نے اپنے تبصروں سے ثالث کا عمدہ تعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔

اس طرح کتابی سلسلہ ''ثالث'' کا غضنفر نمبر بلا شبہ دستاویزی حیثیت کا حامل شمارہ ہے۔غضنفر پر جب بھی کوئی کام یا تحقیق ہوگی اس رسالہ کی اہمیت برقرار رہے گی۔

● نسترن احسن فتیحی (نئی دهلی)

ثالث کا خصوصی شمارہ معروف فکشن نگار غضنفر کی تخلیقی مہارت کی تلاش: ایک جائزہ

ثالث کا حالیہ خصوصی شمارہ غضنفر کی تخلیقی کاوشوں کی تلاش کے لیے وقف ہے۔ یہ شمارہ نہ صرف ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی بے لوث کاوشوں، تخیل کی گہرائیوں اور ادارتی خوبیوں کا ایک دلکش سفر ہے بلکہ اس کے صفحات کے اندر، قارئین کو غضنفر کے تخلیقات پر علمی تجزیوں، تنقیدی بصیرت اور فکر انگیز عکاسی کی ایک بھرپور تصویر ملتی ہے۔

باریک بینی اور توجہ کے ساتھ تیار کیے گیے، اس خصوصی شمارے میں معروف فکشن نگار غضنفر کی متنوع اصناف کی شراکتیں شامل ہیں، ہر ایک صنف میں غضنفر کی ادبی سفر پر ایک منفرد نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے۔ غضنفر کے بیانیہ کی تکنیک کی گہرائی سے لے کر ان کے افسانوں کے موضوعات اور کردار کی نشو ونما تک تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ گویا ثالث کے اس شمارے میں شامل تمام مضامین غضنفر کے ہنر کی جامع تفہیم پیش کرتے ہیں۔ یہ مضامین غضنفر کے ان پہلوؤں کو بھی روشن کرتے ہیں جن پر شاید پہلے کسی کا دھیان نہیں گیا ہو۔

ادبی جریدہ ثالث میں فکشن نگار غضنفر کے لیے مختص خصوصی نمبر غضنفر کے افسانوی فن کی ایک جامع تحقیق پیش کرتا ہے۔ علی رفاد فتیحی، شافع قدوائی، اور قمر الہدی فریدی، سید محمد اشرف، مشتاق احمد نوری، صفدر امام قادری، ظفر کمالی، شارب ردولوی اور پیغام آفاقی جیسے اسکالرز کے علمی مقالات پر مشتمل یہ مجموعہ غضنفر کی ادبی خدمات کے بارے میں انمول بصیرت فراہم کرتا ہے۔ گویا اس شمارے میں ادبی افق پر درخشاں بے شمار ایسے ستارے شامل ہیں جن سب کا نام اس مختصر تبصرے میں لینا ممکن نہیں۔

مشتاق احمد نوری غضنفر کے عنوانات کو سجا کر اپنے تجزیہ کی تمہید یوں بنتے ہیں

> ''غضنفر اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے لوگ انہیں ''کہانی انکل'' کے نام سے بھی پکارنے لگے ہیں۔ غضنفر فکشن کے ''مسنگ مین'' نہیں ہیں کہ انہیں ''ڈگڈگی'' بجا کر اپنی ''پہچان'' کرانی پڑے۔ وہ جب اپنی ''دبیہ بانی'' شروع کرتے ہیں تو چاروں طرف ''فسوں'' طاری ہو جاتا ہے اور اس خاص لمحے میں وہ فکشن کے ''تختِ سلیمانی'' پر براجمان نظر آتے ہیں۔
>
> لوگ انہیں فکشن کے سمندر کا ہونہار ''مانجھی'' بھی کہتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے وہ ''پانی'' کی گہرائی میں اتر کر ''وش منتھن'' کرنے کے ہنر سے واقف ہیں تا کہ ہمارا سارا سماج زہر کی کاٹ سے محفوظ رہے۔''

پروفیسر فتحی کا مقالہ اس خصوصی ایڈیشن میں نمایاں ہے، جس میں غضنفر کی بیانیہ تکنیک کا باریک بینی سے تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ فتحی کا تفصیلی بیان غضنفر کی کہانی کہنے کی پیچیدگیوں کو بیان کرتا ہے اور مصنف کے منفرد اسلوب اور موضوعاتی مصروفیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ فتحی کی عینک کے ذریعے، قارئین غضنفر کی کاریگری کے ساتھ ساتھ ان کے کام کے اندر موجود بنیادی موضوعات اور نقشوں کے لیے گہری تعریف حاصل کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ شافع قدوائی اور قمر الہدیٰ فریدی کے علمی نقطہ نظر کی شمولیت نے غضنفر کے افسانوں سے متعلق گفتگو میں گہرائی اور تنوع کا اضافہ کیا ہے۔ قدوائی کی بصیرت ممکنہ طور پر تشریح کی اضافی تہہ فراہم کرتی ہے، جبکہ فریدی کی شراکتیں غضنفر کی ادبی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ایک وسیع تر سیاق وسباق کا فریم ورک پیش کرسکتی ہیں۔

ڈاکٹر افشاں بانو کا مضمون ''غضنفر کی خاکہ نگاری کے امتیازی پہلو'' نے مجھے خصوصی طور پر متاثر کیا۔ اس نوجوان نقاد کی بصیرت کا غماز ہے یہ مضمون۔

مجموعی طور پر، ثالث میں افسانہ نگار غضنفر پر خصوصی نمبر اسکالرز، طلباء اور شائقین کے لیے ایک انمول وسیلہ کا کام کرتا ہے۔ علمی نقطہ نظر کی ایک رینج کو اکٹھا کرتے ہوئے، یہ خصوصی نمبر غضنفر کے بیانیہ فن کی ایک جامع تحقیق پیش کرتا ہے، جس سے معاصر ادب میں ان کی شراکت کے بارے میں ہماری سمجھ میں اضافہ ہوتا ہے۔ چاہے کوئی ایک تجربہ کار اسکالر ہو یا ایک پرجوش قاری، یہ خصوصی ایڈیشن یقینی طور پر غضنفر کی ادبی میراث کی گہری تعریف کو متاثر کرے گا۔

مزید برآں، یہ خصوصی شمارہ غضنفر کی ادبی شراکتوں کی پائیدار مطابقت اور اہمیت کے ثبوت کے طور پر کام کرتا ہے۔ تنقیدی نقطہ نظر کی دولت کو اکٹھا کرکے، یہ عصری ادب میں ایک اہم شخصیت کے طور پر ان کی حیثیت کی تصدیق کرتا ہے، جس سے نسل در نسل قارئین ان کی تخلیقات سے متاثر اور مسحور ہوتے رہیں گے۔

غضنفر پر ثالث کا یہ خصوصی ایڈیشن ادب اور تخلیقی عمل میں دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔ چاہے آپ اسکالر ہوں، طالب علم ہوں، یا محض افسانے کے شوقین ہوں، یہ خصوصی نمبر بصیرت اور انکشافات کا ایک خزانہ پیش کرتا ہے جو غضنفر کی تخلیقات کے بارے میں آپ کی سمجھ کو مزید تقویت بخشتا ہے۔

◄◄ ● ►►

● ڈاکٹر اختر آزاد (جمشیدپور)

بقول اقبال حسن آزاد بغیر کسی منصوبے کے ایک پروگرام میں انہوں نے غضنفر سے کہا کہ 'ثالث' کا اگلا نمبر آپ پر ہی ہوگا۔' یہ ایک ادبی حادثہ ہے جس کا نتیجہ 'غضنفر نمبر' کی صورت میں سامنے ہے۔ اس طرح کے خوشگوار حادثے ہونے چاہئے۔ ایسے ادبی حادثے ذہن ودل کو سکون میسر کرتے ہیں۔

اقبال حسن آزاد نے گیارہ سالوں میں کئی اہم نمبر اردو ادب کو دیئے ہیں۔ وہ جو سوچتے ہیں انہیں جنون کی حد تک پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ برادرم غضنفر پر یہ نمبر اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں غضنفر کی ادبی زندگی کا بھرپور احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو چھونے کی کوشش کی گئی جن سے غضنفر کا گہرا تعلق ہے۔ غضنفر نے نثر اور نظم دونوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ جہاں ایک طرف نظمیں، غزلیں لکھیں وہیں نثر میں خاکے، ڈرامے، افسانے، ناول اور بے شمار علمی، ادبی اور تدریسی مضامین قلم بند کیئے۔ لیکن ان کی اصل پہچان فکشن ہے۔ پہلے افسانہ نگار پھر ناول نگار کی۔ لیکن مجموعی طور پر اب جب بات کی جاتی ہے تو بحیثیت ناول نگار وہ سب سے پہلے سامنے چلے آتے ہیں۔ اور مجھے لگتا ہے کہ وہ خود کو ایک ناول نگار کی حیثیت سے ادب میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے سب سے زیادہ نو ناول لکھے۔ پانی، کینچلی، کہانی انکل، دویہ بانی، فسوں، وِش منتھن، مم، شوراب اور مانجھی۔ ابھی کچھ اور ناول ان کے قلم سے نکلنے باقی ہیں۔ ''ہمہ رنگ غضنفر'' میں ڈاکٹر ریشا قمر نے ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بخوبی چھونے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر نورالھدی فریدی نے مرکز میں ان کی اہلیہ کو سامنے رکھ کر ان کی شخصیت کو خوبصورتی سے پینٹ کیا ہے۔ مشتاق احمد نوری نے تو انہیں الفاظ کا جادوگر قرار دیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں الفاظ پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ غضنفر کی ناول نگاری پر پیغام آفاقی، شہاب ظفر اعظمی، اقبال حسن آزاد، اسلم جمشید پوری کے مضامین اہم ہیں۔ باقی ساری چیزیں بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور غضنفر شناسی کے لئے ادبی خزانے سے کم نہیں۔ غضنفر کا قلم ابھی کئی دہائیوں تک اپنی خوش رنگ روشنائی سے لفظوں کی جادوگری کرتا رہے گا۔ غضنفر پر کام کرنے والے ریسرچ اسکالرز کے لئے اس شمارے میں بہت کچھ ہے۔ ایک اہم نمبر کی اشاعت پر ثالث کے مدیر اقبال بھائی کو بھی بہت بہت مبارک باد۔

◄◄ ● ►►

● ولی اللہ قادری (چھپرا)

رسالہ ''ثالث'' کا غضنفر نمبر ایک قابلِ قدر کارنامہ

غضنفر جیسی اردو زبان وادب کی فقید المثال شخصیت پر رسالہ ثالث مونگیر نے نمبر شائع کر کے ناقدری کے اس دور میں ایک مثالی اور قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے لیے ثالث کے مدیر اعزازی پروفیسر اقبال حسن آزاد، مدیر جناب ثالث آفاق صالح اور نائب مدیرہ محترمہ نشاط پروین لائق صد ستائش

اور قابل مبارک باد ہیں۔

رسالہ ’ثالث‘ کے غضنفر نمبر کا اشتہار سوشل میڈیا پر مہینوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ نمبر جب منظر عام پر آیا تو اس کے مطالعہ کا تجسس بڑھا۔ البتہ فیس بک پر قارئین اور ناقدین کے تبصرے اور تأثرات پڑھنے کے بعد اس رسالے کے مطالعے کی چاہت مزید بڑھ گئی۔ ایک روز استاذی محترم پروفیسر صفدر امام قادری کو فون کر کے گزارش کی کہ کم از کم پی ڈی ایف فائل بھجوادیں۔ ایک دو دن کے بعد مدیر محترم نے میرے واٹس ایپ نمبر پر پی ڈی ایف فائل بھیج دی۔ موبائل کی خرابی کے سبب بمشکل ایک دو مضمون پڑھ سکا۔ عجب اتفاق کے پی ڈی ایف فائل دستیاب ہونے کے دو روز کے بعد ہی پروفیسر صفدر امام قادری نے عزیزم محمد مرجان علی سلمہ کی معرفت شمارہ بھیج دیا۔ جس کے لیے راقم الحروف صمیم قلب سے پروفیسر اقبال حسن آزاد اور پروفیسر صفدر امام قادری صاحبان کا مشکور وممنون ہے۔

ثالث کا یہ ضخیم نمبر ایک طرح کی تازگی کا احساس دلاتا ہے۔ اس نمبر میں شامل ساٹھ فیصد سے زائد مضامین ومشمولات کسی نہ کسی توسط سے راقم پڑھ چکا تھا یا سیمینار میں سن چکا تھا یہ دیگر بات ہے کہ ارریہ میں منعقدہ سے می نار میں پیش کیے گئے مضامین اور مقالات کا خلاصہ ہی راقم الحروف سن سکا تھا۔ یہاں بالاستعاب مطالعے کا موقع ملا۔

اداریہ مختصر اور جامع ہے بعدہ غضنفر کی دعا سے نمبر کا آغاز ہوا ہے۔ اس کے بعد غضنفر کی مشہور نعت کا ایک مصرع:

بنے کس طرح خامے سے میرے خاکہ محمدؐ کا

زینت نمبر ہے۔ بقول غضنفر یہ نعت انہوں نے گنبد خضرا کے سائے میں لکھی تھی، جس سے اس نعت کی اہمیت وافادیت خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ نمبر کے مطالعہ کے دوران ایک بات کی کمی کا احساس ہوتا ہے کہ پورے شمارے میں غضنفر کی مذہبی شاعری کے حوالے سے ایک بھی مضمون شامل نہیں ہے۔ اسی طرح غضنفر کی تنقید نگاری پر بھی کوئی مقالہ نہیں ہے۔ دونوں موضوعات پر اگر ایک مضمون کی شمولیت ہو جاتی تو بہت بہتر ہوتا۔ مضامین کے باب میں پہلا مضمون ڈاکٹر ریشا قمر کا ہے جس کا عنوان ”ہمہ رنگ غضنفر“ ہے۔ یہ مضمون غضنفر کی شخصیت اور اجمالی خدمات کا بھرپور ترجمان ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے اس بات کی آگاہی ہو جاتی ہے کہ غضنفر پر ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں پندرہ تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں، جن پر مقالہ نگاروں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ پاکستان کی ایک یونیورسٹی میں بھی غضنفر کی ناول نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی کی فہرست میں غضنفر کی سلسلے میں جے پی

یونیورسٹی چھپرا میں ایک بھی مقالہ نہ لکھا جانا قابل تشویش بات ضرور ہے۔اس بات کا ایک طرح سے ازالہ یہاں سے تربیت یافتہ شاگرد عزیزم محمد مرجان علی ریسرچ اسکالر نے کر دیا ہے۔محمد مرجان علی ریسرچ اسکالر جے پی یونی ورسیٹی چھپرا نے نمائندگی کی ہے۔ان کے مضمون پر تبصرہ اگلے صفحات پر ہوگا۔مضمون کے باب میں پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی کا مضمون ''نوک قلم سے حد نگاہ تک'' بہت اہم ہے۔اس مضمون میں فریدی صاحب کے ظرافتی رنگ واسلوب نے مجھے حیرت میں مبتلا کر دیا کیوں کہ راقم الحروف پروفیسر فریدی کو ایک محقق اور ناقد ہی جانتا تھا ان کے حس مزاح سے بالکل ناواقف تھا۔یہاں فریدی صاحب کی طرز تحریر سے بہت محظوظ ہوا پیش نظر مضمون کا یا اقتباس ملاحظہ کریں:

''بیگم سے ڈرنا کوئی ایسی بات نہیں جس کا خاص طور سے ذکر کیا جائے،تھوڑا بہت سبھی ڈرتے ہیں لیکن غضنفر کا حال یہ ہے کہ بیگم نے کہا۔چلیے اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔محترمہ نے اشارہ کیا ابھی نہیں ذرا دیر بعد اور غضنفر صاحب اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئے۔یہ پر لطف تماشا ہم نے کئی بار دیکھا اور سمجھا کہ وہ پوری طرح بیگم کی مٹھی میں ہیں لیکن افسوس کہ یہ ہمارا یہ تاثر بالکل غلط ثابت ہوا۔انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تو یہ کھلا کہ بھابھی ہدایت نہیں دیتیں،یاد دلاتی ہیں:کب دوا کھانی ہے،کب چیک اپ کرانا ہے،کب سونا ہے اور کب جاگنا ہے۔چوں کہ کہ یہ سب غضنفر ہی کے ایما پر ہوتا ہے اس لیے وہ ذہن پر زور دیے بغیر قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ایک مثالی محبت کرنے والے جوڑے سے ان کی شادی کی پچیسویں سالگرہ پر کسی نے پوچھا۔آپ کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز کیا ہے؟ شوہر نے جواب دیا۔ہم دونوں نے آپس میں اپنے اپنے کام بانٹ رکھے ہیں۔''(صفحہ ۲۸)

مضمون نگار پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی کا افسانوی اسلوب بھی ہمیں خاص متوجہ کرتا ہے۔یاد آتا ہے کہ تیرہ سال قبل علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی کتاب ''بزبان حکایت'' مرتبہ ڈاکٹر غلام زرقانی کے پیش لفظ میں بھی فریدی صاحب کا افسانوی اسلوب دیکھا تھا لیکن اس مضمون میں یہ اسلوب ذرا گہرا نظر آتا ہے۔مشتاق احمد نوری کا مضمون ''الفاظ کا جادوگر:غضنفر'' بھی قابل مطالعہ ہے۔طیب فرقانی کا انٹرویو''بات چیت'' کے عنوان سے ہے۔یہ انٹرویو خالص غضنفر کے فکشن کے متعلق ہے۔طیب فرقانی نے بہت ہی نپا تلا سوال کیا ہے،جس کا جواب غضنفر صاحب نے نہایت جامعیت کے ساتھ مرحمت فرمایا ہے۔

ثالث کے غضنفر نمبر کے مطالعے سے ایک خوشگوار مسرت ہو رہی ہے کہ اس نمبر میں اکابرین کے ساتھ ساتھ معاصرین خواتین قلم کاروں کا توازن برقرار رکھا گیا ہے۔نئی نسل کے ابھرتے ہوئے قلم کاروں کے مضامین پڑھنے کے بعد مزید خوشی ہو رہی ہے۔مدیر محترم نے یہاں ایسا گلدستہ تیار کیا ہے جسے دیکھنے کے

بعد ہر قاری مدیر کے حسن انتخاب کا داد دیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ وفات یافتہ شخصیات میں سے شارب ردولوی کا مضمون ''ایک قصہ زندگی کا'' اور مجتبیٰ حسین کا ''غضنفر کی تحریروں کا انوکھا پن'' مجھے بہت پسند آیا۔ اسی طرح پیغام آفاقی کا ''اردو ناول کی تجدید اور غضنفر'' بھی خصوصی مطالعے کی دعوت دے رہا ہے۔ یہاں ماخذ کی نشاندہی کی ضرورت تھی۔ غضنفر کے بیانیہ کے حوالے سے پروفیسر علی رفاد فتیحی کا مضمون ''غضنفر کا بیانیہ'' بہت اہم مضمون ہے یہاں فتیحی صاحب نے متعدد دلائل سے اپنی رائے کو مدلل کیا ہے۔ موصوف رقم طراز ہیں:

''غضنفر اردو فکشن کا ایک معروف اور معتبر نام ہے وہ ان چند فکشن نگاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اردو فکشن کے ساختی نظام کے ساتھ مسلسل تجربہ کرنے کی روایت کی وجہ سے شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے ناول موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ ساخت کے نئے تجربات کی وجہ سے بھی منفرد نظر آتے ہیں۔ ان ناولوں میں ہندوستانی پس منظر میں موضوعات کو ایک بیانیہ میں بننے کی ان کی کاریگری واضح طور پر نظر آتی ہے۔'' (صفحہ 113)

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ثالث کے غضنفر نمبر میں سب سے زیادہ مضامین فکشن کے حوالے سے ہیں۔ پروفیسر فتیحی کی علاوہ غضنفر کی ناول نگاری (پروفیسر شہاب ظفر اعظمی)، غضنفر: ایک مختلف رنگ و آہنگ کا ناول نگار (اقبال حسن آزاد)، ہم عصر مسلم خواتین کی کردار نگاری اور ''شوراب'' (تسلیم عارف) غضنفر کی کہانیاں اور عصر رواں کی شناخت (پروفیسر مہدی جعفر)، غضنفر کا فکشن: ایک مختصر جائزہ (پروفیسر اسلم جمشید پوری) غضنفر کے چند افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ (سمیرہ رفیق) اور خواب اور حقیقت کے تصادم کا استعارہ: کہانی انکل (ڈاکٹر فرقان سنبھلی) جیسے مضامین اس شمار کی وقعت کو دو بالا کر رہے ہیں۔ پیغام آفاقی کے مضمون کا بھی تعلق فکشن ہی سے ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غضنفر کی فکشن نگاری کے حوالے سے ایک بھرپور مواد اس نمبر میں پیش کیا گیا ہے۔ مختصر مضمون میں بھی شارب ردولوی نے غضنفر کی مثنوی نگاری کی خصوصیات کو نہایت احسن طریقے سے واضح کیا ہے۔ غضنفر کی مثنوی کی تعداد کو دیکھنے کے بعد ایک دو اور مضمون کی شمولیت کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

غضنفر کے شاعری کے حوالے سے تین مضامین یہاں موجود ہیں۔ ڈاکٹر واحد نظیر نے غضنفر کا شعری مجموعہ '' آنکھ میں لکنت'' کے حوالے سے بھرپور تجزیاتی باتیں سامنے لائی ہیں۔ یہ مضمون غضنفر کی متذکرہ کتاب کو سمجھنے میں نہایت ممد و معاون ہے۔ پروفیسر منظر حسین نے غضنفر کی غزل گوئی کی خصوصیات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ بچوں کے متعلق غضنفر کی شاعری کا لیکھا جوکھا محمد مرجان علی نے پیش کیا ہے۔ ادب اطفال پر مشتمل غضنفر کی کتاب ''سخن غنچہ'' میں شامل نظموں کا تجزیہ و تنقیدی جائزہ محمد مرجان علی نے نہایت

خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بچوں کے متعلق غضنفر کی شاعری کے اختصاصات کو واضح کرتے ہوئے محمد مرجان علی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''غضنفر کی شاعری میں بچوں کے لیے جو فضا تیار کی گئی ہے وہ خالص تبلیغی یا اصلاحی نہیں ہے بلکہ ان کی نظموں کا بہ غور مطالعہ کریں تو یہ احساس ہوگا کہ ہنسی مزاق اور تفریحی مواد کے پس پردہ بچوں کی تربیت اور انہیں امن و آشتی کا ایک بڑا پیغام پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بچوں کی حوصلہ افزائی اگر خالص اصلاحی اور نرے موٹی ویشنل انداز میں کی جائے تو بچہ بوریت کا شکار ہو جائے گا اس لیے غضنفر کے ہاں تفریحی اور ظرافتی پیرائے میں نظموں کو ڈھال کر بچوں کے اندر کھیل کھیل میں اصلاحی باتیں سمو دینے کا ایک طور نظر آتا ہے۔'' (صفحہ 216)

غضنفر ایک ماہر تعلیم اور درس و تدریس کی دنیا کی ایک مثالی شخصیت ہیں اس کے ثبوت کے لیے درس و تدریس کے موضوع پر ان کی متعدد کتابیں شاہد عدل ہیں ان کتابوں میں ''لسانی کھیل'' کھیل بھی ہے۔ یہ کتاب ابتدائی درجات کے نونہالوں کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کتاب کا تجزیہ مولانا ابو رافع نے پیش کیا ہے اس مضمون کے مطالعہ سے خوشی ہوئی اور دل سے ان کے مستقبل کے لئے دعا نکلی۔ غضنفر کی تدریسی و تعلیمی شخصیت کے بارے میں یہ مضمون ہر چند نمائندگی کرتا ہے البتہ ایک دو مزید مضمون ہو جاتا تو سونے پر سہاگہ ہوتا۔

اس نمبر میں غضنفر کی خاکہ نگاری پر دو مضامین شامل ہیں ان میں پہلا پروفیسر صفدر امام قادری کا ہے انھوں نے اپنے مضمون میں واضح کیا ہے کہ نصف صدی کی ریاضت کے بعد غضنفر کی شخصیت اول تا آخر قصہ گو اور انشا پرداز کی ہے۔ یہاں مضمون نگار نے غضنفر کی جملہ تصنیفات کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے اپنے نظریات کو مدلل فرمایا ہے۔ یہ دیگر بات ہے کہ صفدر امام قادری نے غضنفر کے خاکوانی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

غضنفر کی ادبی روح حقیتاً قصہ گوئی کے آس پاس بستی ہے- آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ نو ناول، دو افسانوی مجموعے، ایک ڈراما اور ایک سوانحی ناول ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا نتیجہ ہیں۔ یہ ان کے مکمل ادبی سرمایے کا نصف سے زیادہ حصہ ہے۔ غضنفر نے اچھی خاصی شاعری کی ہے اور غزلوں کے ساتھ نظموں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ غور کرنے سے آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ ان کی شاعری میں بھی قصہ گوئی کی صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اکثر نظمیں قصوں کے ارد گرد نظر آتی ہیں۔ آج کے زمانے میں جب طویل مثنوی نگاری یعنی منظوم قصہ نویسی کا کوئی کا چلن نہیں ہے، غضنفر نے ''مثنوی کرب جاں''، ''مثنوی قمر نامہ'' اور ''مثنوی حرز جاں'' ناموں سے مستقل تصنیفات پیش کیں۔ ایک طرف ان کی شاعری کے یہ قابل

ذکرنمونے ہیں تو دوسری طرف ان کی حقیقی بنیاد قصہ گوئی کے حوالے سے متعین ہوتی ہے۔''(صفحہ 177)
ڈاکٹر افشاں بانو نے غضنفر کی خاکہ نگاری کے امتیازی پہلو کو مختصر سہی لیکن جامعیت کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ یہ مضمون غضنفر کے خاکوں کے ساتھ بھرپور انصاف کر رہا ہے۔ غضنفر کی خودنوشت ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' پر دو دو معتبر صاحب قلم کے مضامین ہیں۔ پہلا سید محمد اشرف کا ''غضنفر کی خودنوشت...... چند تاثرات'' میں مضمون نگار نے غضنفر کی خودنوشت پر واضح رائے پیش فرمایا ہے۔ کتاب کے پس ورق پر مختصر شایع ہوا ہے، یہاں تھوڑی تفصیلات سے سید محمد اشرف کی رائے باصرہ نواز ہوئی۔ پروفیسر ظفر کمالی کے مضمون کا عنوان ''دیکھ لی دنیا ہم نے......ایک قاری کے تاثرات'' ہے یہاں مضمون نگار نے انکساری کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بہت خوب ہے۔ البتہ مضمون کے مطالعہ کے بعد عنوان تبدیل ہو جاتا ہے اور قاری کی جگہ ناقد کا لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس مضمون میں غضنفر کی اس کتاب کا جائزہ نہایت باریک بینی سے کیا گیا ہے اور ہو بھی کیوں نہیں کہ غضنفر کی اس کتاب کو مضمون نگار نے تین مرتبہ پڑھنے کا دعویٰ کیا جو بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ غضنفر نے ایک طرف جہاں متذکرہ خودنوشت کی خصوصیات کو ظاہر کیا وہیں ایک دو مقام پر صاحب خودنوشت غضنفر کی بعض باتوں سے اختلاف کرتے ہوئے واضح طور پر تنقید بھی کی ہے یہاں قدر شناسی کا عنصر غالب ہے۔
چارسو چوبیس صفحات پر مشتمل اس شمارے میں میں غضنفر کے متعلق تین سو پینسٹھ صفحات مختص ہیں۔ ان میں سے نصف صفحات سے کم حصے میں غضنفر کی تخلیقات کا ایک بہترین انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اگر ایک طرف ''میرا تخلیقی عمل''، ''انشائیے کا انشائیہ'' اور ''آئینہ اردو'' میں دوسری زبانوں کا عکس، ہمیں خاص متوجہ کرتا ہے اسی طرح داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، خاکا، شہرنامہ، غزلیں اور نظمیں یہ سب چیزیں غضنفر کی نثری اور شعری صلاحیتوں کی مشاقی کے گواہ ہیں۔ افسانہ کے تحت غضنفر کا مشہور افسانہ ''کڑوا تیل'' اور ''سرسوتی اسنان'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یقیناً یہ دونوں افسانے غضنفر کے افسانوں میں شہ کار کا درجہ رکھتے ہیں۔ مذکورہ افسانوں کے مطالعہ کے بعد کڑوا تیل پر پروفیسر شافع قدوائی کا تجزیہ اور سرسوتی اسنان پر محترمہ ڈاکٹر ریشا قمر کا تجزیہ بہت اہمیت کا حامل ہے اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی پر لکھا گیا خاکا بھی بہت اہم ہے مجموعی طور پر غضنفر کی شخصیت اور فن پر رسالہ ثالث نے عمدہ کاوش پیش کی ہے امید قوی ہے کہ غضنفر شناسی میں یہ نمبر بنیادی ماخذ کا درجہ رکھے گا ان شاءاللہ!

◆ ● ◆

● ڈاکٹر سیفی سرونجی (سرونج)

مشہور ادیب اقبال حسن آزاد کی ادارت میں ''ثالث'' جیسا ضخیم اور معیاری رسالہ پچھلے گیارہ

سال سے نکل رہا ہے اور ہر شمارہ ضخیم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ تازہ شمارہ چار سو پچیس صفحات پر مشتمل پروفیسر غضنفر نمبر ہے جس میں اردو کے تمام معتبر ناقدین، ادیبوں نے غضنفر کی ناول نگاری، شاعری اور افسانہ نگاری سے متعلق مضامین لکھے ہیں۔ حالانکہ غضنفر پر اور بھی کئی رسائل نے نمبر شائع کئے ہیں۔ ان کے فن پر مشتمل بھی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن ثالث کے اس نمبر میں تو ان کے فن اور شخصیت کے ہر پہلو پر مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین پڑھ کر غضنفر کے مقام و مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ غضنفر واقعی کمال کی شخصیت اور ایک ایسے قلم کار ہیں کہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس میں انفرادیت کے ساتھ فنی کمال اور گہری معنویت ہوتی ہے۔ ناول لکھے تو ان میں وہ منفرد نظر آئے اور شاعری کی تو سحر البیان اور زہر عشق جیسی مثنویوں کو بھلا دیا۔ اس نمبر میں ان کی شاعری سے لے کر ناول نگاری اور دیگر تخلیقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مشتاق احمد نوری نے انہیں الفاظ کا جادوگر کہا ہے۔ اقبال حسن آزاد نے مختلف رنگ و آہنگ کا ناول نگار مجتبیٰ حسین نے ان کی تحریروں میں انوکھا پن کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔ سید محمد اشرف نے غضنفر کی خودنوشت پر گفتگو کی ہے۔ پروفیسر صفدر امام قادری نے ان کی انشائیہ نگاری اور خاکہ نگاری پر اظہار خیال کیا ہے۔ غرض یہ کہ ہر پہلو سے غضنفر کی تخلیقی صلاحیتوں کو پرکھا ہے۔ مشتاق احمد نوری نے صحیح لکھا ہے:

غضنفر اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ لوگ انہیں ''کہانی انکل'' کے نام سے بھی پکارنے لگے ہیں۔ غضنفر فکشن کے مسنگ مین نہیں ہیں کہ انہیں ڈگڈگی بجا کر اپنی پہچان کرانی پڑے۔ وہ جب اپنی دو یہ بانی شروع کرتے ہیں تو چاروں طرف فسوں طاری ہو جاتا ہے اور اس خاص لمحے میں وہ فکشن کے تخت سلیمانی پر براجمان نظر آتے ہیں۔ لوگ انہیں فکشن کے سمندر کا ہونہار مانجھی بھی کہتے ہیں کیوں کہ انہیں معلوم ہے وہ پانی کی گہرائی میں اتر کر وش منتھن کرنے کے ہنر سے واقف ہیں تاکہ ہمار سماج زہر کی کاٹ سے محفوظ رہے۔''

بلاشبہ غضنفر ایک ایسے کہانی کار، ناول نگار ہیں کہ اگر کوئی منظر یا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں تو قاری کو بھی اس کے دیدار کرا دیتے ہیں۔ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ انھوں نے اپنے ایک ناول میں الہ آباد کی ندی گنگا جمنا کے سنگم کے بارے میں اتنے دلچسپ انداز سے بیان کیا ہے کہ میں صرف غضنفر کا ناول پڑھ کر سنگم دیکھنے الہ آباد گیا۔ یوں تو میں نے ان کے کئی ناول اور کہانیاں پڑھی ہیں مثلاً کینچلی، کہانی انکل، شعلہ وغیرہ۔ چالیس سال سے انھیں پڑھتا رہا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اتفاق سے غضنفر اور میں نے ایک ساتھ چھپنا شروع کیا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں پہلی بار ''براقدم'' میں ان کی کہانی اور میری نظم ایک ساتھ چھپی تھی۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا بھی ہے، پڑھا بھی ہے۔ ''ثالث'' کا یہ نمبر دیکھ کر ساری یادیں تازہ ہو

گئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ غضنفر کو پڑھنے والا حلقہ بہت وسیع ہے اس لیے کہ ان کی تحریروں میں بلا کی دلکشی ہے۔

● ڈاکٹر غلام نبی کمار (جموں کشمیر)

''ثالث'' میں وہ سبھی خوبیاں موجود ہیں جو ایک بڑے اور معتبر رسالے میں ہونی چاہیئے۔ یہ رسالہ اپنے سفر کی جانب رواں دواں ہے۔ تیز و تند ہوائیں اس پر کوئی اثر نہیں کرتیں کیونکہ اقبال حسن آزاد صاحب اس کے ہر شمارے میں اپنا خلوص اور اپنی محبت بھر دیتے ہیں۔

لوگ دو دو تین تین لاکھ تنخواہ پانے کے باوجود ایک شمارہ خریدنے سے قاصر ہیں اور دوسری طرف اقبال حسن آزاد صاحب ہیں جو کوئی تقاضا کیے بغیر سیکڑوں لوگوں کو مفت اور بے غرض شمارہ ارسال کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اور کیا کہیئے جو دل و جان سے ہماری زبان اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

''ثالث'' کے گذشتہ شماروں پر نظر ڈالیے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے ہر شمارے کا کوئی خاص موضوع ضرور رہا ہے اور ہر شمارہ اپنی ضخامت کی دلیل پیش کر رہا ہے۔ آج کے زمانے میں ضخامت سے بھی فرق پڑتا ہے، یعنی جتنی ضخامت ہوگی اتنے ہی روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں بلکہ قارئین کو بھیجنے کی جھنجھٹ مزید۔

بہرکیف ''ثالث'' شمارہ نمبر۳۰۔۲۹۔۲۸، جلد نمبر۱۱، اور اشاعت کے گیارویں سال کے اس خاص شمارے کا موضوع ''غضنفر'' ہے۔ ''غضنفر نمبر'' کے اس شمارے کے کل ۴۲۴صفحات ہیں۔ ''غضنفر'' نام کی شخصیت نے اردو زبان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں کہ بجا طور پر ان کی خدمات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

جب سے میرے اندر ادبی شعور نے ہوش سنبھالا تب سے ''غضنفر'' جو دراصل پروفیسر غضنفر ہیں، جو اردو زبان و ادب کی بے انتہا خدمت کر رہے ہیں، خاکسار کے ذہن پر سوار ہے۔

''ثالث'' کے اداریے میں ایڈیٹر اقبال حسن آزاد نے غضنفر سے شناسائی اور رسم و راہ کا تذکرہ خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ میری غضنفر صاحب سے پہلی ملاقات غالباً دو ہزار سولہ میں ہوئی جب وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اپنی تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ میرے ساتھ سلمان عبدالصمد تھے۔ اس موقع پر انھوں نے مجھے اپنی مثنوی کی کتاب ''کرب جاں'' عنایت فرمائی۔ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ''غضنفر'' صاحب استاد اور ادیب دونوں حیثیتوں سے مالا مال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم اور عزت و شہرت سے بہت نوازا ہے۔

اقبال حسن آزاد نے ان پر شمارہ شائع کر کے ایک بڑا فریضہ انجام دیا ہے۔
''غضنفر'' پر بہت مضامین لکھے گئے ہوں گے اس شمارے میں ان پر تقریباً چھبیس مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کچھ افسانوں کے تجزیے اور تخلیقات بھی شائع کی گئی ہیں۔
''غضنفر'' نمبر میں غضنفر کی ادبی شخصیت کے بیشتر پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ جس میں ان کی افسانوی و شعری جہات اور شخصی و تدریسی جہات وغیرہ پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔
شمارے کا آغاز غضنفر کی دعا اور نعت پاک سے کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ریشا قمر نے ''ہمہ رنگ غضنفر'' میں غضنفر کی شخصیت، زندگی، ادبی کارناموں اور کتابوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے اپنے مضمون ''نوک قلم سے حد نگاہ تک'' غضنفر کے تعلق سے اپنے تجربات و مشاہدات اور خیالات کو ڈھال بنایا ہے، بلکہ ان ان باتوں کی نشان دہی کی ہے جو ان کی کسی کتاب میں نہیں مل سکتیں۔ مشتاق احمد نوری کا مضمون غضنفر کی شخصیت، ہلکی سی ادبی جھلک اور یاداشتوں کا مجموعہ ہے۔ طیب فرقانی کا انٹرویو غضنفر سے متعلق ان باتوں کا پتہ دیتا ہے جو صرف مصنف کی زبانی ہی پتہ چل سکتی ہیں۔ اس انٹرویو سے مصنف کے ذاتی خیالات سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔ انٹرویو میں کیے گئے سوالات قابل ستائش ہیں۔ ''میرا تخلیقی عمل'' میں غضنفر نے اپنی ادبی تخلیقات اور جہات کے متعلق محسوسات سے روشناس کرایا ہے۔ ''ایک قصہ زندگی کا'' کرب جاں کے حوالے سے شارب ردولوی کا مختصر مگر جامع مضمون ہے۔ پیغام آفاقی نے ''اردو ناول کی تجدید اور غضنفر'' میں غضنفر کے ناولوں کا تذکرہ، موضوعی تنوع اور عصری مماثلت پر اپنی ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔
پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے ''غضنفر کی ناول نگاری'' میں غضنفر کے ناول 'پانی'، 'کینچلی'، 'کہانی انکل'، 'مم'، 'دویہ بانی'، 'فسوں'، 'وش منتھن'، 'شوراب' کا موضوعی، فنی و فکری اور اسلوبیاتی جائزہ لیا ہے۔ اقبال حسن آزاد نے ''غضنفر ایک مختلف رنگ و آہنگ کا ناول نگار'' میں ان کے ناولوں میں معنی و مفاہیم کی مختلف تہوں کو کھنگالا ہے۔ تسلیم عارف نے ''شوراب'' کا جائزہ ہم عصر مسلم خواتین کی کردار نگاری کے تعلق سے لیا ہے۔ مہدی جعفر نے غضنفر کی کہانیوں میں عصری جھلک دیکھنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے ''خالد کا ختنہ''، ''مسنگ مین''، ''تیشہ''، ''منگول بچہ''، ''پنڈلم''، ''رمی کا نوکر'' وغیرہ کہانیوں کو موضوع بنایا ہے۔
اس کے علاوہ پروفیسر علی رفاد فتیحی ''غضنفر کا بیانیہ''، ''غضنفر کا فکشن: ایک جائزہ'' از پروفیسر اسلم جمشید پوری، ''غضنفر کی تحریروں کا انوکھا پن''، ''ڈراما نگاری اور غضنفر'' از محمد ذاکر حسین ''غضنفر کی خودنوشت: چند تاثرات'' از سید محمد اشرف ''غضنفر ایک انشاپرداز قصہ گو'' از پروفیسر صفدر امام قادری وغیرہ مضامین اس شمارے کی وقعت اور اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

اس شمارے میں مختلف مشاہیر کے مضامین اور تجزیے شامل ہیں۔ جو دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔

اس شمارے کے لیے میں اقبال حسن آزاد اور ''غضنفر'' کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ''ثالث'' کو زندگی اور ترقی عطا کرے آمین۔۔

◄● ►

● عظیم اللہ ہاشمی (بنگال)

ثالث کا تازہ شمارہ ''غضنفر نمبر'' اکتوبر ۲۰۲۳ء تا جون ۲۰۲۴ء ڈاک سے موصول ہوا۔ مشمولات پر نظر پڑی۔ اداریہ میں مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد صاحب نے وہ روداد سنائی ہے جو اس شمارے کو منظر عام پر آنے کا سبب بنی۔ اس میں دورائے نہیں کہ غضنفر اردو فکشن کا وہ نام ہے جس کے ذکر کے بغیر بیسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کے نصف اوّل کی ادبی تاریخ نامکمل ہوگی۔ شمارے کی ابتداء صاحبِ نمبر کی دعا اور منقبت سے ہوتی ہے۔ اس ضخیم رسالے میں کل ۲۶ مضامین شاملِ اشاعت ہیں جن کے متن سے پروفیسر غضنفر صاحب کی ادبی زندگی اور ان کی تخلیقات کے مختلف گوشے کی پرتیں کھلتی ہیں۔ ان مضامین کے بیشتر قلم کار معاصر ادب کے درخشندہ ستارے ہیں جن کی دودھیا روشنی سے رواں عہد کا ادبی منظر نامہ روشن ہے۔ ظاہری بات ہے ایسے قلم کاروں کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک جملے اور حرف غضنفر صاحب کی فنکاری کا اعتراف نامہ ہے۔ بقول ریشا قمر:

''انہوں نے صفحہ قرطاس پر جو قلمی کہکشاں سجائی ہے اس میں افسانے کی جھلملاہٹ، ناول کی جگمگاہٹ، غزل کی نرماہٹ، نظم کی کھنکناہٹ، مثنوی کی مسکراہٹ، خاکے کی سرسراہٹ، انشائیے کی چلبلاہٹ، ڈرامے کی گڑگڑاہٹ، خودنوشت کی گرماہٹ، تنقید کی کھڑکھڑاہٹ سبھی کچھ ہے مگر ان کی اصل پہچان جس صنف ادب سے بنی وہ ناول ہے۔'' ص:۲۲

بیشک غضنفر اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کی تخلیقات میں زبان و بیان کا ایک رس ہے جس کو ہندی اور اردو کا رس کہتے ہیں۔ یہ رس اپنی انفرادیت کو بحال رکھتے ہوئے اردو ادب میں امرت تب بن جاتا ہے جب یہ فن پارے کے قلب میں ڈھلتا ہے اور امرت، دیوتا سے راکھشش تک کون نہیں پینا چاہتا ہے؟ لہذا اس امرت کا ذائقہ آپ کو افسانہ ''سرسوتی اسنان'' میں بخوبی ملے گا جو زیر نظر شمارے کے 272 نمبر صفحہ پر اپنی تابنا کی کا نقش چھوڑ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نام کو سنتے ہی بیشتر اردو قارئین کے ذہن کے گلیارے میں اردو الفاظ کی شہد کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگتی ہے۔ غضنفر صاحب کی ادبی خدمات سے متعلق ۲۶ قلم کاروں کے قیمتی اور پرمغز مضامین قابل تعریف و تحسین ہیں لیکن طیب فرقانی

کی ’’بات چیت‘‘ سے وہ نکتہ نظر سامنے آتا ہے جو غضنفر علی کو غضنفر بنانے میں معاون ہے۔

’’میری کوشش ہوتی ہے کہ تحریر تخلیقی نگارش ہو جائے۔ جملے چست درست ہو جائیں۔عبارت اس طرح گٹھ جائے کہ ڈھونڈنے پر بھی کہیں جھول دکھائی نہ پڑے۔وہ اس طرح بن سنور جائے کہ نگاہ پڑے تو پڑی رہ جائے اور وہاں سے اٹھے تو ایسی بصیرت لے کر اٹھے کہ حواس منور ہو جائیں۔لفظ کھلے تو معانی کا دریا امنڈ آئے۔گوہر والی سیپیاں تہ سے اٹھ کر سطح آب پر آجائیں۔حروف محاکات بنادیں اور اصوات سر تال سجادیں۔‘‘

ظاہر ہے تخلیقی عمل کے دوران جس قلم کار کا نکتہ نظر یہ ہو، اگر اس کو پارکھ نگاہ مشتاق احمد نوری صاحب نے ’’الفاظ کا جادوگر‘‘ کہا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔تخلیقی میدان میں غضنفر صاحب کو اس پر ایمان کی حد تک یقین ہے کہ لسانی جادوگری فنِ لطیف کے حسن کا لازمی عنصر ہے۔اس کی پیروی موصوف اپنی تخلیقات میں کرتے ہیں جس کے سبب ان کی ہر تحریر سے جادو جھلکتا ہے۔موصوف کہانی کی دلچسپی بنائے رکھنے کے لیے توقع کے برخلاف انجام لانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ اس کے اثرات دماغ پر تا دیر رہیں۔ گفتگو کے دوران ایک جگہ شکوہ کرتے ہیں کہ پارکھوں کی نظر کی ساری توانائی تھیم اور پلاٹ کی گتھی سلجھانے میں صرف ہو جاتی ہے۔ان کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی ہے کہ کن لفظوں نے کیسی تصویر بنائی اور ان سے کیسی موسیقی پھوٹی ہے۔کس جملے میں سمندر کو کوزے میں بند کیا گیا ہے اور کہاں کوزہ سمندر بن گیا ہے۔تخلیقی عمل کو پر اسرار اور پے چیدہ عمل متصور کرنے والے غضنفر اپنے مضمون ’’میرا تخلیقی عمل‘‘ میں رقمطراز ہیں۔

’’وہ جاں گسل اور جاں فزا عمل جو کسی احساس، کسی خیال، کسی فکر، کسی تجربہ وغیرہ کو مہم جویانہ اور مجاہدانہ مراقبائی عمل سے گزار کر تخلیقی صورت عطا کر دے، تخلیقی عمل کہا جاتا ہے۔‘‘ص:۴۶

ثالث کے اس تاریخی شمارے میں موصوف کی غزلیں، نظمیں، شہر نامے، خاکے، ڈرامے اور داستان کے نمونے بھی شامل اشاعت ہیں جس سے ان کے دوسرے اصناف سخن پر دسترس کا اشارہ ملتا ہے۔اس کے علاوہ کتاب ’اردولسانیات‘ اور رسالہ ثالث پر تبصرے بھی خوب ذائقے دار ہیں۔مرزا اسداللہ خاں غالب کی نظر میں مکتوبات سے آدھی ملاقات ہوتی ہے۔اس ڈیجیٹل دور میں اس رسالے نے اس باقیات کی روایت کو زیر نظر شمارے میں تحفظ دی ہے جس میں کئی بڑے نام کے ستارے چمک رہے ہیں۔

سرورق دیدہ زیب اور ضخامت 424 صفحے پر مشتمل ہے۔رسالے کی پشت پر اس شمارے میں شامل اہلِ قلم کی تصاویر جاذب نظر ہیں۔ یہ شمارہ اسکالروں کے لیے بہت اہمت رکھتا ہے۔کالج و یونیورسٹی نیز پبلک لائبریری میں ثالث کے دوسرے شمارے کی طرح اس کو بھی محفوظ رکھنا چاہئے تا کہ آنے والی نسلیں غضنفر صاحب کو بھول نہ جائیں۔شمارے کی قیمت پانچ سو روپئے ہے جو مسمولات کے پیش نظر کچھ زیادہ نہیں

ہے۔المختصر رسالے کے ورق ورق سے موگرے کی خوشبو آتی ہے۔

◄ ● ►

● ڈاکٹر منصور خوشتر (مدیر دربھنگہ ٹائمز، دربھنگہ)

سہ ماہی رسالہ ''ثالث'' غضنفر نمبر: ایک تاثر

چند روز قبل پوسٹ مین نے ایک پیکٹ تھمایا۔ میں نے تجسس کے ساتھ اسے کھولا۔ دیکھا کہ سہ ماہی رسالہ ''ثالث کا'' غضنفر نمبر ہے۔ چند اوراق الٹ پلٹ کئے۔ سب سے پہلی خوشی تو یہ ہوئی کہ یہ شمارہ اردو کے مایہ ناز فکشن نگار غضنفر نمبر ہے۔ غضنفر صاحب پر کئی مضامین سے مزین یہ رسالہ کافی ضخیم اور معلوماتی ہے۔

اپنے اداریہ میں اقبال حسن آزاد لکھتے ہیں کہ کئی سال گزر گئے۔ میں غضنفر کے افسانے مختلف رسائل میں پڑھتا رہا اور ان کی جادوئی تحریر کا دل ہی دل میں قائل ہوتا رہا۔ لیکن نہ کبھی ان سے خط وکتابت ہوئی اور نہ ہی ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی۔ ۲۰۰۴ میں، میں اپنی بیٹی کے داخلے کے سلسلے میں علی گڑھ گیا تھا۔ طارق چھتاری سے ایک قلبی تعلق بنا ہوا تھا لہٰذا ان سے ملاقات کی غرض سے ان کے ڈیپارٹمنٹ پہنچا۔ طارق چھتاری نہایت خوش اخلاق انسان ہیں۔ جب تیسری مرتبہ طارق چھتاری کے دولت کدے پر گیا تو وہیں غضنفر سے ملاقات ہوئی۔ میں ان کی پرکشش شخصیت اور دل کش آواز سے مسحور ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے اپنی کئی کتابیں مجھے عنایت فرمائیں۔ واپسی کے سفر میں ریل گاڑی میں میں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا اور تب مجھ پر کچھ اور اسرار کھلے اور ایک نئے غضنفر کا انکشاف ہوا۔

غضنفر پر مضامین تحریر کرنے والوں میں ڈاکٹر ریشا قمر، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، مشتاق احمد نوری، طیب فرقانی، غضنفر، شارب رودلوی، پیغام آفاقی، پروفیسر شہاب ظفر اعظمی، اقبال حسن آزاد، تسلیم عارف، پروفیسر مہدی جعفر، علی رفاد فتیحی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، مجتبیٰ حسین، سمیرہ رفیق، ڈاکٹر فرقان سنبھلی، محمد ذاکر حسین، پروفیسر ظفر کمالی، پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر افشاں بانو، محمد ابو رافع، نہاں رباب، ڈاکٹر واحد نظیر، پروفیسر منظر حسین، محمد مرجان علی وغیرہ قلمکار ہیں۔

نمونے کے طور پر قارئین کی دلچسپی کے لئے دو تین مضامین سے مختصر جائزہ پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ غضفر کی ناول نگاری پر پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے ایک عمدہ مضمون قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ غضنفر اردو فکشن میں خاموشی سے نہیں بلکہ اجتہاد کرتے ہوئے آواز پیدا کرنے والے قدموں کے ساتھ داخل ہوئے۔ ان کے پہلے ناول ''پانی'' کے علامتی اور استعاراتی اسلوب نے اردو دنیا کو چونکا دیا

تھا۔علامتی زبان و بیان سے تجربہ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں مگر ان کی مقبولیت نے ثابت کر دیا کہ ان کے تجربات بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئے۔

پروفیسر علی رفاد فتیحی نے ''غضنفر کا بیانیہ'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ اپنے مضمون میں غضفر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غضنفر اردو فکشن کا ایک معروف اور معتبر نام ہے۔ وہ ان چند فکشن نگاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اردو فکشن کے ساختی نظام کے ساتھ مسلسل تجربہ کرنے کے روایت کی وجہ سے شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے ناول موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ ساخت کے نئے تجربات کی وجہ سے بھی منفرد نظر آتے ہیں۔ ان ناولوں میں ہندوستانی پس منظر میں موضوعات کو ایک بیانیہ میں بننے کی ان کی کاریگری واضح طور پر نظر آتی ہے۔

پروفیسر منظر حسین غضنفر کی غزلیہ شاعری سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غضنفر کی غزلوں کی تہہ میں جائیں تو ایک ایسے شخص کی آواز سنائی دیتی ہے جس نے محسوسات کو فکر کا رتبہ عطا کیا ہے۔ وہ محض واردات قلبی کے شاعر نہیں ہیں، ان کی فطانت غزل کے سانچے میں اپنی اظہاریت کو پہنچتی ہے۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی بانکپن بھی ہے اور مہذب لب ولہجہ بھی اور سب سے بڑھ کر وہ عصر بھی ہے جسے ہم صدائے دروں سے موسوم کر سکتے ہیں۔

قارئین کی دلچسپی اور نمونے کے طور پر غضنفر کے چند افسانے، تجزیے، ڈرامے، خاکے، غزلیں اور نظمیں اس دستاویزی شمارے میں شامل ہے۔ ثالث کے گزشتہ شماروں پر کئے گئے تبصرے ہیں۔ ثالث پر اظہار خیال ظاہر کرنے والوں میں پروفیسر خالد حسین، سلیم انصاری، ڈاکٹر شاہد جمیل، عشرت ظہیر، انوارالحسن وسطوی، مرغوب اثر فاطمی، فخرالدین عارفی، ڈاکٹر سرور حسین، جرنسلٹ اقبال ہیں۔ خطوط کے ذریعہ اپنے تاثرات کا اظہار کرنے والوں میں ڈاکٹر احسان تابش، ریشا قمر، روندر جوگلیکر، شاہد اختر ہیں۔

اس طرح ثالث کا زیر مطالعہ شمارہ کافی معلوماتی اور ضخیم ہے۔

◀◀ ● ▶▶

مکتوبات

- غضنفر کا نام اردو دنیا میں کسی تعارف کامحتاج نہیں ہے۔ کثیر الجہات شخصیت ہیں غضنفر ۔ شاید ہی کوئی صنف ہوجس میں ان کے قلم کا جادو نہ چلا ہو۔ ایسا قلم کار جس کا قلم آج بھی مسلسل رواں دواں ہے۔ ان کا خلاقانہ ذہن آج بھی مختلف صورتوں میں اپنی جولانیاں دکھا رہا ہے۔ ایسی شخصیت کو سراہنا اور اس پر ایک ضخیم نمبر نکالنا واقعی قابل تعریف ہے۔ آج جب خودستائشی کا چلن عام ہے ایسے میں قلم کاروں کو اس طور خراج تحسین پیش کرنا مستحسن قدم ہے۔ ورنہ اردو والے ایسی پہل بہت کم کرتے ہیں قلم کار کی ان کے حیات میں ان کی خدمات کا اعتراف کرنا ہمارے یہاں ابھی عام نہیں ہے۔ قابل مبارکباد ہیں اقبال حسن آزاد صاحب جنھوں نے ایسا کام کر دکھایا۔ ان کا یہ قدم قابل ستائش ہی نہیں قابل تقلید بھی ہے۔
424 صفحات پر مشتمل اس غضنفر نمبر میں غضنفر کی تمام جہتوں کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ غضنفر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ میری خوشی اس لیے بھی اور بڑھ گئی کہ اس نمبر میں میرے دو دو مضامین شامل ہیں۔ اقبال حسن آزاد صاحب کے حوصلے کی داد تو ضرور دینی چاہیے ''ثالث'' واقعی زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان ہے۔ میرے مضامین کو شامل کرنے پر ممنون ہوں۔ غضنفر صاحب اور ثالث کی ادارتی ٹیم بالخصوص اقبال حسن آزاد صاحب کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ **ڈاکٹر رمیشا قمر (گلبرگہ)**

◂◂ ● ▸▸

- ڈاکٹر اقبال حسن آزاد صاحب کی ادارت میں شایع ہونے والا ثالث کا تازہ شمارہ غضنفر نمبر موصول ہوا۔ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ یہ ضخیم شمارہ 424 صفات پر مشتمل ہے۔ یہ شمارہ اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس میں اردو کے معتبر

ادیب پروفیسر غضنفر کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے کافی مواد موجود ہے۔ پروفیسر غضنفر نے اردو زبان وادب کی کافی خدمت کی ہے اور ادبی حلقوں میں ان کا ایک نام اور مرتبہ ہے۔ آپ تقریبا اردو کے ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور آپ کی بیسیوں کتابیں منظر عام پر آ کر اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کی بے لوث ادبی خدمات کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال حسن آزاد صاحب نے غضنفر نمبر شایع کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں اس اہم شمارے کے لئے ڈاکٹر اقبال حسن آزاد اور پروفیسر غضنفر کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ثالث کے مدیر اعزازی اردو کے سچے عاشق اقبال حسن آزاد کے جذبے کو سلام کرتا ہوں۔ اللہ رسالہ ثالث کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ **طارق شبنم (کشمیر)**

◄◄ ● ►►

- تازہ شمارہ یعنی معرکتہ الآرا غضنفر نمبر موصول ہو کر باعث مسرت ہوا۔ اس بے حد اہم شمارے بلکہ میں عرض کروں کہ بے حد اہم ادبی کارنامے کے لئے تہنیت وتبریک پیش کرتا ہوں۔ غضنفر بھائی ایسی عبقری شخصیت کے حامل ہیں کہ ان کو پڑھنا اور ان کے بارے میں پڑھنا اپنے آپ میں ایک کثیر الابعاد تخلیقی تجربہ ہے۔ میں ان کی خدمت میں محبت اور احترام کے ساتھ سلام، مبارک باد اور صحت وعافیت کے لئے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ قبال بھائی آپ ثالث کے لئے جتنی پرخلوص محنت کرتے ہیں فی الوقت اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔۔ رب العالمین آپ کو صحت و توانائی کے ساتھ سلامت رکھیں۔ **عین تابش (گیا)**

◄◄ ● ►►

- کتابی سلسلہ۔ ثالث۔ مونگیر کا غضنفر نمبر آج ہی موصول ہو۔ مدیر اعزازی پروفیسر اقبال حسن آزاد اور ثالث کی ٹیم کا تہہ دل سے شکریہ۔

جب ڈاک موصول ہوئی اس وقت میں سفر پر نکل رہا تھا۔ اس لیے صرف فہرست مضامین پر بعجلت تمام نظر ڈال سکا جس سے اندازہ ہوا کہ اس خصوصی شمارے میں عہد حاضر کے معروف ومستند فنکشن نگار۔ ناقد اور شاعر غضنفر صاحب کی ادبی زندگی کا مختلف جہتوں سے احاطہ کیا گیا ہے۔ مضمون نگاروں میں اردو کی عظیم ہستیوں کے

نام شامل ہے جس سے یہ شمارہ مزید خاص اور تاریخی ہو جاتا ہے۔ جلد ہی تفصیلی مطالعہ پیش کروں گا۔ ثالث کی ٹیم کو ایک بار پھر مبارکباد و نیک خواہشات۔

صابر رضا رہبر (پٹنہ)

◄◄ ● ►►

● ثالث کا غضنفر نمبر ملا۔ دل خوش ہو گیا۔ میری خوشی دوبالا ہو گئی جب میں نے اس وقیع اور ضخیم شمارے میں مشاہیر کے ساتھ اپنی تصویر دیکھی۔

فہرست سے اندازہ ہوا کہ آپ نے غضنفر سر کے ادبی کارناموں کا کوئی بھی گوشہ چھوڑا نہیں ہے۔ واقعی غضنفر سر ایک ہمہ جہت ادیب ہیں۔ آپ نے ان کی تمام ادبی جہتوں کے صرف نمونے ہی یکجا نہیں کیے ہیں بلکہ ایک ایک جہت پر تنقیدی تحریریں بھی شامل کر دی ہیں جن کی مدد سے غضنفر سر کے فکر و فن کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

ہمارے معاصرین میں کوئی اور فن کار نظر نہیں آتا جن نے اتنی ساری اصناف میں طبع آزمائی کی ہو اور اچھے نمونے بھی پیش کیے ہوں۔ پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر علی رفاد فتیحی، مہدی جعفر، شہاب ظفر اعظمی صفدر امام قادری، اسلم جمشید پوری، پیغام آفاقی کے مضامین کافی معیاری ہیں۔ طیب فرقانی کا لیا ہوا انٹرویو بہت ہی کارآمد ہے۔ بہت سے سوالوں کے جواب دے کر غضنفر سر نے ہمارے ذہنوں کی بہت ساری گتھیاں سلجھا دی ہیں۔ غضنفر سر کی ویسے تو ساری ہی تخلیقات اچھی ہیں مگر سرسید احمد خان پر جو داستان انھوں نے لکھی ہے واقعی اس کا کوئی جواب نہیں۔

ا س عمدہ نمبر کے لیے اقبال حسن آزاد صاحب اور غضنفر سر کو مبارکباد۔ اور اقبال حسن آزاد صاحب کا شکریہ بھی کہ اس قیمتی نمبر میں مجھے بھی شامل کیا۔

نہاں رباب (الٰہ آباد)

◄◄ ● ►►

● پرندوں کا غول ترقی یافتہ ملکوں کے جنگجو طیاروں کی مانند دانوں پر جھپٹ پڑا۔ کچھ پرندے تو پانی کے اندر سے بھی دانوں کو اپنی چونچ میں پکڑ لائے۔ جیسے وہ پرندے نہیں، جدید طرز کی بنی پنڈوبیاں ہوں۔ (مانجھی، غضنفر)

پانی پہ پانی سے ناول 'پانی' لکھنے والے قلم کار پروفیسر ڈاکٹر غضنفر صاحب پر اقبال

حسن آزاد صاحب کی اعزازی ادارت میں شائع ثالث کا خصوصی شمارہ 'غضنفر نمبر'
بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ **ریحان کوثر (کامٹی، مہاراشٹر)**

◀◀ ● ▶▶

- سراج اورنگ آبادی کا ایک شعر ہے ؎

عاشق و معشوق میں ثالث ہے عشق
صلح کا پیغام باہم ہووے

آج جب میں اپنے نیے مکان میں کام کروار ہا تھا۔تبھی ڈاکیہ کا فون آتا ہے کہ سر آپ کا پارسل ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں۔ کہ فلیٹ میں دے آؤ......وہ نیا بندہ تھا جو مالدہ سے ٹرانسفر ہو کر کولکتہ آیا ہے جسے یہاں کے راستوں فلیٹوں کی کوئی جانکاری نہیں تھی پھر بھی میں نے اسے فون پر ہی اپنے فلیٹ کا راستہ سمجھا کر کام میں لگ گیا تھا......اور پھر جب گھر آیا تو بیگم نے کہا کہ آپ کا پارسل آیا ہے ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس سے تو میں نے سمجھا کہ خان صاحب نے کوئی کتاب ارسال کی ہوگی۔ جب میں نے بیگم سے کہا اسے کھول کر دیکھو کیا ہے؟

جب انہوں نے کھول کر دیکھا تو ثالث غضنفر نمبر اپنے آب و تاب کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ ثالث جو فریقین کے مابین نزاع کو سلجھانے کا واسطہ بن جاتا ہے۔ میں اقبال حسن آزاد بھائی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے دوران عمرہ اور سفر مجھے یاد رکھا ہے۔ ویسے میں مرشد مشرف عالم ذوقی کے بعد جن سے متاثر ہوا ہوں وہ جناب غضنفر صاحب ہی ہیں۔ میرے پاس ان کی ساری تخلیق موجود ہے۔ ویسے میں ان کی زبان اسلوب اور اسلوبیات کا قائل رہا ہوں۔ ویسے تعریف کے لائق اقبال حسن آزاد بھائی بھی ہیں کہ ثالث اور آزاد بھائی کا رشتہ بہت قوی ہے اور یہ غضنفر نمبر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ اپنے ارادے کے بہت پکے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد ہی اس پر کچھ لکھونگا انشاءاللہ تعالیٰ۔

جاوید اختر ذکی خان کولکاتا)

- محترم اقبال حسن آزاد صاحب، اعزازی مدیر، کتابی سلسلہ 'ثالث'...... 'غضنفر نمبر' مجھے موصول ہو گیا ہے۔ اس عنایتِ خاص کے لئے ممنون ہوں۔

غضنفر کی ادبی وعلمی حیثیت، مقام ومرتبہ کے بارے میں اگر ایک جملہ میں کہنا پڑے تو میں کہوں گا کہ عہدِ حاضر میں غضنفر ایک ایسے فکشن نگار ہیں جنہوں نے اردو کی ادبی روایات کو نہ صرف یہ کہ معدوم ہونے سے بچالیا ہے بلکہ اسلوب کی ہموار سطح پر ڈکشن کا ایک نیا پیرا ڈکھڑا کیا ہے جس کے اندر رکھے اصنافِ ادب کے قیمتی اثاثے گزرتے وقت کے ساتھ انمول ہوتے جائیں گے۔ شمارہ ضخیم ہے جو کہ ہونا ہی چاہیئے تھا۔ مکمل مطالعے کے بعد تفصیلی تبصرہ کے ساتھ حاضر ہوتا ہوں۔

● رفیع حیدر انجم (ارریہ)

◄● ►

آج کی ڈاک میں 'ثالث' کا 'غضنفر نمبر' موصول ہوا۔ میری نظر میں ثالث کا ہر ایک شمارہ بے مثال ہوتا ہے۔ غضنفر اردو ادب کا جانا پہچانا ایک بڑا نام ہے۔ وہ لفظ سے لفظ جوڑنے کا ہنر جانتے ہیں۔ غضنفر کا فکر وفن لاجواب ہے۔ زمین سے جڑے رہنے والے کا نام غضنفر ہے۔ وہ افسانہ نگار، ناول نگار، خاکہ نگار، شاعر انشا پرداز ہیں۔ سو بات کی ایک بات نظر میں نظر رکھنے والی اور مثبت سوچ والی شخصیت کا نام غضنفر ہے۔ اردو فکشن کے اس معتبر نام کو میرا سلام! **ڈاکٹر احسان تابش (گیا)**

◄● ►

● سہ ماہی ثالث کا غضنفر نمبر موصول ہوا۔ ماشاء اللہ بہت محنت سے ترتیب دیا گیا ہے۔ محترم اقبال حسن آزاد صاحب کا مرتب کردہ ہر نمبر شاندار اور دستاویزی ہوتا ہے۔ موصوف خود بھی بہت اچھے افسانے لکھتے ہیں میرے پاس آپ کے سبھی افسانوی مجموعے موجود ہیں۔ غضنفر صاحب جتنا اچھا لکھتے ہیں اتنا ہی اچھا بولتے بھی ہیں۔ پروفیسر شہر یار صاحب کی پہلی برسی پر ۲۰۱۳ میں مراد آباد میں ایک سمینار میں آپ سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو طویل زندگی اور صحت و تندرستی عطا فرمایے۔ آمین۔ آپ ہر فن مولا قلم کار ہیں۔ میں نے عالمی اردو افسانوی مجموعوں کا اشاریہ مرتب کیا ہے اس میں ان کی کتابیں بھی میرے اشاریہ میں شامل ہیں۔ **اطہر مسعود خان (رامپور)**

◄● ►

- ثالث......کا گراں قدر تحفہ غضنفر نمبر موصول ہوا۔ میں مدیر محترم اقبال حسن آزاد کا شکر گذار ہوں۔ غضنفر پر اتنا سارا مواد ایک ساتھ مل جاتا ہے کہ اس اہم فنکار پہ مثبت رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے......مواد کی فراہمی میں محنت شاقہ کا احساس ہوتا ہے۔ آج تک میں ان کی شاعری پڑھ سکا ہوں۔ انشاءاللہ عنقریب اس پہ لکھوں گا۔

رونق شہری (چھریا)

◀ ● ▶

- ثالث کا غضنفر نمبر پڑھ رہا ہوں۔ بالخصوص پروفیسر علی رفاد فتیحی کا مضمون ''غضنفر کا بیانیہ'' اور طیب فرقانی نے جو انٹرویو کیا مکمل پڑھ چکا ہوں۔ دونوں لکھتوں کو ملا کر غضنفر صاحب کے شخصی و اسلوبی پہلو واضح ہوئے ہیں۔ محنت کر کے لکھا گیا کام معلوم ہوتا ہے۔ کہانی وافسانہ کی باریکی، ہندی وارد والفاظ کی بجائے ترسیل معنی پہ توجہ اور فرقہ پرستی پہ غضنفر کے خیالات اہم رہے ہیں۔ ثالث کے تازہ شمارے کا دلی شکریہ۔

بلال مختار (آسٹریلیا)

◀ ● ▶

اقبال حسن آزاد کی تنقیدی اور تحقیقی کتاب

نثری اصناف ادب

اور طنز و مزاح کی روایت

کا جدید ایڈیشن منظر عام پر آچکا ہے

سن اشاعت: ۲۰۲۵ء صفحات ۲۶۴ قیمت: ۵۰۰/روپے

ملنے کا پتہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر